اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور

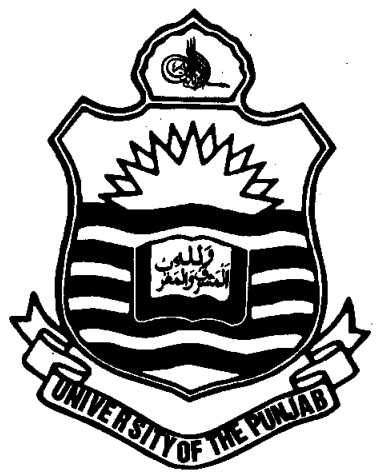

جلد ۱۳

(عجم.....علم)

(۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)

بار دوم

۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

جملہ حقوق بحق جامعہ پنجاب محفوظ ہیں

مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کلی یا جزوی طور پر اس کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

طبع: اوّل

ناشر: مسٹر اے رحیم، رجسٹرار، دانش گاہِ پنجاب، لاہور

مقام اشاعت: لاہور

سال طباعت: ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء

مطبع: مطبعۃ المکتبۃ العلمیہ، ۱۵۔ لیک روڈ، لاہور

طابع: خان عبید الحق ندوی، ناظم مطبع

صفحہ ۱ تا ۲۵۶

مطبع: نیو لائٹ پریس، ۳۰۔ افتخار بلڈنگ بہاول شیر روڈ، چوبرجی، لاہور

طابع: چوہدری محمد سعید، ناظم مطبع

صفحہ ۲۵۷ تا ۳۲۰

مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

طابع: امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز)، ناظم مطبع

صفحہ ۳۲۱ تا آخر و سرورق

باردوم: (رجب ۱۴۲۶ھ/اگست ۲۰۰۵ء)

ناشر: ڈاکٹر محمد نعیم

رجسٹرار دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع: محمد خالد خان

سپرنٹنڈنٹ پریس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

جلد ساز: انبالہ بک بائنڈر، شیش محل روڈ، لاہور

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائیکلو پیڈیا (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ایا۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اول یا دوم، لائیڈن.

ابن الابار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: *Misc در Apendice a la adicion Codera de Tecmila de estudios y textos arabes*، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابار، جلد اول = ابن الابار = تکملۃ الصلۃ، *Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera*، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ایا۲ یا۳ یا۴ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان = *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ فاینان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از *C.Defremery* و *B.R.sanguinetti*، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے ولائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، بعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (*BGA.II*، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (*BGA, VI*).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر ....، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = *Prolegomenes d'Ebn Khaldoun*، طبع E.Quâtremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (*I Notices et IExtraits,XVI-XVII*).

ابن خلدون: روزنتھال = *The Muqaddimah*، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان *Les Prolegomensesd' Ibn Khaldun*، ترجمہ وحواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء.

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وسٹنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء۔

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII)۔

ابن رستہ، ویت Wiet: Les Atours precieux، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ تا ۱۹۴۰ء۔

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) ولیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء: جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء۔

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں)۔

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V)۔

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء۔

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء۔

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء۔

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء۔

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d'Aboulfeda traduite de l'arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء، و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء۔

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء۔

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ء/۱۳۱۹ھ۔

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک)۔

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء۔

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA.I) و باردوم (نقل باراول) ۱۹۲۷ء۔

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا باردوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بارسوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ بعد۔

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء۔

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ۔

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء۔

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

البلاذری. فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش۔

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء۔

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica، ت ۱۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس۔

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء۔

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/ ۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء۔

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء۔

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ۔

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء۔

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء۔

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) ومحمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء۔

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء۔

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ۔

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS.XI)، سلسلہ جدید)۔

حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII)۔

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ وبمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء۔

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ۔

الدمیری = الدمیری: حیوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں)۔

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرہ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۱ء۔

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ۔

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ۔

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن وحسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء۔

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام تاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ تا ۱۹۵۹ء۔

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ۔

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ۔

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء۔

السمعانی، مکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX)۔

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبد المعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد، ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲-۱۹۸۲ء۔

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ۔

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء۔

الصفدی، الصفی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH. III)۔

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ۔

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء۔

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ۔

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ۔

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ وجغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ تا ۱۸۹۹ء۔

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء۔

عیون الانباء = طبع مللر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء۔

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء۔

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ۔

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء۔

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ۔ش۔

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء۔

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء۔

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء۔

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء۔

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء۔

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰، جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ۔

م آ آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl Indica۔

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ۔ش۔

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ۔

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ۔ش۔

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء۔

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (*BGA*, VIII)۔

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (*BGA*, VIII)۔

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء۔

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء۔

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ۔

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء۔

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء بعد۔

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء۔

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء۔

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴ء)۔

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*, VI)؛ معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء۔

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII)۔

یعقوبی، ویت = *Yaqubi, Les pays* = Wiet، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء۔

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*, Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^{2}=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*. London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56)

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*. Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*. 2nd. ed, Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*. Djambatan Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلّات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient. di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI, NIS=the same, New Imperial Series.

ASI, AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais J.' Arachcologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.

BSE^{2}*=the Same, 2nd ed.*

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguisttiq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^{1}*=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.*

EI^{2}*=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.*

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Taebbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Oriens.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI,NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG = Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد	=	f.,ff.,sq.,sqq.
بذیل مادّہ (یا کلمہ)	=	s. v.
دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے	=	see; s.
رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک بآں (رجوع کنید بآں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے	=	q.v.
بمواضع کثیرہ	=	passim.
کتاب مذکور	=	op.cit.
دیکھیے لغوی مفہوم (قارِب یا قابِل)	=	cf.
ق۔م (قبل مسیح)	=	B.C.
م (متوفی)	=	d.
محل مذکور	=	loc. cit.
کتاب مذکور	=	ibid.
وہی مصنف	=	idem.
ھ (سنہ ہجری)	=	A.H.
ء (سنہ عیسوی)	=	A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ	(ـَ)	=	a
کسرہ	(ـِ)	=	i
ضمہ	(ـُ)	=	u

(ب)

Long Vowels

اٰ، آ	=	ā	(آج کل: aj kal)
ی	=	ī	(سیم: Sim)
و	=	ū	(ہارون الرشید: Hārūn al-Rashid)
اے	=	ai	(سیر: Sair)

(ج)

ـِ	=	e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)
ـُ	=	o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)
ـُ	=	ū کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)
ـُو	=	ō کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kōl)
ـُ	=	ā کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اَرْجَب: ārādjāb؛ رَجَب: radjab)
ـْ	=	علامت سکون یا جزم (بسمل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

ب	=	b	ح	=	ḥ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	Kh	ش	=	sh، ch	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	l
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t̄	ڈ	=	d	ط	=	t	م	=	m
تھ	=	t̄h	ڈھ	=	d	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ذ	=	dh	ع	=	ʿ	ن	=	n
ٹھ	=	th	ر	=	r	غ	=	gh	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	'
چ	=	c̄	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	c̄h	ژ	=	ž, zh						

* عَجم : [غیر عرب ملک یا لوگ خصوصاً ایران، توران؛ لغوی معنی گنگ اور کند زبان، کیونکہ غیر ممالک کے لوگ عرب میں جا کر وہاں کی زبان بول نہیں سکتے تھے اس وجہ سے اہل عرب انہیں ''عجمی'' یعنی گونگے کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں کم شائستہ، اجنبی آدمی کے لیے بھی بولتے تھے۔ کھجور کی گٹھلی اور دوسرے پھلوں کے بیجوں کو بھی عجم کہتے ہیں (فرہنگ آنندراج، مادّۂ عجم)] - عربی زبان کے اس اسم جمع کا اشتقاق اور اس کا معنوی ارتقا دونوں یونانی لفظ βάρβαροι کے عین مماثل ہیں۔ یہ لفظ جس مادّے سے لیا گیا ہے، اس کے بنیادی مفہوم کے مطابق اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عُجْمَہ کی صفت سے متصف ہوں، یعنی تلفّظ اور زبان کے لحاظ سے ان کا بولنے کا انداز الجھا ہوا اور غیر واضح ہو۔ عُجْمَہ گویا عربی لفظ فصاحۃ کی بھی ضد ہے اور عجم (عجمی) غیر عرب βάρβαροι ہیں، جنہیں یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کہ ان میں وحشی پن کی مخصوص علامت یعنی بولنے اور بات کرنے کا ناقابل فہم اور مبہم طریقہ پایا جاتا ہے۔ یونانیوں کی طرح عربوں کے نزدیک بھی یہ ''وحشی لوگ'' اولاً ان کے ایرانی ہمسائے تھے اور زمانۂ قبل از اسلام ہی سے عربی شاعری میں العرب اور العجم کا یہ تضاد موجود رہا ہے۔ اگرچہ لفظ کی اس شکل کی جگہ ''اَعَاجِم، جمع اَعْجَم'' کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس کا مفہوم اس کے استعمال کرنے والے کے مخصوص نقطۂ نظر پر منحصر ہوتا تھا؛ اگرچہ اس کا اصلی تحقیرآمیز زور جو عربوں کے احساس برتری کے متکبرانہ ادّعا کا نتیجہ تھا، عموماً قائم و برقرار رہا، تاہم اس کے استعمال میں خاصے قدیم زمانے ہی سے غیر ملکی دلفریبی، کشش اور نسبۃً زیادہ شستہ و شائستہ ثقافت کے اعتراف کا پہلو بھی مضمر ہوتا تھا۔ بہرحال سارے اموی عہد میں اہل عرب جن کے ہاتھ میں اسلامی سلطنت کی باگ ڈور رہی اور جن کی بدولت ان کی برتری وسعت پذیر ہوئی، مفتوح عجمیوں پر غیر متنازع طور پر مسلّم رہی اور غیر عربوں یعنی ایرانیوں کی نسل و ثقافت کی حمایت میں محض اکا دکا ہی آوازیں بلند ہوئیں (مثلاً شاعر اسمٰعیل بن یَسَار، درالاغانی، بار دوم، ۴:۱۱۴، ۱۲۴)، لیکن عباسیوں کے برسراقتدار آنے، گویا عرب پر عجم کی برتری سے، جس کی مذمّت [حاکم خراسان] نَصْر بن سیّار اپنے شہرۂ آفاق اشعار میں پہلے ہی کر چکا تھا (الدینوری، ص ۳۶۰)، صورت حال برعکس ہوگئی۔ ایرانیوں نے سیاسی اور معاشرتی برتری حاصل کرتے ہی اپنی تمدنی اور روحانی قدروں کے فائق ہونے کا دعوٰی بھی شروع کر دیا۔ اس دعوے نے شعوبیّہ [رک بآں] تحریک کی صورت اختیار کرلی جس کا اصل مقصد عربوں پر عجمیوں کی برتری ثابت کرنا تھا، اگرچہ یہ معرکہ بھی عربی زبان ہی میں لڑا جاتا رہا۔ جب اس بحث و جدال کی گہما گہمی کم ہوگئی تو یہ دو لفظ، عرب اور عجم، روز مرّہ کے استعمال میں محض نسلی امتیاز کو ظاہر کرنے کے لیے باقی رہ گئے، یعنی لفظ ''عجم'' فُرْس (فارسی، ایرانی) کا مترادف ہوگیا اور ''عراقِ عجم'' کی اصطلاح ازمنۂ وسطٰی کے آخری دور کے بعد سے ایرانی میڈیا Media (= الجبال) کے لیے استعمال ہونے لگی تاکہ اسے عراقِ عرب یعنی اصل عراق سے ممیّز کیا جاسکے؛ چنانچہ شَنْفَرٰی کے مشہور قصیدۂ لامیّہ [لامیۃ العرب]؛ کے مقابلے میں ایک ایرانی شاعر الطُّغْرائی (م ۱۱۲۱ء) کی ایسی ہی ایک نظم کو ''لامیۃ العجم'' کا نام دیا گیا جس کی ردیف لام ہے۔ [نیز رک بہ الخَمیہ] .

مآخذ : (۱) Goldziher : 'Muhammedanische Studien', ۱: ۱۰۰ تا ۱۴۶، 'Agam und Arab.

(F. GABRIELI)

* عَجَمی اوغلان : ایک ترکی اصطلاح بمعنی، ''غیر ملکی لڑکا'' جس کا اطلاق عیسائی نوجوانوں پر کیا جاتا تھا جو دولت عثمانیہ کے قپو قولو [= دربانوں] کے طور پر بھرتی کیے جاتے تھے - پہلے یہ بھرتی ۱۳۶۲ء کے ''پنچک قانون'' کے مطابق کی جاتی تھی، یعنی جنگی اسیروں کے ہر پانچ میں سے ایک کو چن لیا جاتا تھا اور بعد ازاں دیوشرمہ [رکّ بآن] نامی جبری بھرتی کے ذریعے انھیں پہلے پانچ سے سات سال تک آناطولی کے نظام جاگیرداری کے سپاہیوں وغیرہ کی تحویل میں رکھا جاتا تھا اور بعد ازاں روم ایلی میں بھی، تاکہ وہ ترکی زبان سیکھ لیں اور مسلمانوں کی عادات و رسوم کے خوگر ہوجائیں؛ پھر انھیں گیلی پولی کے ''عجمی اوجاق'' میں بھیج دیا جاتا تھا اور جب استانبول فتح ہوگیا تو وہ استانبول کے اوجاق میں بھیجے جانے لگے - اس کے ساتھ ہی انھیں ان کی قابلیت اور استعداد کے مطابق منتخب کر کے قصر سلطانی میں خدمات بجا لانے کے لیے یا باقاعدہ پیدل اور سوار فوج، یا توپ خانۂ اوجاق کے لیے یا ادرنہ اور استانبول کے بُستانجی [رکّ بآن] لشکر میں رکھ لیا جاتا تھا - قصر سلطانی یا مختلف جیوش میں یہ تقرر جسے اصطلاحاً ''قپی یہ چقمہ'' ''دروازے تک آگے بڑھنا'' کہا جاتا تھا، ملازمت میں تقدم زمانی کے اعتبار سے جگہیں خالی ہونے پر کیا جاتا تھا .

عجمی اوغلان جو استانبول کی غلطہ سرائے یا ادرنہ کی ابراہیم پاشا سرائے میں ابتدائی تربیت حاصل کرنے کے بعد قصر سلطانی کی خدمات پر مامور ہو جاتے تھے (اس لیے ''ایچ اوغلان'' یا ''ایچ آغا'' کہلانے لگتے تھے) اور یاادنیٰ درجے کے قوغوش (dormitory) سے بتدریج ترقی کرکے خاص اودہ [حجرۂ خاص] تک پہنچ سکتے تھے جہاں کی بڑی ملازمتوں میں سے ان لوگوں کو جو انھیں حاصل کر چکے ہوں، بیگلربک بیگلر بیگی [رکّ بآن] اور وزیر بنایا جاتا تھا، تفصیل کے لیے دیکھیے آلائیڈن، بار دوم بذیل مادّہ .

مآخذ : (۱) اوزون چارشیلی : قپوقولو اوجاق لری، ۱: ۱ تا ۱۴۱؛ (۲) آلائیڈن Acemi Oglan؛ (۳) احمد جواد: تاریخ عسکری عثمانی، ص ۱۷۴ (فرانسیسی ترجمہ، ۱: ۲۴۱)؛ (۴) سید مصطفیٰ: نتائج الوقوعات، ۱ : ۱۶۶، ۱۷۴ و ۲ : ۱۰۹؛ (۵) D'Ohsson : 'Tableau de l'Empire Ottoman', ۷ : ۳۱۳؛ (۶) Gibb و Bowen : 'Islamic Society and the West', ۱/۱، بعدد اشاریہ .

(H. BOWEN [تلخیص از ادارہ])

* عَجَمِیّہ : ایک اصطلاح جو غیر عربی زبانوں کو عربی حروف میں لکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے .

* العَجَمِیّہ : رکّ بہ الخَمِیّۃ .

* عَجُوز : رکّ بہ ایّام العَجُوز .

* عَدَد : رکّ بہ علم الحساب، بذیل مادہ علم .

* عِدَّت : (ع)؛ ایک مُعیّنہ عرصے تک انتظار کرنا، جس کے دوران میں بیوہ یا مطلّقہ عورتیں سابق نکاح کے فسخ ہو جانے کے بعد نیا نکاح نہیں کر سکتیں - شریعت کی رو سے بیواؤں کی مُدّت عدّت ۴ ماہ ۱۰ دن مقرر ہے [وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (۲[البقرہ] : ۲۳۴)= تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے،

دس دن روکے رکھیں] - قدیم عربوں کے ہاں ماتم کے موقع پر اس کی مدّت اس سے زیادہ مقرر تھی - اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاوند کے مرنے کے بعد بیوہ ایک چھوٹے سے خیمے میں گوشہ نشین ہو جاتی تھی جہاں وہ ایک سال گزارتی تھی اور اس عرصے میں اسے نہانے دھونے کی قطعی ممانعت ہوتی تھی - (دیکھیے *Die Ehe bei den Arabern Nachrichten von der* J. Wellhausen *Kgl. Gesellsch. der Wissench zu Gottingen*، ۱۸۹۳ء، ص ۴۵۴ ببعد) - قدیم عربوں میں طلاق کے بعد کی عدّت کا وجود نہیں تھا - اگر کوئی شخص کسی ایسی مطلّقہ عورت سے شادی کر لیتا جو حاملہ ہو تو وہی شخص شادی کے بعد پیدا ہونے والے بچے کا باپ سمجھا جاتا تھا، خواہ اصل میں اس کا باپ عورت کا پہلا شوہر ہی کیوں نہ ہو - بہرحال اسلام میں بچے کا اصل باپ ہی اس کا باپ تصوّر کیا جاتا ہے اور کسی عورت کو اجازت نہیں کہ پہلے نکاح کے فسخ ہونے پر ایک مقررہ میعاد (عِدّة) گزارے بغیر دوسرا نکاح کرے - اگر اس دوران میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو صرف اس کا سابق شوہر ہی اس کا باپ سمجھا جاتا ہے - شریعت کی رُو سے مطلّقہ کے لیے ایّامِ عدّت یہ ہیں : حائضہ کے لیے تین بار حیض آنے تک (تین قُرُوء، ۲ [البقرة] : ۲۲۸) اور غیر حائضہ [غیر حائضہ سے مُراد وہ عورت ہے جسے کبر سنی کی بنا پر، یا وہ لڑکی جسے صغر سنی کے باعث ایّام ماہواری نہ آتے ہوں] کے لیے تین ماہ تک (۶۵ [الطلاق] : ۴)؛ اگر کوئی مطلّقہ حاملہ ہو تو وضع حمل، یعنی بچے کی پیدائش تک کا زمانہ اس کے لیے عدّت ہے : [وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (۶۵ [الطلاق] : ۴)= اور حاملہ عورتوں کی عدّت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے]؛ لونڈیوں کے لیے بھی عدّت کی مدّت معین ہے، لیکن ان کے لیے ۴ ماہ ۱۰ دن کی عدّت کی جگہ ۲ ماہ ۵ دن کی اور تین قروء کی عدّت کی جگہ دو قروء کی اور تین ماہ کی مدّت کی جگہ ڈیڑھ ماہ کی عدّت مقرر ہے - [عدّت کے دوران میں عورت کے لیے ایسی زیبائش جائز نہیں جو عورتیں اپنے شوہروں کے لیے اختیار کرتی ہیں (الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعة، جلد ۴) - عدت کے احکام میں جائے سکونت کی پابندی اور متوفّی شوہر کے غم میں سوگ، نیز ترک زینت وغیرہ کے مسائل بھی اہمیت رکھتے ہیں جن کی تفصیل مآخذ حدیث وفقہ سے معلوم کی جاسکتی ہے] -

مآخذ : [(۱) قرآن مجید کی تفاسیر؛ (۲) کتب حدیث بمدد مفتاح کنوز السُّنّة ؛ (۳) المرغینانی : ہدایہ؛ (۴) الشوکانی : نیل الاوطار، (۵) فتاوی عالمگیری؛ (۶) الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعة ؛ (۷) امجد علی : بہار شریعت ؛ (۸) اختر عباس : توضیح المسائل (فقہ شیعی)، مطبوعہ لاہور].

(TH. W. JOYNBOLL [واداره])

* **عَدَس** : (ع؛ عدَس، بدَس اور بُدَسُون بھی مستعمل ہے) بمعنی مسور - اس کی کاشت کے لیے خشک آب و ہوا اور نرم اور ریتلی زمین مفید ہے - مشرق میں اس کی کاشت زمانۂ قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے - مصریوں کی یہ من بھاتی خوراک ہے - ابن العوام تصدیق کرتا ہے کہ اس کی کاشت خلافت اسلامیہ کے مغربی ممالک میں ہوتی ہے - ابن بطوطہ عام مسور کے علاوہ ایک کڑوے مسور (عدس مُرّ = یونانی σφαιρόκυκλος) اور عدس نبطی اور عدس الماء (Lemna Miner) کا بھی ذکر کرتا ہے اور بتاتا

ہے کہ اس کے لیپ سے ٹھنڈک اور تسکین حاصل ہوتی ہے ۔ اگر یہ مقررہ مقدار سے زیادہ کھائی جائے تو مضر صحت ہوتی ہے اور یرقان، افسردگی، پھنسی پھوڑے اور ناسور وغیرہ امراض پیدا کرتی ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن العوام : کتاب الفلاحة، ۲ : ۲۵، ۶۹ وغیرہ؛ (۲) ابن البیطار : الجامع (قاہرہ ۱۲۹۱ھ)، ۳ : ۱۱۷ ببعد؛ (۳) ابو منصور موفق : کتاب الابنیہ (طبع Seligmann) ۲ : ۴۹؛ (۴) A.v. Kremer : *Aegypten* (۱۸۶۳ء)، ۱ : ۲۰۳؛ (۵) R. Hartmann : *Reiso des Fr. Barnime*، ۲۱۹ (نوبیا) .

(HELL)

* **عَدْل** : رکّ بہ معتزلہ .

* **عدل** : (۱) از روے اشتقاق یہ اصطلاح اسم ذات اور اسم صفت دونوں شکلوں میں استعمال ہوتی ہے، لیکن معنوں کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے کے عین مطابق نہیں ۔ اسم ذات کے طور پر عدل کے معنی انصاف یا دادرسی ہیں اور اسم صفت کے طور پر اس کے معنی مستقیم، منصفانہ اور متوازن کے آتے ہیں، اس طرح اس لفظ کا اطلاق جان دار اور غیر جان دار دونوں پر ہوتا ہے ۔ اپنی ان دونوں شکلوں میں یہ لفظ مذہب، حکمت اور قانون کی لغات میں مستعمل ہے ۔ معتزلہ کے عقائد میں خدا کا عدل ان کے مذہب کے پانچ بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے (رکّ بہ المعتزلہ) ۔ قاضی کے لیے لازم ہے کہ وہ عدل (یا قِسْط، ۴ [النسآء] : ۵۸؛ ۵ [المائدہ] : ۴۲) سے فیصلہ دے، لیکن مادّی انصاف کا تخیّل فقہ کے نظریات [رکّ بہ فقہ (اصول فقہ)] میں زیادہ دخل نہیں رکھتا، اگرچہ شکایتوں کی تحقیقات میں اس پر زور دیا گیا ہے جو اسم صفت اس عدل (اسم ذات) کے عین مطابق ہے، وہ عادل ہے .

اسم صفت کے طور پر لفظ عدل خاص طور پر ایک فقہی تصور کو ظاہر کرتا ہے اور اس کا اطلاق متعدد شکلوں میں کیا جاتا ہے ۔ تاہم، جیسا کہ مالکی فقیہ ابن رُشد نے کہا ہے، اس اصطلاح کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکی جو متفق علیہ ہو ۔ مزید برآں اس اصطلاح کی جو مختلف تعریفیں مرتب کی گئی ہیں وہ بہت زیادہ وسیع اور غیر معیّن ہیں ۔ الماوردی کے ہاں کیفیت عدل یعنی عدالة کو اخلاقی اور دینی کمال کی ایک حالت بتایا گیا ہے ۔ ابن رُشد کے نزدیک اس کی شرط یہ ہے کہ انسان کبائر کا مرتکب نہ ہو اور صغائر سے بھی اجتناب کرے ۔ لیکن ایک اور مصنّف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس قسم کی کیفیت چونکہ بہت ہی استثنائی صورتوں میں صرف اولیاء اللہ میں پائی جا سکتی ہے، اس لیے عدالة سے انسان کی صرف وہ حالت مراد ہے جس میں کہ وہ عام طور پر اخلاقی اور شرعی احکام کی پابندی کرنے والا ہو ۔ یہی وہ تصور ہے جسے بالآخر قبول کر لیا گیا ۔ قانون اسلام کی تدوین کی کوشش اپنے مؤخر ترین مراحل میں وہ تھی جو سلطنت عثمانیہ میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں بروے کار لائی گئی ۔ اس میں عدل کی حسب ذیل تعریف کی گئی ہے : ”عَدْل [عادل] وہ ہے جس میں خیر کے رجحانات شر کے رجحانات پر غالب ہوں“ (مجلہ، دفعہ ۱۷۰۵) ۔ مختصر طور پر عدل کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ عدل (عادل) ایسے شخص کو کہتے ہیں جو لازماً دین اسلام کے دیے ہوے مفہوم کے مطابق اچھے اخلاق رکھتا ہو ۔ یہ کیفیت یا حالت خواہ اس کے قدرتی رجحانات کا نتیجہ ہو خواہ وہ وَہبی یا اکتسابی،

یا اس کے لیے یہ کافی ہے کہ اسے قوت ارادی کے ذریعے حاصل کیا جائے، بہر حال یہ مسئلہ منطقی طور پر متنازع فیہ ہے .

اس اسم صفت کو اسم ذات کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس صورت میں اس کے معنی نیک اخلاق رکھنے والا شخص لیے جاتے ہیں (جمع : عُدّال) .

عدالۃ فقہ کے مختلف شعبوں سے متعلق ہے ۔ اجتماعی قانون کے نظریے کی رو سے عدالۃ ان اہم شرائط میں سے ایک ہے جو شریعت کے اصول کے مطابق تسلیم شدہ فرائض اجتماعی بجا لانے کے لیے ضروری ہیں، لیکن شخصی قانون میں آ کر شہادت کے نظریے میں یہ تصور بہت ترقی یافتہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے متعلق ضوابط کا مفصل نظام بنا دیا گیا ہے ۔گواہ کا عَدْل ہونا ضروری ہے، لیکن صرف اسے کافی سمجھا جاتا ہے کہ گواہی دیتے وقت اس کی عدالۃ کی تصدیق ہو جائے اور یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ امر متنازع فیہ کے مشاہدے کے وقت گواہ عدالۃ کی کیفیت میں تھا یا نہیں ۔ تاہم یہ نکتہ متنازع فیہ ہے کہ آیا گواہ کو اس وقت تک صاحب عدالۃ سمجھا جائے جب تک کہ مد مقابل نے اس پر اعتراض نہ کیا ہو، یا قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعتراض نہ کیے جانے کی صورت میں بھی گواہ کے متعلق تصدیق کرے کہ آیا وہ صاحب عدالۃ ہے یا نہیں ۔ اس مؤخر طریق کو اصولاً و عملاً ترجیح دی جاتی رہی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گواہ کی عدالۃ کی تصدیق و توثیق حاصل کرنے کے لیے ایک مخصوص طریق کار تیار ہو گیا جسے تزکیہ یا تعدیل کہا جاتا ہے ۔ قانون اسلامی کی تدوین کے آخری مراحل میں اس طریق کار نے دو صورتیں اختیار کر لیں ۔ ایک صورت یہ تھی کہ قاضی گواہ کے عدل ہونے کے بارے میں خفیہ تحقیقات کرتا تھا اور مستند اشخاص کے نام سر بمہر لفافے میں سوال بھیج دیتا تھا ۔ اس طریق کار کو التزکیۃ السِّرّیہ کہتے تھے ۔ بعض حالات میں ان لوگوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے سابقہ [خفیہ] بیان کی تصدیق کے لیے کھلی عدالت میں حاضر ہوں اور بالمشافہہ بیان دیں ۔ اسے التزکیہ العَلانیّہ کہا جاتا تھا ۔گواہ کی عدالۃ کی تصدیق تعدیل کہلاتی ہے اور اس پر اعتراض کرنے کو جَرْح کہتے ہیں .

تاہم تزکیے کا طریق مخصوص طور پر کسی مقدمے کے لاحقے یا حادثے کے طور پر اختیار نہیں کیا جاتا، بلکہ مقصود مطلق کے طور پر مقدمے کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے تاکہ زیر بحث اشخاص میں عدالۃ کی صفت کا ہونا مثبت اور قطعی طور پر تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ جب تحریری بیانات حاصل کرنے کا رواج، جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، بہت عام ہو گیا تو شہادت کی قطعی توثیق کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ دستاویزی ثبوت حاصل کرنے کے طریقے کی جگہ کسی اور طریقے سے کام لیا جائے ۔ بہرکیف یہ طریق کار قابل اعتماد نہ تھا ،کیونکہ تحریری تصدیق بھیجنے والوں پر بھی یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ وہ خود عدالۃ کے حامل نہیں ۔ اس مشکل کو ابتدائی تزکیے سے حل کیا گیا، یعنی قاضی پہلے ہی چند ایک اشخاص کو حتماً صاحب عدالۃ تسلیم کر لیتا ہے اور اس طرح وہ اصولاً ایسے گواہ بننے کے مستحق ہو جاتے ہیں جن پر اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا ۔ انہیں تحریری دستاویزوں کا پہلے سے پیش کردہ ثبوت مہیّا

کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے ۔ انھیں اشخاص میں سے کاتب عمومی یا کاتب عَدْل (= ناظرین قبالجات notaries) مقرر کیے جاتے ہیں اور انھیں اصطلاحاً عُدول کہا جاتا ہے، لیکن عدول کو بعض دیگر خدمات پر بھی مأمور کیا جاتا ہے، مثلاً ضابطے کے کاغذات اور فیصلوں کی تصدیق کرنے کے لیے قاضیوں کی امداد یا عدالتی نظم و نسق کے بعض کاموں کی تعمیل کے لیے، نیز تزکیے کے استفسارات کے جواب دینے اور لوگوں کو ایسے وظائف بجا لانے کے لیے نامزد کرنے کی غرض سے جن کے لیے عدالۃ کا ہونا ضروری ہے، وغیرہ [نیز رک بہ شاہد] .

•آخذ : (۱) ابن فرحون : تَبْصِرۃُ الحُکّام، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء، ۱ : ۱۷۳، ۲۰۴ ببعد، وغیرہ؛ (۲) التہانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، طبع A. Sprenger، ص ۱۰۱۵ ببعد؛ (۳) Juynboll: *Handleiding*، فصل ۶۷؛ (۴) Santillana: *Istituzioni*، ۱ : ۱۰۹؛ (۵) Tyan: *Histoire de l'organisation Judiciaire en pays d'Islam*، پیرس ۱۹۳۸ء، جلد ۱، باب ۴ فصل ۵؛ (۶) وہی مصنف: *Le notariat ..... dans la pratique du droit musulman* بیروت ۱۹۴۵ء .

(E. TYAN)

[جدید تر مسلم ادبوں میں عدل کی اصطلاح میں مزید توسیع ہوئی ہے اور معاشی و معاشرتی انصاف کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوگیا ہے، لہٰذا یہ کسی فرد واحد کی کیفیت عدالۃ تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی حالتِ انصاف بھی اس میں شامل ہوگئی ہے ۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے رک بہ اسلام] .

(۱) سکّوں کے معاملے میں عدل کے معنی وزن صحیح کے ہیں ۔ اس لیے یہ لفظ (اکثر اپنی مختلف صورتوں میں) سکّوں پر ضرب کر دیا جاتا ہے تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ صحیح طور پر وزن شدہ اور رائج الوقت (عدلی) ہیں .

(۲) علم مسکوکات میں عَدْل کا مفہوم ''پورے وزن'' کا ہے ۔ اس لیے یہ لفظ (اکثر اپنی مختصر شکل ''ع'' میں) سکّوں پر ضرب کر دیا جاتا ہے تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ صحیح طور پر وزن شدہ اور رائج الوقت (عدلی) ہیں .

(آ، لائیڈن ، بار دوم)

* **عدلی** : سلطان محمد ثانی اور محمود ثانی کا، نیز بایزید ثانی کا تخلّص ۔ گِب Gibb : *History of the Ottoman Poetry*، ۲ : ۳۲ ببعد) کا خیال ہے کہ مؤخّر الذکر کا تخلّص عدنی تھا، لیکن اُپسلہ Upsala کے مخطوطے میں عدلی لکھا ہے (Gibb، ۲ : ۲۵ ببعد، نے دیوانِ عدنی، استانبول ۱۳۰۸ھ، کو محمود پاشا سے منسوب کیا ہے) .

(آ، لائیڈن ، بار دوم)

عَدَم : (عربی)، ارسطو طالیسی اصطلاح، στέρησις (Privatio) کا ترجمہ ہے اور اس کے معنی ہستی یا وجود کی نفی ہے ۔ اس لفظ کی تعریف ارسطو طالیس کی *Metaphysics*، ۵ : ۲۲ میں پائی جاتی ہے اور فلسفۂ ارسطو طالیس کے عرب معتقدین نے اختیار کر لی ہے ۔ بہر کیف ارسطو طالیس کے فلسفے میں اس لفظ کے دو معنوں میں فرق و امتیاز کا سمجھ لینا ضروری ہے : (۱) مطلق لا موجودیت، یعنی مطلقاً کسی شے کا نہ ہونا؛ (۲) اضافی لاموجودیت، یعنی (الف) مادّے میں کسی صفت کا فقدان؛ (ب) مادّے کی محض بالقوہ استعداد ۔ چونکہ ارسطو طالیس کے فلسفے کی رو سے کسی صفت کا فقدان اس کی ضدّ کا بالامکان متضمّن ہے ، لہٰذا بحیثیت ممکن ہونے کے اس میں ایک

مثبت پہلو پایا جاتا ہے ۔ ارسطو طالیس کا نظریۂ حدوث بہ تمام و کمال عدم کے اسی تصور پر مبنی ہے ۔ حدوث مطلق کے کوئی معنی نہیں ۔ ہر قسم کا حدوث محض اضافی لا موجود کے موجود ہونے کا نام ہے ۔

بہر حال ارسطوطالیس کے نزدیک لاشَی محض بھی ایک ہستی رکھتی ہے، کیونکہ اس کے بیان کے مطابق لاشَی کا ہونا ہی اس کے وجود ہونے پر دال ہے ، لیکن اصل میں یہ رواقیین تھے جنھوں نے لاشَی کی ہستی کے مسئلے پر بڑے زور شور سے بحثیں کیں اور انھیں کی بحثوں اور اصطلاحوں کی صدائے بازگشت اسلام کے متکلّمین کے درمیان گونجتی رہی ۔ چنانچہ معتزلہ بالخصوص اس بات کو مانتے تھے کہ لا موجود بھی ایک ''شے''، ایک ''ذات'' اور ایک امر ثابت ہے ، یعنی ایک حقیقت ثابتہ ہے ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عالم کے وجود میں آنے سے پہلے اللہ کو ان جملہ اشیا (ذوات) کا علم تھا جو اسے پیدا کرنا تھیں اور جن اشیا کا اسے علم تھا ان کی اس کے اس علم ہی کی بدولت ایک گونہ حقیقت قائم ہو چکی تھی ۔ عالم کو خلق کر کے اس نے ان اشیا (ذوات) کو عرضِ وجود دے دیا ۔ حکمائے اسلام میں الفارابی اور ابن سینا معتزلہ کی طرح ہستی کو عرض تسلیم کرتے ہیں ، لیکن ابن رُشد اور اشاعرہ [رک بہ اشعریہ] ہستی کو جوہر قرار دیتے ہیں ۔

مآخذ : (۱) عدم کے نظریے کو معتزلہ جس شکل میں مانتے تھے وہ ان کتابوں میں مذکور ہے جو اس فرقے کے بارے میں لکھی گئیں (مثلاً ابن حزم : الفصل، ۵ : ۴۵)؛ (۲) الشہرستانی : نہایۃ الاقدام، طبع Guillaume، ص ۱۵۰ ببعد، میں بھی ایک عمدہ بحث آئی ہے؛ (۳) مسئلے کی عمومی بحث کے لیے دیکھیے ابن رُشد : تہافُت التہافُت، باب ۱ و ۲ کا ترجمہ از S. van den Bergh؛ نیز دیکھیے (۴) S. Pines : *Beiträge zur islamischen Atomenlehre*، ص ۱۱۶ ببعد ۔

(S. VAN DEN BERGH)

⊗ **تعلیقہ** : فاضل مقالہ نگار Van Den Bergh نے عدم (جسے منطقی سلبی کہتے ہیں) کے سلسلے میں ارسطو کی ما بعد الطبیعیات (۵ : ۲۲) کا حوالہ دیا ہے ، لیکن جو مفہوم انھوں نے لیا ہے وہ ارسطو کے مفہوم سے بالکل مختلف ہے ، یہ فرق ارسطو کے اپنے الفاظ سے واضح ہو جائے گا جو حسب ذیل ہیں :

ہم ''سلبی'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں (الف) اس مفہوم میں کہ جب کوئی شے کسی ایسی صفت سے جو قدرت میں موجود ہو متصف نہیں ہوتی ، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ نباتات آنکھوں سے محروم ہے ؛ (ب) اگر ایک شے کسی ایسی صفت کو نہیں رکھتی جو قدرتی طور پر اس میں یا اس کی جنس میں موجود ہوتی ہے ۔ مثلاً اندھا آدمی آنکھوں سے اس طرح محروم نہیں جیسے چھچھوندر ۔ مؤخرالذکر اپنی جنس کی وجہ سے محروم ہے اور اول الذکر اپنی وجہ سے ؛ (ج) اگر کوئی شے ایسی صفت نہیں رکھتی جو قدرتی طور پر اس میں موجود ہونی چاہیے یا وہ صفت اس وقت نہیں رکھتی جب کہ قدرتی طور پر یہ صفت اس میں ہونی چاہیے (اندھا پن ایک قسم کا سلب ہے ، لیکن انسان ہر عمر میں اندھا نہیں ہوتا ۔ صرف اسی وقت اندھا کہلائے گا جب اور جس عمر میں قدرتی طور پر اسے بینا ہونا چاہیے، وہ بینائی سے محروم ہے) ۔ اسی طرح اگر کوئی شے ایک صفت ہے اس رشتے، علاقے، ذریعے اور طریقے سے جس میں وہ قدرتی طور پر ہوتی ہے متصّف نہ ہو تو وہ سلبی کہلائے گی ؛ (د) کسی

شے کی زبردستی علٰحدگی بھی سلب کہلاتی ہے؛ (ہ) سلب کے اتنے ہی مفہوم ہیں جتنے نفی کے جن کا مأخذ نفی لاحقہ (اے) ہے۔ ہم کسی شے کو غیر مساوی (unequal) کہتے ہیں کیونکہ اس میں ''مساوی پن'' نہیں ہوتا (گو قدرتی طور پر ہونا چاہیے) اور غیر مرئی کہتے ہیں کیونکہ اس میں رنگ نہیں ہوتا یا بہت ہلکا رنگ ہوتا ہے۔ پھر نفی لاحقہ سے مراد یہ ہو سکتی ہے ''کسی شے کا بہت تھوڑی مقدار میں ہونا''، مثلاً بے پتھر (stonelen)، یعنی پتھر کا نہایت ہی ابتدائی شکل میں ہونا یا اس سے مراد ''آسانی سے نہیں'' یا ''اچھی طرح نہیں'' ہو سکتی ہے، مثلاً کٹنے کے ناقابل ہونا (uncutable) اس لفظ کا مطلب نہ کاٹا جانا نہیں بلکہ ایسی چیز جو آسانی سے یا اچھی طرح کاٹی نہ جا سکے۔ نیز نفی لاحقہ سے مراد کسی سے مکمل محرومیت بھی ہے۔ یک چشم کو اندھا نہیں کہیں گے، بلکہ اندھا وہ ہوتا ہے جو دونوں آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ ہر آدمی اچھا یا برا، با اخلاق یا بد اخلاق نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں درمیانی حالت بھی ہوتی ہے۔

(سی۔ اے۔ قادر)

⊗ * عَدَن : [جمہوریۂ جنوبی یمن کا دارالحکومت اور بندرگاہ، جو عرب کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۷۱ء میں تقریباً ڈھائی لاکھ تھی]۔ عدن (قب اکّادی زبان: اِدْنیو edniu، بمعنی نیم صحرائی علاقہ Steppe) کا زیادہ صحیح نام عَدَن اَبْیَن ہے (عدنٌ لاعة اور العدن سے امتیاز کرنے کے لیے، جو اُفْنُون التَّغْلبی کے ایک شعر میں آئے ہیں، دیکھیے یاقوت، ۳: ۶۲۲؛ Kay، ص ۲۳۲؛ *AM*، ۲: ۱۷، ۲۸۴)، یا مضبوط جنگی استحکامات کی بنا پر ثَغْر عدن، جو بلینوس (Pliny) کا Philostorgius، Athene کا Αδηνη، Periplus کے Ευδαιμων Αραβία، بطلمیوس کا Αραβία εμπόριον (دیکھیے Pauly-Wissowa: تکملہ، ۳: ۶) اور غالباً یہی تورات کا عدن (کتاب عزرا، ۲۷: ۲۳) ہے۔ اس جگہ کے دیگر ناموں کے لیے دیکھیے المَقْدِسی، ص ۳۰؛ *IM*، ص ۱۱۰ (= Löfgren: *Arab. Texte*، ۱: ۲۹)۔

جزیرہ نمائے عدن دراصل ایک سابق بجھا ہوا آتش فشاں پہاڑ شَمْشَان (عوامی زبان میں شَمْشَام) ہے، جو قدیم زمانے میں اَلعُرّ، یعنی پہاڑ (عُرّ عدن) کہلاتا تھا۔ یہ ۱۷۷۵ فٹ (تقریباً ۵۵۰ میٹر) اونچا ہے۔ اس کی مشرقی سمت جزیرۂ صِیْرہ کے بالمقابل پہاڑی سلسلے میں ایک کھلی جگہ ہے؛ اسی جگہ شہر کا بیشتر حصّہ آباد ہے اور بعض بستیاں سمندر تک جاتی ہیں۔ عدن کسی زمانے میں جزیرہ تھا؛ نشیبی اور تنگ خاکنائے ابھی تک کامل مدّ کے وقت قریب قریب ڈوب جاتی ہے۔ اس نقص کی تلافی ایک پل ''المَکْسِر'' کے ذریعے کر دی گئی تھی، جسے ایرانیوں نے بنوایا تھا (قب ''خور مَکْسَر''، جو خاکنائے کے مغرب میں ہے)۔ بڑے آتش فشاں پہاڑ کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی ہیں، مثلاً جبل، صِیْرَہ حُقّات، مَرْشَق (جس میں ایک بڑا روشنی کا مینار ہے) اور جبل حَدِیْد (خاکنائے کے مغرب میں)۔ پرانی بندرگاہ شہر کے حساب سے مشرقی جانب تھی، جسے جنوب مشرقی ہوا (اَزْیَب) سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک سنگین پشتہ (شَصْنَہ) بنا دیا گیا تھا۔ آج کل عدن کی اہمیت اس کی [موجودہ اور] نہایت عمدہ بندرگاہ کی مرہون منت ہے؛ یہ ایک وسیع اور خوب محفوظ کھاڑی ہے، جو جزیرہ نمائے عدن اور جزیرہ نمائے ''عدن اصغر'' کے درمیان واقع ہے؛ اس میں مُزَلْقَم ("Sugarloaf Peak") اور احسان ("Ass's Ears") کے پہاڑ ہیں۔ بندر

تَویہ (تَواهی)، جو جدید بندرگاہ کا نام ہے، شمال مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے (تفصیلات کے لیے دیکھیے *Red Sea and Aden pilot*، ص ۱۳۵)۔ خطّۂ عدن میں پانی کے بند اور حوض بنانے کے دستور کے آثار باقی ہیں، جو قدیم سبائی ثقافت کی خصوصیت تھی۔ کوئی پچاس کے قریب پانی کے ذخیروں کے بچے کھچے حصے تمام جزیرہ نما میں بکھرے پڑے ہیں۔ بقول ابن المُجاوِر انھیں سِیراف سے آئے ہوئے ایرانیوں نے تعمیر کیا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں Salt نے اور ۱۸۳۵ء میں Haines نے، جس نے آگے چل کر عدن فتح کیا، اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ اچھی حالت میں تھے، لیکن ۱۸۳۹ء کے بعد یہ بے اعتنائی کی نذر ہوگئے اور ان کے بہت سے عمارتی پتھر لوگ ۱۸۵۶ء تک لے جاتے رہے، تاآنکہ آتش فشاں کے دہانے کے اندر والے حوضوں کی مرمت کا کام شروع ہوا۔ وہاں تیرہ تالاب ہیں، جن میں تقریباً بیس لاکھ لیٹر پانی آ سکتا ہے، لیکن کم اور بے قاعدہ بارش کے سبب وہ بمشکل پورے طور پر بھرتے ہیں۔ دہانۂ کوہ کے اندر اور جزیرہ نما کے مغربی حصے میں متعدّد کنویں ہیں (قَب ابن المُجاور، ص ۱۳۱ ببعد)، لیکن وہ پینے کے پانی کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے، کیونکہ وہ زیادہ تر کھاری ہیں۔ قرون وسطی میں الحیق (شاید موجودہ الحسوہ) عدن کا گھاٹ (مَنْہل) تھا (الھَمدانی، ص ۵۳)۔ ۱۸۶۷ء میں برطانوی حکومت نے سلطان لَحج [رَکّ بآن] سے شیخ عثمان نامی گاؤں سے ایک نہر نکالنے کی اجازت حاصل کی اور بعد ازاں وہاں آلات تکثیف (condensers) نصب کیے گئے۔

عام اساطیری کہانی میں عدن کی بنا شدّاد بن عاد [رَکّ بآن] سے منسوب کی گئی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے یہاں کی مشہور پہاڑی سُرنگ کو پورے پہاڑ کے آرپار کھدوایا؛ وہ اس جگہ کو قید خانے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک روایت [یمن کے] تُبَّعُون (تبابعہ) اور مصر کے فراعنہ کے متعلق بھی بیان کی جاتی ہے، جس سے الحَبْس یا حَبْس فرعون کا نام نکلا ہے۔ قدیم روایت کی رو سے (مثلاً الطَّبَری، ۱ : ۱۴۴) قابیل اپنے بھائی ہابیل [رَکّ بآن] کو قتل کر کے اپنی بہن کے ساتھ ہندوستان سے بھاگ کر عدن چلا گیا تھا۔ یہاں جبل صِیْرہ پر اس کی ملاقات ابلیس سے ہوئی، جس نے اسے مزامیر کا استعمال سکھایا۔ اس کی قبر آج کل بڑے درّے کے دروازے کے اوپر دکھائی جاتی ہے۔ بئر مُعَطَّلَہ (=متروک کنواں؛ دیکھیے ۲۲ [الحج] : ۴۴) اور ''اِرم ذاتُ العِماد'' [رَکّ بآن]؛ (۸۹ [الفجر] : ۶) کی جائے وقوع عدن میں یا اس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ بقول ابن المُجاور ہنومان نے، جو ہندوؤں کا لنگور نما دیوتا ہے اور جس کا مندر عدن میں ہے، رام چندر جی کی بیوی کو ایک زمین دوز راستے کے ذریعے صِیْرہ سے، جہاں اسے راون نامی ایک دیو لے گیا تھا، واپس اُجّین [؟] پہنچا دیا تھا۔

بقول الھَمدانی (ص ۵۳، ۱۲۴) عدن کے عرب تین گروہوں میں منقسم تھے: مَرَب، حُماحِم (جَماجِم، در ابنِ المُجاور) اور مَلّاح (قَب، یاقوت، ۳ : ۶۲۲؛ *BGA*، ۳ : ۱۰۲ و ۴ : ۲۰۶)۔ ہندوؤں اور سمالیوں کی بھاری تعداد سمندر کے راستے مسلسل نقل وطن پر دلالت کرتی ہے۔ ابن المجاور (ص ۱۱۷ ببعد) کے ہاں ان کی مدغاسکر (قُمر) سے براہ مُغادیشو و کِلْوہ اور ایرانیوں کی سیْراف اور قَیْس (کِیش) سے قدیم نقل مکانیوں کی تفصیلات مندرج ہیں دیکھیے (Ferrand:

Le K'ouen-Louen، در JA، ۱۹۱۹ء؛ Goitein، در BSOAS، ۱۹۵۴ء، ص ۲۴۷ ببعد؛ وہی مصنف در Speculum، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۱ ببعد؛ عدن کے یہودیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو (جن کے متعلق دیکھیے Encyclopaedia Judaica، بذیل مادّۂ عدن) زمانۂ حال میں اسرائیل پہنچا دیا گیا ہے۔

عدن کی قدیم تاریخ بہت نامکمّل طور پر معلوم ہے۔ ہمیں Periplus (حدود ۵۰ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کو حال ہی میں KAICAP (غالباً یہ غلطی ہے، بجائے IAIÇAP = الشِّرَح یَحْصِب، قب Höfner v. Wissmann Beiträge، ص ۸۸) نے تباہ کر دیا تھا، لیکن شہنشاہ قسطنطین Constantine کے عہد میں یہاں کی (رومی منڈی) (Eporium Romanum) نے اپنی قدیم شان و شوکت پھر حاصل کر لی تھی۔ اسقف تھیوفیلس Theophilus (حدود ۳۴۲ء)، نے وہاں ایک گرجا تعمیر کروایا تھا۔ بعد میں عدن بحر احمر کی بندرگاہوں اَھْواب اور غُلافقہ کے حق میں اپنی اہمیّت کھو بیٹھا۔ ایرانیوں نے (۵۷۵ء کے بعد سے) یمن میں ثقافت کو ترقی دی۔ انھوں نے پانی کے حوض اور حمّام بنائے اور دباغت کے کارخانے قائم کیے۔ باذان کے بعد آخری ساسانی حاکم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ حضرت علیؓ ۱۰ھ/۶۳۱ء میں عدن تشریف لائے اور وہاں کے منبر سے لوگوں کو خطاب کیا۔ حسین بن سَلامَہ نے، جو بنو زیاد (۲۰۴ تا ۴۲۹ھ/۸۱۹ تا ۱۰۳۷ء) کا وزیر تھا، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی تعمیر کی ہوئی مسجد کی مرمّت کروا کر اسے پہلے کی طرح بنا دیا۔ ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء میں علی بن محمد الصُّلَیْحی نے، جو مصر کے فاطمیوں کا داعی تھا، عدن فتح کیا اور ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں اپنے بیٹے المُکرّم کی شادی کے موقع پر اسے اپنی بہو حُرّہ سیّدہ کو تحفے کے طور پر دے دیا۔ بنو نَجْعَن، جو بنو زیاد کے بعد ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء سے عدن پر قابض ہوگئے تھے، ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء تک اس کے والی رہے؛ پھر جب انھوں نے بغاوت کی تو انھیں معزول کر کے الکَرَم (مُکَرّم) بن یام کے ہمدانی خاندان کے دو بھائیوں کو ان کی جگہ بٹھا دیا گیا اور یہ بنو زُرَیعہ (رَکّ بآن) کے بانی ہوے۔ ایک بھائی عبّاس نے قلعۂ تَعْکَر میں سکونت اختیار کر لی، جہاں سے وہ خاکنائے کے دروازے کی دیکھ بھال کرتا تھا اور دوسرے بھائی مسعود نے قلعۂ خَضْراء سنبھال لیا اور بحری تجارت کی نگرانی کرنے لگا۔ بعد ازاں یہ شہر محمّد بن سَبأ (۵۳۴ تا ۵۴۸ھ/۱۱۳۹ تا ۱۲۲۸ء) اور اس کے بیٹے عمران (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء) کے تحت متّحد ہوگیا۔ اس زمانے کا خراج ایک لاکھ دینار سالانہ بتایا جاتا ہے۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں صلاح الدّین کے بھائی تُوران شاہ نے اجیر ترکی سپاہیوں (غُز) کی مدد سے عدن فتح کر لیا۔ ایّوبیوں (۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء) رسولیوں (۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء) اور طاہریوں (۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کی حکومت کا عہد عدن کی تجارت کا سنہری دور تھا۔ ایوبیوں نے ایک نیا محصول عائد کیا تھا جسے شوانی (جنگی جہاز) وصول کرتے تھے۔

ہندوستان کو جانے کے بحری راستے کی دریافت اور عثمانی حکومت کا ظہور عدن کی تجارت کے زوال کی ابتدا ثابت ہوے۔ پرتگیزی امیر البحر البوقرق Albuquerque نے بیس جہازوں کے ساتھ اس شہر پر ایسٹر Easter ۱۵۱۳ء کی شام کو حملہ کیا، لیکن اسے فتح کرنے میں ناکام رہا۔ ۱۵۳۸ء میں ترکی بحری جہازوں کے ایک بیڑے نے ہندوستان جاتے ہوے اس کے مدافعین کو زک دی اور ترک یمن پر کوئی ایک سو سال

تک مسلّط رہے - ۱۵۶۸ء میں عدن صنعاء کے زیدی اماموں کے ہاتھ میں چلا گیا اور ۱۶۳۰ء میں ترکوں نے اسے بالکل چھوڑ دیا۔ ۱۷۳۵ء میں عدن لَحْج کے عَبْدلی سلطان کے ہاتھ آ گیا، جس کا ایک وارث مُحْسن اسے کپتان ہینز Haines کے ماتحت انگریزوں کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو گیا - یہ مہم ایک برطانوی جہاز کو لوٹ لینے پر تاوان وصول کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی، جس نے ۲۰ جنوری ۱۸۳۹ء کو یورش کر کے عدن چھین لیا - یہ خوش حال شہر جس کی سیاحت مارکو پولو Marco Polo نے ۱۲۷۶ء میں کی تھی اور جس میں اسّی ہزار باشندے اور تین سو ساٹھ مسجدیں تھیں، اب فقط چھے سو باشندوں کا ایک خستہ حال گاؤں رہ گیا تھا جو جھونپڑیوں میں رہتے تھے - اس دن کے بعد عدن نے تیزی سے ترقی شروع کی، خصوصاً ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھل جانے کے بعد - یہ "عربی جبل الطارق" اب روز افزوں اہمیت کا تجارتی مرکز بن گیا ہے۔

عمارات، بنو زُرَیْع نے تجارت کو تحفظ دینے کے لیے ایک فصیل تعمیر کی تھی، اس کے بعد پتھر سے بنائے ہوئے مکانوں کی تعداد بڑھنے لگی - توران شاہ کی روانگی کے بعد عدن میں اس کے نائب عثمان الزَّنْجِیلی (زنجیلی) نے ایک اور بھی بڑی فصیل تعمیر کی، جس میں چھے بڑے دروازے اور ایک محصول خانہ تھا - تُغْتکین بن ایوب، اس کے بیٹے اسمٰعیل، رسولی علی المُجاهد اور طاهری عبدالوهّاب کی لافانی عمارات کا ذکر بھی موجود ہے، (AM، ص ۱۰ ببعد)۔ "ان خوش نما حماموں میں سے جن کے حاشیے سنگ مرمر اور سنگ یشب کے اور چھتیں قبّہ دار تھیں" اور جنھیں ۱۷۰۸ء میں Playfair de Merveille، از La Roque) نے دیکھا تھا، اب کوئی باقی نہیں رہا ہے - عدن کی مساجد میں سب سے ممتاز ابوبکر العَیْدَرُوس شہر کے محافظ ولی کی ہے، جن کی زیارت (=عرس) ۱۵ ربیع الآخر کو ہوا کرتی ہے - دیگر مساجد کا ذکر Hunter (ص ۱۷۵ ببعد) نے کیا ہے اور AM میں ملتا ہے۔

مآخذ : (۱) F. M. Hunter : *An account of the British settlement of Aden* لنڈن ۱۸۷۷ء؛ (۲) F. Apelt : *Aden. Eine kolonialgeographische u. kolonialpolitische Studie*، امتحانی مقالہ، لائپزگ، ۱۹۲۹؛ (۳) الهَمْدانی، بمواضع کثیرہ (ترجمہ از Forrer ص ۳۱)؛ (۴) یاقوت، ۳ : ۶۲۱؛ (۵) المَقْدِسی، ص ۳۰ و بمواضع کثیرہ؛ (۶) الإدْرِیسی (مترجمہ Jaubert)، ۱ : ۵۱؛ (۷) القَزْوینی (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۶۷؛ (۸) ابوالفداء: تقویم، ترجمہ، ۲/۱ : ۱۲۶؛ (۹) ابن بَطُّوطہ، ۲ : ۱۷۷ تا ۱۷۹؛ (۱۰) ابن المُجاور (طبع Löfgren)، ۱ : ۱۰۶ تا ۱۴۸ (=IM)؛ (۱۱) ابو مَخْرَمہ : تاریخ ثَغْر عدن (=AM)، در O. Löfgren : *Arabische Taxte zur Kenntnis der Stadt Aden im Mittelalter*، اپسلا ۱۹۳۶ - ۱۹۵۰؛ (۱۲) احمد فضل بن مُحْسن العَبْدلی : هدیّة الزّمن فی اخبار ملوک لَحْج و عَدن، قاهرة ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء؛ (۱۳) R. L. Playfair : *A history of Arabia Felix*، بمبئی ۱۸۵۹ء؛ (۱۴) H. C. Kay : *Yaman, its early mediaeval history*، لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۱۵) H. von Maltzan : *Reise nach Südarabien*، ۱۸۷۳ء؛ (۱۶) H. F. Jacob : *Kings of Arabia*، لنڈن ۱۹۲۳ء؛ (۱۷) H. Ingrams : *Arabia and the isles*، لنڈن ۱۹۴۲ء؛ (۱۸) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، Wienna-Brünn ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء؛ (۱۹) H. v. Wissman و M. Höfner : *Beiträge zur histor. Geographie des vorislam. Südarabein*، Wiesbaden ۱۹۵۳ء، نقشہ : Aden

Protectorate ۱۹۳۰ء (Geogr. Section Gen. Staff)، عدد ۳۸۹۲، پیمانہ : ۱ : ۲۵۳ - ۴۴۰)۔

(۲) برطانوی علاقہ (۱۹۳۷ء سے شاہی نو آبادی) در جنوب مغربی عرب، بشمول شہر عدن، جزیرہ‌نما اور خاکنائے، شہر شیخ عثمان مع نواحی اضلاع، جزیرہ‌نمای عدن اصغر اور جزیرہ؛ رقبہ : تخمیناً ۸۰ مربع میل - آبادی : تقریباً پینتالیس ہزار۔

(۳) برطانوی زیر حمایت ریاست، مغربی اور مشرقی نصف میں منقسم ہے، جن کے مرکز عدن اور مُکَلّا ہیں - (الف) عدن کی مغربی زیر حمایت ریاست (تقریباً چالیس ہزار مربع میل) نو ضلعوں (Cantons) پر مشتمل ہے، یعنی (مغرب سے مشرق) صُبَیْحی، عامری (دارالحکومت : ضالع)، عَلَوی، حَوْشَبی (دارالحکومت مُسَیْمِر)، عَبْدلی (دارالحکومت لحج)، عَقْرِبی، بالائی اور زیریں یافعی، فضلی (دارالحکومت شُقرا) بالائی اور زیریں عَوْلَقی (دارالحکومت اَحْور)، علاوہ عَوْذلی اور بَیْحانی ضلعوں کے (ان میں سے ہر ایک پر مقالات دیکھیے)؛ (ب) عدن کی مشرقی زیر حمایت ریاست (ستّر تا اسّی ہزار مربع میل) حَضْرَ موت کی ریاستیں (قُعَیْطی اور کَثِیری) (دیکھیے حَضْرَ موت)، بَلْحاف اور بَرْعلی کی واحدی سلطنتیں، عرقہ اور حَوْرہ [رَکّ بان] کی ریاستیں اور قِشْن اور سُقُطْرہ [رَکّ بان] کی مہری سلطنت، آبادی : تقریباً ساٹھ ہزار۔

مآخذ : (۱) D. Ingrams : *A survey of social and economic conditions in the Aden protectorate*، اَسْمَرہ ۱۹۴۹ء۔

(O. LÖFGREN)

* عَدْنان : عربوں کے سلسلۂ انساب کی رو سے جس نے ۸۰۰ء کے قریب ابن الکَلْبی کی تصنیف میں آخری شکل اختیار کی، عدنان شمالی عربوں کا جد امجد تھا - شمال مغربی عرب کے نبطی کتبوں میں یہ نام دو جگہ مذکور ہے (عبدعَدْنون، عدنون؛ Jaussen et Savignac : *Mission Archéologique en Arabie*، پیرس ۱۹۰۹ - ۱۹۱۴ء، شمارہ ۳۸، ۳۲۸)۔ یہ نام ثمودی کتبوں میں بھی ملتا ہے (Lankester Harding Littmann/: *Some Thamudic Inscriptions*، لائیڈن ۱۹۵۲ء)، اور لوبان کی شاہراہ کے ساتھ ساتھ جنوبی عرب میں لایا گیا تھا (*Corpus Inscriptionum Semit.*، ج ۴، شمارہ ۸۰۸)۔ جیسا کہ الجُمَحی : طبقات (طبع Hell) ص ۵، دیکھیے (نیز ابن عبد البَرّ : الأنباہ علی قبایل الرُّواہ، قاہرہ، ۱۳۵۰، ص ۴۸) پہلے ہی لکھ چکا ہے، یہ نام زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتا (لبید، قصیدہ ۴۱، شعر ۷ الحاقی ہے)، اور اسلام کے ابتدائی دور کی کی کتابوں میں بھی بہت شاذ آتا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ سلسلۂ انساب میں اس نام نے جو جگہ پائی ہے، اس کا سبب بنو امیّہ کے عہد میں نِزار اور رَبِیْعہ جیسے فرقوں کے جھگڑے نہیں تھے، بلکہ دراصل یہ نام زمانۂ قبل از اسلام سے چلا آ رہا ہے، اگرچہ یہ بدوی روایات سے ماخوذ نہیں ہے - اس نظام انساب کے بعض دیگر بنیادی عناصر کی طرح یہ نام بھی مکّی روایات سے اخذ ہو سکتا ہے - یہ بات قابل توجہ ہے کہ قومی احساس کے احیا کی بدولت یہ نام ''عدنان'' انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں ترکی میں پھر رائج ہوگیا تھا - یہ امر اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان ترکی تحریک اپنے ابتدائی مراحل میں ایک ایسی عثمانی قومیت کی نمائندگی کرتی تھی جس میں عرب روایات بھی شامل تھیں۔

مآخذ : (۱) W. Caskel : *Die Bedeutung der Beduinen für die Geschichte der Araber*, *Arbeitsgemeinschaft* für Forschung des Landes Nordrhein-Westfalen, *Geisteswissenschaften*, (عدد ۸)، طبع Köln و Opladen، ۱۹۵۳، ص ۱۱ ببعد؛ (۲) *CIH*، ص ۸۰۸؛ (۳) اُرّ انگریزی بذیل مادۂ نزار؛ (۴) Jaussen و Savignac : *Mission Archèologique en Arabie*، ج ۱، ۲، پیرس ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۴ء، شمارہ ۳۸، ۳۲۸؛ (۵) Lankester Harding/Littmann : *Some Thamudic Inscriptions*، لائیڈن ۱۹۵۲ء؛ (۶) G. Strenziok : *Die Genealogie der Nordaraber nach Ibn al-Kalbi*، تحقیقی مقالہ، Köln ۱۹۵۳ء، دیکھیے نیز مادۂ نزار [(۷) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب].

(W. CASKEL)

* عَدَوِیّہ : شیخ عدی [رکّ بآں] کے مریدوں، یعنی یزیدیوں کا لقب .

(WEIL)

* عَدی رض بن حاتِم : بن عبداللہ بن سَعْد الطّائی، ابو طریف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی جو آگے چل کر حضرت علی رض کے حامیوں میں شامل ہوگئے۔ وہ مشہور شاعر حاتم الطّائی [رکّ بآں] کے بیٹے اور اسی کی طرح عیسائی تھے۔ انھیں قبیلے کی سرداری اپنے باپ سے ورثے میں ملی - [۷ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں وفد کی صورت میں حاضر ہوے تو آپ نے عزت افزائی فرمائی آپ ص کے اخلاق کریمانہ سے متأثر ہوکر] ۹ھ/۶۳۰ء میں دین اسلام قبول کرلیا [ابن ہشام ۱ : ۹۴۷ ببعد میں عَدی کا اپنا بیان نقل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق اور الطاف کریمانہ کے اثر سے مسلمان ہونا بتایا ہے۔ مقالہ نویس نے اسے چھوڑ کر محض اپنی بدگمانی سے ایک نتیجہ مخالفانہ اخذ کر لیا ہے] وہ قبیلۂ طی اور قبیلۂ اسد کے محاصل بھی وصول کرتے تھے - نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد وہ اسلام پر ثابت قدم رہے اور فتنۂ رِدّہ کے دوران انھوں نے اپنے قبیلے کو مرتد ہونے سے بچائے رکھا - بعد ازاں انھوں نے عراق کی فتح میں حصہ لیا اور حضرت عثمان رض سے نہر عیسٰی پر الرّوحاء بطور جاگیر پائی - یہ جگہ مستقبل کے بغداد سے چنداں دُور نہ تھی - (دیکھیے Le Strange: *Lands*، (بمدد اشاریہ) جنگ جمل میں عَدی حضرت علی رض کے ماتحت لڑے (۳۶ھ/۶۵۶ء) - جنگ صفّین سے پہلے جو نامہ و پیام فریقین کے درمیان ہوا، اس میں وہ اس وفد میں شامل تھے جو حضرت علی رض کی طرف سے امیر معاویہ رض کے پاس بھیجا گیا تھا - ازآں بعد وہ علم بردار بن کر اس جنگ میں لڑے جس میں ان کے تین بیٹے مارے گئے - اس لڑائی میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی - بعد میں وہ کوفے میں رہنے لگے اور حضرت علی رض کی حمایت کے جذبات ترک نہیں کیے - وہ اپنے قبیلے کے ان افراد کو مؤثر طریقے پر پناہ دیتے رہے جنھیں عراق کا طاقت ور والی زیاد ابن ابیہ ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا تھا - حضرت عدی رض نے تقریباً ۱۲۰ سال عمر پا کر ۶۸ھ/۶۸۷ء میں وفات پائی .

مآخذ : (۱) ابن ہشام، ۱ : ۹۴۸ ببعد، ۹۶۵؛ (۲) الطَّبَری بمدد اشاریہ؛ (۳) البلاذُری : فتوح، ص ۲۷۴؛ (۴) وہی مصنف انساب (=O. Pinto و G. Levi : *Il Califfo Mu'awiya* della vida، (۱) بمدد اشاریہ)؛ (۵) ابن قتیبہ : المعارف، قاہرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء، ص ۱۳۶؛ (۶) وہی مصنف : الشّعر و الشّعراء، بمدد اشاریہ؛ (۷) ابو حاتم السِّجستانی : کتاب المعمّرین،

(Goldziher: *Abhandlungen*)، ج ۲، اشاریہ، (۸) النّووی: تہذیب، ص ۴۱۵ تا ۴۱۷؛ (۹) ابن الأثیر: أُسد الغابة، ۳: ۳۹۲ ببعد؛ (۹) ابن حجر: الاصابة، عدد ۵۷۵۴؛ (۱۰) (یاقوت بذیل مادّہ جَوْسیّہ؛ [(۱۱) الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۳: ۱۰۹ تا ۱۱۱؛ (۱۲) الزرکلی: الاعلام، بذیل مادّہ، مع مآخذ.

(A. SCHAADE)

* عَدی بن الرقاع: ابو داؤد عَدی بن زید بن مالک بن الرقاع العاملی، ملک شام کا ایک عرب شاعر جو دمشق میں خلفاے بنو امیّہ، بالخصوص خلیفہ الولید بن عبدالملک کی مدّاحی کرتا تھا۔ اس نے الولید کے حضور میں شاعر جریر سے شعر گوئی میں مقابلہ کیا تھا، وہ اراعی کے حملوں کا بھی تختۂ مشق بنا رہتا تھا۔ عدی اپنے قصیدے کی نسیب کی لطافت کی وجہ سے مشہور تھا لسان العرب میں تقریباً ستر اشعار سے استشہاد کیا گیا ہے (عبدالقیوم: فہارس لسان العرب، ج ۱ بذیل ابن الرقاع)۔ اس کی نظمیں شروع زمانے ہی میں الاندلس میں معروف تھیں (*BAH*، ۹: ۳۶۷)۔ وہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد (۹۶ھ/۷۱۵ء تا ۹۹ھ/۷۱۷ء) تک ضرور زندہ رہا.

مآخذ: (۱) الجُمَحی: طبقات (طبع Hell)، ص ۱۴۴، ۱۴۵؛ (۲) الجاحظ: الحیوان، بار دوم، ۳: ۶۴، ۴: ۳۳۶، ۵: ۴۴۱؛ (۳) ابن قُتَیبہ: الشعر، ص ۳۹۱ تا ۳۹۴؛ (۴) الاغانی، طبع اوّل، ۸: ۱۷۸ تا ۱۸۳؛ ابن دُرَید: الاشتقاق، ص ۲۲۵؛ (۶) المَرزُبانی: معجم، ص ۲۵۳؛ (۷) المَیمَنی: الطّرائف الادبیّة، ص ۸۱ تا ۹۷ (تین نظمیں)؛ (۸) الآمدی: المؤتلف، ص ۱۱۶؛ (۹) النُّویری: نہایة، ۴: ۲۴۶ تا ۲۵۰؛ (۱۰) بر اکلمان: تاریخ الادب العربی، ۱: ۲۴۱ تا ۲۴۲؛ (۱۱) Nallino: *Scritti*، ۶: ۱۶۱، ۱۶۲ (فرانسیسی ترجمہ، ص ۲۴۸).

(CH. PELLAT)

* عَدی بن زید: الحِیرہ کا عیسائی عرب شاعر جو چھٹی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کی زندگی کا کچھ حصّہ المدائن کے ساسانی شاہی دربار میں بسر ہوا، جہاں وہ خسرو پرویز کی ملازمت میں محکمۂ امور عربیہ کا کاتب (سیکرٹری) تھا، کچھ اور حصّہ الحِیرہ کے لخمی دربار میں گزرا جہاں وہ النُّعمان ثالث کا مصاحب و مشیر تھا۔ اس نے نُعمان کو تخت دلانے میں مدد دی تھی، مگر پھر اسی نُعمان نے اس کے دشمنوں کی سازش کے نتیجے میں اسے قید خانے میں ڈال دیا اور وہیں مروا ڈالا (تقریباً ۶۰۰ء)۔ عَدی زمانۂ قبل از اسلام کی عرب تاریخ اور عرب شاعری کی عجیب ترین شخصیتوں میں سے ایک تھا۔ النّابغة الذُّبیانی اور الأعشٰی کے ساتھ مل کر وہ ایک ایسے شستہ و شائستہ درباری شاعر کی نمائندگی کرتا ہے جو صحرا کے شاعروں کی بہ نسبت تہذیب و ذوق کے بلند تر معیار سے بخوبی مانوس ہو، اسی لیے عربوں کی تاریخی ادبی روایات اسے دور جاہلیت کی شاعری کے بڑے دھارے کے کنارے پر جگہ دیتی ہیں کیونکہ اس کی زبان "نجدی" نہیں، حالانکہ جن مضامین پر اس نے طبع آزمائی کی اور جن اسالیب میں ان مضامین کو ادا کیا وہ اسلامی دور کی شاعری پر بہت مدت تک گہرا اثر ڈالتے رہے.

عَدی کا دیوان مفقود ہو چکا ہے، اس کے کلام کے صرف بعض اجزا کا ہمیں علم ہے جنھیں شیخو نے شُعَراء النصرانیة، ص ۴۳۹ تا ۴۷۴، میں نامکمل شکل میں اور تنقیدی شعور کے بغیر جمع کر دیا ہے۔ ان میں الجاحظ: الحیوان، ۴: ۶۵، ۶۶، المَقدسی: البَدْء و التّاریخ، ۱: ۱۵۱ اور ابن قُتَیبہ: الشعر، ص ۱۱۲، ۱۱۳ کے نقل کردہ اشعار کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ ان کے

علاوہ البُحتری کے حماسہ میں مختلف شعر نقل کیے گئے ہیں - ان میں جو اشعار کتاب مقدس کے قصص (پیدائش اور آدم کا پہلا گناہ) کے متعلق ہیں، وہ دین و ثقافت کی تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے دلچسپی کے حامل ہیں - یہ اشعار بعض دیگر شواہد کے ساتھ مل کر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ شاعر عیسائی مذہب کا پیرو (عبّادی) تھا، لیکن اس کی شاعری کا خاص موضوع ایک طرف تو شراب کی تعریف نظر آتا ہے اور دوسری جانب اس میں انسانی جذبات اور جدّ و جہد کے انحطاط پر، جنھیں زمانے کی بے رحم گردش نے بے حقیقت بنا کر رکھ دیا ہے، تأمّل و تفکّر موجود ہے - پہلی قسم کے اشعار میں سے بعض متفرق لیکن اہم مثالیں محفوظ ہیں - ہمیں علم ہے کہ آگے چل کر ولید بن یزید نے اور بعد ازاں ابو نُواس نے عدی کے ان اشعار کو بہت سراہا اور اس کے تتبّع میں اسی موضوع پر اشعار لکھے - دوسرے موضوع پر جو غالبا شاعر کی اپنی بد بختیوں اور مصیبتوں سے پیدا ہونے والے تأثّرات کا نتیجہ تھا، ہمارے پاس اس کے بہت سے قطعات ہیں - یہ نظمیں نہ صرف اپنی زاہدانہ و راہبانہ تنبیہات کی وجہ سے (یہ انداز کلام اس کی عیش پرستی کی خمریہ شاعری سے عجیب و غریب تضاد رکھتا ہے) دلچسپی کی حامل ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں تاریخ مشرق (عرب و ایران) کے متعلق عبرت آموز نظائر و بصائر بھی پیش کیے گئے ہیں، جن سے انسان کی خام خیالی اور بے حقیقتی کا اظہار ہوتا ہے، ایسی نظموں کی مشہور مثال اس کا وہ قطعہ ہے جو اس نے النُّعمان اوّل اور قصر خورنق پر لکھا (الاغانی، بار دوم، ۲ : ۱۳۸ تا ۱۳۹، و مواضع دیگر) - ایک اور قطعہ ہترا Hatra پر لکھا تھا (البُحتری : الحماسہ (طبع شیخو، ص ۱۹۸)، ایک قطعہ وہ ہے جو ابن قُتیبہ، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳ میں منقول ہے اور جو اس نے جَذِیمَۃ الاَبْرَش اور اَلزَّبّاء پر لکھا تھا - یہ قطعہ قریب قریب ایک منظوم داستان (ballad) سے ملتا جلتا ہے - عَدِی کے کلام کی ان باقی ماندہ نظموں سے جن میں چار سو اشعار سے بھی کم ہیں، یہ تأثّر حاصل ہوتا ہے کہ شاعر ایک نہایت ذہین اور ذوق لطیف رکھنے والا شخص تھا جس نے سامی نسل کی قُنُوطیت کے قدیم موضوعات کو عربی شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور زندگی کی بعض اچھی چیزوں کی قدر و قیمت کا مثبت اعتراف بھی کیا ہے - [لسان العرب میں استشہادات کے لیے دیکھیے عبدالقیوم : فہارس لسان العرب، جلد دوم، بذیل مادّہ] .

مآخذ : (۱) ابن قُتیبہ : الشعر، ص ۱۱۱ تا ۱۱۷؛ (۲) الاغانی، بار دوم، ۲ : ۹۷ تا ۱۵۴؛ (۳) J. Horovitz : *'Adi ibn Zaid, the Poet of al-Hira* *IC*، ۱۹۳۰ء، ص ۳۱ تا ۶۹؛ (۴) F. Garbrieli : *Adi ibn Zaid Rend Lin*، ۱۹۴۸ء؛ ص ۸۱ تا ۹۶؛ (۵) Th. Noldeke : *esch. d. Perser u. Araber z. Zeit der Sassaniden*، ص ۳۱۲ ببعد؛ (۶) G Rothstein : *Die Dynastie der Lahmiden in al-Hira* برلن ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۹ ببعد .

(F. GABRIELI)

عَدی بن مُسافِر : الہَکّاری ، عدویوں کے شیخ طریقت ، وہ قرشی اموی عرب تھے، بعلبک کے قریب بیت فار میں پیدا ہوئے - انھوں نے مندرجۂ ذیل بزرگوں سے ملاقات کی : عقیل المَنْبجی، حَمّاد الدّبّاس ، عبدالقاہر السہروردی ، عبدالقادر الجیلی، ابوالوفاء الحُلوانی اور ابو محمد الشَّنْبکی[۲] - انھوں نے دُور دُور کے سفر کیے اور بہت سا زمانہ

جنگلوں میں گزارا، تاآنکہ غالباً ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء سے پہلے لَیْلش میں جو مَوصِل کے قریب ہے، مستقل سکونت اختیار کر کے اپنے لیے ایک خانقاہ بنائی اور ایک سلسلۂ تصوف کی بنا ڈالی جسے عَدَوِیَّہ کہتے ہیں، ان کا طریقہ اتنا مشقت طلب تھا کہ بہت سے مشائخ ان کی پیروی نہ کر سکتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شیخِ طریقت تھے جنھوں نے نو آموز مریدوں کو [باقاعدہ] تربیت دینے کا آغاز کیا ۔ ان کا ''عقیدہ'' (یعنی مسلک) طریق سنّۃ کے مطابق ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی عنصر شامل نہیں ۔ وہ معتزلہ اور تمام مبتدعین کے مخالف تھے ۔ تصوف میں وہ الغزالی کے ہم مسلک تھے ۔ ابن تَیْمیّہ انھیں ایک صحیح الاعتقاد پرہیزگار متبع سنت، . . . بلکہ شیخ طریقت بتلاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیخ عدی پر وجد و حال کی کیفیتیں طاری ہوتی تھیں اور ان کے دوران میں حد شریعت سے کسی قدر تجاوز ہو جاتا تھا جو ان کے جانشینوں کے زمانے میں بڑھتا چلا گیا ۔ ان کی وفات ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں یا اس سے دو سال پہلے یا ایک سال بعد ہوئی ۔ ان سے جو اقوال اور اشعار منسوب کیے گئے ہیں وہ کسی بھی صوفی کے ہو سکتے ہیں ۔ Layard نے ان کی جو نظم نقل کی ہے، وہ مشکل ہی سے اصلی ہو سکتی ہے ۔

ایک عیسائی حکایت کی رو سے، جو رامیشوع نامی ایک راہب نے بیان کی ہے، عدی کُرد تھے؛ ان کا باپ ایک عیسائی خانقاہ کے ریوڑ چرایا کرتا تھا اور خود عدی نے بھی اس کے کام کا انتظام سنبھال رکھا تھا ۔

شیخ عدی کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے ان کے سلسلۂ تصوف کی سربراہی ان کے بھائی صَخر کی اولاد میں چلی گئی ۔ ایک بیان یہ ہے کہ عدی نے اپنے ایک خادم کے بیٹے حَسَن البَوّاب کو متبنّٰی کر لیا تھا، اور اسی کی اولاد میں سے اس سلسلے کے پیشوا ہوے جن کا غیر معمولی احترام کیا جاتا تھا ۔ لوگ انھیں عقد میں اپنی لڑکیاں دینا فخر سمجھتے تھے ۔ یہ سلسلہ زیادہ تر کردوں ہی تک محدود تھا ۔ اس کی ایک خانقاہ بہ مقام قرافہ قاہرہ، میں بھی تھی ۔ اس سلسلے کے ارادتمند شیخ عدی کی تعظیم و تکریم میں حد سے بڑھ گئے اور یہ اعتقاد رکھنے لگے کہ وہ اپنے معتقدین کو روزی دیتے ہیں ۔ یہ فرقہ اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ حکومت کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوئی اور اس نے ان کے استیصال پر کمر باندھی ۔ ۶۵۰ھ میں بدرالدین لؤلؤ والی موصل نے شیخ عدی کا مقبرہ مسمار کرا دیا ۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس خاندان کے ایک آدمی کے پاس بیت فار میں قریب قریب ایک شاہانہ ریاست تھی، انھیں میں کا ایک شخص، امیران، شام کی حکومت کی ملازمت میں رہا اور پھر ملازمت ختم کر کے مِزّہ میں جا بسا تھا ۔ کرد اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور اسے نذرانے دیتے تھے ۔ کردوں نے بغاوت کا ایک منصوبہ بنایا تھا، لہٰذا امیران قید خانے بھیج دیا گیا (خود اپنی خواہش سے : الدُّرر الکامنہ، ۱ : ۴۱۴) اور پھر وہ شورش فرو ہو گئی ۔ اگرچہ کرد اس برج کے سامنے جہاں اسے قید کیا گیا تھا تعظیماً سر جھکایا کرتے تھے ۔

۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں عوام نے ایک فقیہ کی انگیخت پر شیخ کی قبر توڑ ڈالی، لیکن بعد میں قبر کو دوبارہ تعمیر کر دیا گیا ۔

شیخ عدی کی تاریخی شخصیت اور یزیدی

مذہب کے فروغ میں ان کی سرگرمیوں کے لیے دیکھیے ''یزیدی''.

مآخذ : (۱) ابن الأثیر : ۱۱ : ۱۹۰ (بذیل سال ۵۵۷)؛ (۲) ابن خلّکان، عدد ۴۲۶؛ (۳) الشطنوفی : بہجة الأسرار، ۱۵۰؛ (۴) ابن تیمیه، مجموعة الرسائل، ۱۹۰۵ء، ۱:۲۷۳؛ (۵) ابن شاکر : فوات، ۱ : ۱۵۸؛ (۶) ابن کثیر، ۱۲ : ۲۴۳؛ (۷) المقریزی : الخطط، ۲:۴۳۵؛ (۸) وهی مصنف : السلوک، بذیل سال ۸۱۷ھ؛ (۹) التادفی : قلائد الجواهر، ۱۳۰۳، ۱۰۷؛ (۱۰) حاجی خلیفه، ۴ : ۲۴۳؛ (۱۱) یاقوت، ۴ : ۳۷۴؛ (۱۲) ابن العماد : شذرات الذّهب، ۴ : ۱۷۹؛ ۵ : ۲۲۹؛ (۱۳) ابن العبری (Bar Hebraeus) : *Syriac Chronicle* (طبع Bedjan)، ۴۹۸ (= *Eccl. Chron.*، ۱ : ۲۶)، *Arabic Chron.*، ص ۴۶۶؛ (۱۴) F. Nau، در *ROC*، ۱۹۱۴ء، ص ۱۰۵؛ ۱۹۱۵، ۱۴۲؛ (۱۵) W. Ahlwardt : *Verzeichnis*، بمدد اشاریه؛ (۱۶) A. H. Layard : *Nineveh and its remains*، ۱:۲۹۳ ببعد؛ (۱۷) وهی مصنف *Discoveries in the ruins of Nineveh and Babylon*، ۷۹ ببعد؛ (۱۸) G. P. Badger : *Nestorians and their rituals*، ۱ : ۱۱۳ ببعد؛ (۱۹) R. Frank : *Scheich 'Ady* (Türk Bibl. 14)، برلن ۱۹۱۱ء؛ (۲۰) Th. Menzel، در H. Grothe : *Meine Kordrasien-sexpedition*، لائپزک ۱۹۱۱ء، ۱ : ۱۰۹ ببعد؛ (۲۱) احمد تیمور : الیزیدیة و منشأ نحلتهم، قاهره ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء؛ (۲۲) عبدالرّزاق : عبدة الشّیطان، صیدا ۱۹۳۱ء؛ (۲۳) M. Guidi، در *RSO*، ۱۹۳۲ء : ۴۰۸ ببعد؛ (۲۴) Lescot : *Enquête sur les 'Yezides*، بیروت ۱۹۳۸ء؛ [(۲۵) الزرکلی : الأعلام، ۵ : ۱۱ مطبوعهٔ قاهره؛ (۲۶) عباس العزاوی : تاریخ العراق، ۳ : ۳۶ تا ۳۸ مطبوعهٔ بغداد].

(A. S. TRITTON [و تلخیص از ادارہ])

عذاب [و عذاب القبر] : رک به قبر.

عَذْراء : رک به وامق و عذراء. *

عَذْراء : رک به نجوم (علم). *

عُذْرة : ایک یمنی قبیله جو قُضاعه کے بڑے ذیلی گروہ سے متعلق ہے - شجرۂ نسب : عُذْره بن سَعْد هُذَیْم بن زید بن لَیْث بن اسلم بن الحاف بن قضاعه (Wüstenfeld : *Geneal Tabellen*، ۱ : ۱۸) - ہمیں اس قبیله کے زمانۂ بعید کے حالات بالکل معلوم نہیں - سپرنگر نے (*Die alte Geographie Arabiens*، ص ۲۰۵، ۳۳۳) پر یه رائے ظاہر کی ہے که یه قبیله وہی تھا جس کا بطلمیوس نے (*Aopitai*) کے نام سے ذکر کیا ہے، لیکن یه یقینی نہیں ہے - تاریخی عہد میں یه قبیله عرب کے شمالی حصّے اور قُضاعه کے دوسرے قبائل (نَہْد، جُہَیْنه، بَلِی، کَلْب) کے پڑوس میں آباد تھا اور اس کا علاقه شمالی عرب کے قبیلۂ غطفان سے متصل تھا - وادی القرٰی اور تَبُوک ان کے خاص مراکز کی حیثیت سے مذکور ہیں، لیکن یه قبیله ایله تک جو بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے پھیلا ہوا تھا - شمالی عرب کے اضلاع میں ان کی آمد اور قیام کو قُضاعه کی ہجرت کا نتیجه قرار دیا جاتا ہے جو حِمْریون سے جنگ کے بعد عمل میں آئی (دیکھیے خاص طور پر البکری، ص ۱۸، ۲۲، ۲۷، ۲۹ ببعد؛ Wüstenfeld : *Die Wohnsitze u. Wanderungen d. arab, Stämme* ص ۲۵، ۳۱، ۳۷، ۴۱ قَبَ الاغانی ۱۶ : ۶۱) - یه بھی بیان کیا جاتا ہے که عُذره نے وادی القرٰی کے یہودیوں سے ایک معاہده بھی کیا تھا جس کے تحت انھیں اس علاقے میں بدویانه زندگی بسر کرنے کی اجازت تھی اور اس کے بدلے میں انھوں نے یہودیوں کے نخلستانوں اور باغوں کا احترام ملحوظ رکھا.

عُذره کا سَعْد هُذَیْم کے دوسرے قبائل سے

ہمیشہ بہت حلیفانہ تعلق رہا (بالخصوص بنوضنّہ سے جو عُذرہ کی ایک شاخ کے ہم نام تھے اور بنو سَلامان سے) اور ان قبائل کو ساتھ ملا کر اسے صُحار کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا (جس کا ایک مشکوک اشتقاق یاقوت نے معجم، ۳:۳۶۸ میں بیان کیا ہے) - یہ قبیلہ جُہینہ سے بھی تعلق رکھتا تھا جن پر بعض مآخذ میں صُحار کا اطلاق ہوا ہے - اس حلیفانہ تعلق کو حَرب القارظ کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے جس نے قضاعہ کو منتشر کرکے انہیں تہامہ سے نکلنے پر مجبور کیا جہاں وہ یمن سے ہجرت کے بعد بس گئے تھے .

ہمیں معلوم ہے کہ جدید تاریخی تحقیقات کی رُو سے انساب کے ان روایتی بیانات میں بمشکل ہی کوئی حقیقت تسلیم کی جا سکتی ہے؛ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ عذرہ ان قبائل سے بھی حلیفانہ تعلق رکھتے تھے جو انہیں روایات کے مطابق شمالی قبائل کے زمرے میں شامل تھے، مثلاً بکر بن وائل اور جَزآرہ [کذا] - یہ صحیح ہے کہ الہمدانی (جزیرۃ العرب، طبع Müller، ۱ : ۱۱۶، ۱۱۷) عُذرہ کی ایک شاخ ساکن جنوبی عرب کی نشان دہی کرتا ہے، لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اشارہ اسی قبیلے کی طرف ہے یا اسی نام کے کسی دوسرے قبیلے کی طرف بالخصوص جب کہ شجروں میں ہر جگہ بعض دوسرے قبائل کا بھی ذکر آتا ہے جن کا نام عُذرہ تھا (قب محمد بن حبیب: مختلف القبائل، طبع Wüstenfeld، ص ۳۷، جو ایسے چار قبائل کا ذکر کرتا ہے؛ ابن الکلبی : جَمْہَرَۃُ الْاَنْساب میں اس قسم کے اور پانچ قبائل کا ذکر کرتا ہے) .

روایات کے مطابق عُذرہ قریش مکّہ سے بہت قریبی نسبت رکھتے تھے - بیان کیا جاتا ہے کہ قریش کے جدّ امجد قُصیّ [رک بآن] نے جس کی والدہ ایک عُذری سے منسوب تھی، اسی قبیلے میں پرورش پائی تھی - یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا سوتیلا بھائی رِزَاح (Wüstenfeld: *Geneal. Tabellen*، ۱ : ۲۴ میں اس کا نام غلطی سے درّاج) بن ربیعہ بن حرام بتایا گیا ہے - دوسری طرف یثرب کے دو قبیلے اوس اور خَزرَج کے جدّ امجد کی والدہ کو بھی جس کا نام قیلہ بنت کاہل (یا بنت ہالک) بن عُذرہ تھا عذری کہا جاتا ہے - اس طرح انصار اور قریش دونوں ننھیال کی طرف سے عُذرہ سے تعلق رکھتے تھے .

عُذرہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شمس نامی ایک دیوتا کی عبادت کرتے تھے (الیعقوبی، ۱:۲۹۶، ۳۰۱)، لیکن اس کے متعلق کوئی تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہے .

عُذرہ کی خاص شاخیں (ابن دُرید : کتاب الاشتقاق، ص ۳۲۰) بنو ضِنّہ، بنو جُلْہَمَہ، بنو زَقْزَقہ بنو الجَلحاء، بنو حَرْدَش اور بنو حُنّ تھیں - ابن الکلبی (جمہرۃ الانساب) نے ان میں بنو مُدْلِج کا بھی اضافہ کیا ہے جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ کثیر التّعداد اور طاقتور تھے (Wüstenfeld کی *Geneal. Tabellen* میں ان کا ذکر نہیں ملتا) .

زمانۂ جاہلیت میں عُذرہ کے حالات جنگجوئی کی داستانوں سے خالی ہیں - غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے عُذری شعرا کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور ہمیں معلوم ہے کہ قبائل کے درمیان جنگوں کی رودادیں تقریباً تمام تر شعرا کے ایسے اشعار پر مبنی ہیں جن میں ان کا ذکر آیا ہے؛ تاہم ایک جنگ کا ذکر موجود ہے جو کسی زمانے میں جس کا ٹھیک تعیّن نہیں کیا گیا ہے، عذرہ اور بنو اَشْجَع کی ایک شاخ بنو مرّہ (یاقوت: معجم، ۱:۱۷۱) کے درمیان ہوئی تھی - اس کی اُس شکست کا حوالہ جو عَبْس کے ہاتھوں انہیں اٹھانا پڑی تھی، ایک عَبْسی شاعر کی نظم

میں ملتا ہے (المفضلیات)، طبع Lyall، ص ۸۲۶، س ۲)، لیکن حجاز اور شام کی درمیانی شاہراہ پر انہیں جو اقتدار حاصل تھا اس کی بدولت عذرہ کا کافی اثر رہا ہوگا ۔ اس کا ثبوت ایک شخص ھَوذہ ابن عمرو (ابن دُرَید: کتاب الاشتقاق، ص ۳۲۰، یا ھَوْذہ بن ابی عمرو جو صحیح تر ہے) کے لقب سے ربّ الحجاز سے بھی ملتا ہے جس کی ثنا خوانی نابغہ نے کی ہے، (قَبّ Derenbourg *Nabiga Dhobyâni iédit*، ص ۴۸ عدد ۴۷ *J.A.* ۱۸۹۹ء)، جہاں ضَبّہ کے بجائے ضِنّہ پڑھنا چاہیے)۔ یہ ہوذہ نیم افسانوی معمّر شاعر عَسّ یا عِثیَر (جس کی اور کئی مختلف شکلیں ہیں) بن لبید قُبّ، Goldziher: *Abhand. z. arab. Phil.* ۱: ۴۲ اور حواشی مندرجۂ ص ۳۰ س ۳؛ Nöldeke: *ZDMG* ۵۶: ۱۶۸) کی اولاد میں سے تھا ۔ نابغہ نے عذرہ کی ایک اور شاخ بنو حُنّ کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں جس کے خلاف حیرہ کے فرمانروا النعمان ثالث نے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تھا (قصیدہ؛ عدد ۱۳؛ Ahlwardt؛ یاقوت: معجم، ۱: ۵۸۳)۔

تاریخ میں عذرہ کے کارناموں کی شہرت ظہور اسلام کے بعد ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ وادی القُرٰی میں انہیں جو رسوخ حاصل تھا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اسی کے مدّ نظر ان سے دوستانہ تعلّقات قائم کیے ۔ ہجرت کے دوسرے سال آپؐ نے انہیں ایک خط لکھا (ابن سعد: ۱/۲: ۳۳) لیکن بظاہر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ۷ھ میں آپ نے ایک شخص کو جو مذکورۂ بالا ہوذہ کی نسل سے تھا ایک جاگیر (قطیعہ) عطا فرمائی کیونکہ وہ اہل حجاز میں سے پہلے شخص تھے جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں (بنو عذرہ کا) صدقہ پیش کیا تھا (البلاذری: فتوح، ص ۳۵)۔ آئندہ سال وہ بوزنطیوں کے خلاف غزوۂ مؤتہ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوئے (ابن ہشام: سیرۃ، ص ۷۹۳؛ الطّبری، ۱: ۱۶۱۲) ۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اس کے برعکس ہم ۹ھ میں پہلی مرتبہ اس امر کا تذکرہ سنتے ہیں کہ انھوں نے مدینے میں رسمی طور پر ایک وفد روانہ کیا (ابن سعد، ۱/۲: ۶۶ تا ۶۷) ۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ زمانۂ ماقبل میں ان کے متعلق اسلام لانے کے جو تذکرے ملتے ہیں وہ مستند نہیں اور یہ کہ عُذرہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات تک بھی اسلام نہیں لائے تھے (دیکھیے Caetani: *Annali dell 'Islam*، ۲: ۵، ۲۲۹، ۴۴۴، ۱۱۲۶)۔

عذرہ نے ۱۳ھ میں عمرو بن العاص کے تحت شام کی مہم میں حصہ لیا اور عہد بنو امیّہ میں ہم انہیں اس ملک میں (دیکھیے الطّبری، ۲: ۱۷۹۲، ۱۸۱۸) نیز کوفے میں (الاغانی، ۱۶: ۷، ۳۷) آباد پاتے ہیں، لیکن ان کا کوئی امتیازی کارنامہ نظر نہیں آتا اور اگرچہ صعید مصر میں ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے (الھمدانی: جزیرۃ العرب، ص ۱۳۰، س ۴ تا ۶)، تاہم انھوں نے اس زمانے میں سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا اور یہاں یا کسی دوسرے مقام پر ان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا ہوئی جو تاریخ اسلام میں نمایاں ہو ۔

جس بات نے بنو عذرہ کو بے مثال شہرت عطا کی اور جس کی وجہ سے ان کا نام عرب دنیا کی حدود سے باہر فرانسیسی اور جرمن (Heine) رومانیت تک معروف ہے، وہ ان کا ذوق شعر اور ان کے بعض شاعروں کی درد انگیز حکایات ہیں (دیکھیے عُذری)، جنھیں کسی ہم قبیلہ عورت کے ناکام عشق نے مرض دق میں مبتلا کر کے

موت کے دروازے تک پہنچا دیا (بالخصوص عُروہ بن حزام قتیل الحُبّ جو اس قسم کے عُشاق کی نمائندگی کرتا ہے، دیکھیے ابن قُتیبہ : الشعر و الشعراء، طبع de Goeje، ص ۳۹۴ تا ۳۹۹؛ (الاغانی، ۲۰: ۱۵۲ تا ۱۵۸ و مواضع دیگر)، لیکن جیسا کہ جمیل [رک بآں] کی مثال سے ظاہر ہے جس کا بُثنہ (بثینہ) سے مشہور عشق اسے مدح و ہجا سے باز نہ رکھ سکا، عشقیہ شاعری دوسرے اصناف سخن میں شعرگوئی سے مانع نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں عشق کا رومانی تصوّر دوسرے قبائل میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عُذری شاعر کے جواب کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جس سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا تمھارا قبیلہ سارے عرب میں سب سے زیادہ رقیق القلب ہے (الاغانی، ۱: ۷۹)، جس پر اس نے یہ جواب دیا کہ ہاں ہم تھے تو ایسے ہی، لیکن بنو عامر (بنو صَعْصَعَہ) کے مجنون (قیس بن مُعاذ یا بنو المُلَوّح، (الاغانی، ۳: ۱۰۲) نے ہمیں نیچا دکھا دیا۔ عُذرہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے بھی مشہور تھے (دیکھیے الاغانی، ۷: ۵۴)۔

آدم خوری کا الزام جس کا ذکر ان ہجائیہ نظموں میں بکثرت ملتا ہے جو قبائلی شعرا ایک دوسرے کے خلاف لکھا کرتے تھے، (دیکھیے الجاحظ: کتاب البُخلاء، طبع Van Vloten، ص ۲۶ تا ۲۶۱؛ کتاب الحیوان (۱: ۱۲۹، ۳۰)، عُذرہ پر بھی عائد کیا گیا ہے؛ چنانچہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک باندی کو کھا لیا تھا (ابن الکلبی : جمہرۃ الانساب، موزۂ بریطانیہ کا قلمی نسخہ عدد ۳۳، ۲۹۷، ورق ۱۸۴ - ب)۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے بیانات کی کوئی وقعت نہیں، بجز اس کے کہ ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی خاص قبیلے کی عُسرت و افلاس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ در حقیقت ان قلیل معلومات کی روشنی میں جو ہمیں عذرہ کے بارے میں حاصل ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا جو زمانۂ ماقبل اسلام میں زیادہ تر اس خراج پر زندگی بسر کرتا تھا جو اسے نخلستانوں کے یہودی ادا کرتے تھے۔ ان نخلستانوں پر مسلمانوں کے قبضے سے ان بدویوں کے ذرائع معاش میں ضرور کمی واقع ہوگئی ہوگی۔

مآخذ : (اس مقالے میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ : (۱) Wüstenfeld : *Register, d. geneal. Tabellen*، ص ۳۴۹؛ (۲) ابن قُتیبَہ : کتاب المعارف، طبع Wüstenfeld، ص ۵۱؛ (۳) ابن الکلبی جَمْہَرۃُ الانساب، مخطوطۂ ایسکوریال، عدد ۱۶۹۸، ورق ۲۶۰ الف ۲۶۲ الف؛ (۴) النُّوَیری : نہایۃ الارب، (قاہرہ ۱۳۴۲ھ)، ۲: ۲۹۷؛ [(۵) ابن حزم : جمہرۃ النساب العرب؛ (۶) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب].

(G. Levi Della Vida)

* عُذْری : عرب کے ایک قبیلے سے نسبت، بنو عُذرہ [رک عُذرہ، بنو] کا جدّی نام۔ بنو عذرہ حجاز کا ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا اور غالباً قحطان کی نسل سے تھا (دیکھیے الاغانی، بار دوم، ۷: ۷۲ تا ۷۳)، جو جُہینہ میں ضم ہوگیا تھا۔ اس کے باقی ماندہ افراد آج بھی ینبوع (حجاز) کے قریب اور سوڈان میں پائے جاتے ہیں۔

حُبّ عُذری : اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں یہ ایک ادبی اور فکری موضوع ہے جو یونانیوں کے فلسفۂ ''پاک محبت'' سے ماخوذ ہے۔ اس فکر کا منبع و سرچشمہ ازمنۂ وسطیٰ کے مغربی عیسائیوں کے وہ افکار ہیں جو خفیہ اور پاک محبت (عشق حقیقی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس فکر کی تخلیق کا سہرا غالباً جُند کوفہ یعنی آباد کاروں کے سر ہے۔ اس کی یاد ایک مثالی

بدوی قبیلے سے وابستہ ہے، جس کے عشاق عشق و محبت اور عصمت و عفت کے نازک ترین جذبات کو اوج کمال پر پہنچاتے ہوے نامرادی کی موت مر جاتے ہیں ۔ بنو عذرہ کے لیے مثالی عاشق جمیل ہے، جو اس طرح بثینہ کی محبت میں گھل گھل کر جان دے دیتا ہے ۔

اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ ''جس نے محبت کی، لیکن پاکدامن رہا اور اپنا راز کسی سے بیان نہ کیا اور اسی حال میں وہ مر گیا تو اس کی موت شہید کی موت ہوگی''

الاصمعی کے ہاں یہ موضوع موجود نہیں (ابن قتیبہ : التأویل، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲) ۔ ابن داؤد الاصفہانی (م ۲۹۷ھ/۹۱۰ء) ایک ''ظاہری'' فقیہ تھا ۔ اس نے اس فکر و نظر کو اپنی نفیس کتاب، کتاب الزہرۃ میں خوب پروان چڑھایا ہے ۔ اس کی پیروی کرتے ہوے دیگر ''ظاہری'' فقہا نے پاک محبت کے گن گائے ہیں، جن میں ممتاز ترین ابن حزم تھا ۔ اس کے بعد اسی موضوع پر ابن العربی نے ترجمان الاشواق اور اس کی شرح الذخائر لکھی ۔ Asin Palacios نے اس کا موازنہ Dante کی Vita Nova اور Convito سے کیا ہے ۔

اس کا ذکر السراج کی مصارع العشاق، ابن ابی حجلہ کے دیوان الصبابۃ اور الانطاکی کی تزئین الاسواق جیسی مستند کلاسیکی تالیفات میں بھی ہے ۔ ابو حمزہ البغدادی (م ۲۶۹ھ/۸۸۲ء) نے اس فکر و نظر کو تصوف کا موضوع بنا دیا اور اسے ان اشغال کا ذریعہ بنایا جو رہبانیت کے مآثر نظر آتے ہیں ۔ احمد الغزالی اور عین القضاۃ الہمذانی نے بھی عشقِ حقیقی کی بنا پر ابلیس پر لعنت کی ہے ۔

بہت سے شعرا نے، جو بباطن عشقِ مجازی کے علم بردار تھے، عشق حقیقی کے گن گائے ہیں ۔ عربی میں الصفدی، فارسی میں حافظ (غزل) اور ہلالی (شاہ و گدا)، ترکی میں مسیحی (شہر انگیز) نے اور ان کے علاوہ اردو اور جَوَنی کے شعرا نے اس فکر و نظر کی ترجمانی کی ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن داؤد الاصفہانی الظاہری کتاب الزہرہ، مخطوطۂ قاہرہ، ۳۶۰ھ، تجزیہ در، Massignon: *Hallaj*؛ ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۰ تا ۱۷۹؛ (۲) اقتباسات در، ابن فضل اللہ : مسالک اور Textes inedits Massignon؛ (۳) ابوالفرج الاصفہانی : کتاب الاغانی، اشاریہ بذیل مادہ Stendhal نے اس کا حوالہ *De l' Amour*، طبع C. Levy، ص ۱۷۷ تا ۱۸۲ میں دیا ہے؛ (۴) ابن حزم : طوق الحمامۃ، طبع D Petraf لائیڈن، ۱۹۱۴ء؛ (۵) السراج: مصارع العشاق، طبع Stamboul، ۱۳۰۱ھ؛ (۶) ابن الجوزی : حُبّ یوسفی مخطوطۂ پیرس، عدد ۱۲۹۶ وغیرہ؛ (۷) ابن عربی: ترجمان الاشواق، مترجمۂ نکلسن، لنڈن ۱۹۱۱ء (O.T.E.، ج ۲۰)؛ (۸) ابن ابی حجلۃ : دیوان الصبابۃ، قاہرہ ۱۹۲۱ء؛ (۹) عبدالکریم الجیلی، انسان کامل، قاہرہ ۱۳۰۴ھ، ۱ : ۵۳؛ (۱۰) عبدالغنی النابلسی : غایۃ المطلوب (المعروف بہ مخرج المتقی) مقالہ نگار کے پاس اس کا مخطوطہ ہے؛ (۱۱) Massignon : *Hallaj*، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۷ تا ۱۸۲، ۶۹۱، ۷۹۶ تا ۷۹۹؛ (۱۲) وہی مصنف : *Essai*، ۱۹۲۲ء، ص ۸۷ تا ۸۸؛ (۱۳) وہی مصنف : *Introspection et retrospection* در *Oostersch Genootschap in Nederland*، ۲۲ تا ۲۵، ۱۹۲۵ء؛ (۱۴) Asin placios : *La escatologia musulmana en la divina comedia*، میڈرڈ ۱۹۱۹ء، ص ۳۳۹ تا ۳۴۹ (دیکھیے تبصرہ از Massignon در، *RMM* ۱۹۱۹ء، ج ۳۲، ص ۲۷ تا ۶۲ ۔

(LOUIS MASSIGNON)

عرابی پاشا : احمد عرابی المصری * (۱۸۳۹؟ - ۱۹۱۱)، انقلاب مصر کا ایک

قائد، اگرچہ اس نے ان تمام حوادث میں جو مصر میں انگریزی اختلال کی وجہ سے رونما ہوے، بہت نمایاں حصہ لیا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح قیادت اور رہنمائی کرنے کے بجاے وہ خود حوادث کی رو میں بہ جاتا تھا، کیونکہ اس کی اخلاقی اور ذہنی قوتیں کمزور تھیں - بایں ہمہ اس کی سیاسی زندگی، ان حوادث کی اہمیت جن سے اسے واسطہ پڑا، اور اس کے نام کا ان سے منسلک ہونا، یہ تمام باتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اس کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے -

احمد عرابی ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں زیریں علاقۂ مصر (ریف) میں مقامی کاشتکاروں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا - سعید پاشا خدیو مصر کے عہد میں فوجی خدمات انجام دیں تو درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوے ۱۸۶۲ء میں فوج کا ایک افسر بن گیا - ۱۸۷۵ء میں اسمٰعیل پاشا نے حبش پر حملے کا آغاز کیا - اس مہم میں احمد عرابی کو شعبۂ نقل و حرکت کا انتظام تفویض ہوا، لیکن بددیانتی کے شبہے میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا - اس موقع پر وہ ایک خفیہ انجمن میں جس کا قائد ومنتظم علی رُوبی تھا، شامل ہو گیا - اس انجمن کا مقصد ترکی اور سرکیشیا کے بڑے بڑے عہدے داروں کی مخالفت کرنا تھا - اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے جامعۂ ازہر میں تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا - جس سے اس کی فطری صلاحیتوں اور پیدائشی قوت خطابت کو بہت تقویت پہنچی اور وہ ایک زبردست اور نامور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوا اس کی خطابت سے لوگ متأثر ہونے لگے .

یہ وہ وقت تھا جب کہ قومیت کے جذبات جو خدیو محمد علی کے عہد ہی میں متوسطہ طبقے کے مقامی لوگوں میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، بھڑک اٹھے، وجہ یہ تھی کہ لوگ خدیو اسمٰعیل کے عائد کردہ بھاری محصولوں سے عاجز آچکے تھے غربا کو تو انھوں نے پیس کر رکھ دیا تھا، دوسری طرف ملک کے امور مالیہ کا انصرام انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں پہلی مرتبہ ملک کے محبّ وطن اخبارات نے ''مصر مصریوں کے لیے'' کا نعرہ بلند کیا اور حکومت اور حکومت کے افعال پر کڑی نکتہ چینی شروع کر دی - احمد العرابی کو المصری کا خطاب اسی زمانے میں دیا گیا - وہ تمام فوجی افسر جن کے مشاہرے اقتصادی تدبیر کے ماتحت نصف کر دیے گئے تھے، ''جمیعتِ ضابطان'' (ضابطان جمیعتی) میں شامل ہو گئے - اور یہی جمیعت قومی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے پہلا قدم بن گئی - وزرا کی کونسل نے (جس میں انگریز Rivero Wilsen (مالیات) اور فرانسیسی De Bligneres (رفاہ عامّہ) شامل تھے اور جس کا صدر نوبار پاشا تھا، خارجی ممالک کے دباؤ میں آ کر فیصلہ کر دیا کہ جن مظاہروں کا فروری ۱۸۷۹ء میں قلع قمع کیا گیا تھا، ان سب کا سرغنہ احمد عرابی تھا - مگر بعد میں یہ حقیقت بےنقاب ہوگئی کہ ان تمام حوادث میں عرابی پاشا کو اسمٰعیل پاشا نے جو مغربی اقتدار سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا، اپنا آلۂ کار بنایا تھا؛ دراصل واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ مظاہروں کی کامیابی پر اسے قصر خدیوی کی طرف سے ایک غلام عطا ہوا تھا، نیز ترقی دے کر اسے ایک رجمنٹ کا کمانڈر بنا دیا گیا تھا .

انگریزوں اور فرانسیسیوں نے جب بالتصریح

اسمٰعیل پاشا کی علٰحدگی پر اصرار کیا، تو [سلطان ترکی] عبدالحمید ثانی نے اس کے بیٹے توفیق پاشا کی جگہ اس کے چچا محمّد علی کے سب سے چھوٹے فرزند حلیم پاشا کو خدیو مصر مقرر کر دیا - عبدالحمید کا مقصد یہ تھا کہ اسمٰعیل پاشا نے جو حد سے زیادہ رعایتیں سلطان عبدالعزیز سے حاصل کر لی تھیں، انھیں واپس لے لے - جب وزرا کی کونسل نے اس مسئلے پر غور کیا تو ان کی اپنی مجلس منعقدہ ۶ رجب ۱۲۹۶ھ کے منضبط وقائع میں لکھا گیا کہ ''اگرچہ ۱۲۵۷ھ کے فرمان کے مطابق حلیم پاشا نرینہ اولاد میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے، تاہم ریاستوں اور خود مصریوں کا رجحان توفیق پاشا کی طرف ہے اور ہمارا اصل مقصد قانون سلطنت کا تحفظ ہے''. . . . چنانچہ اسی دن توفیق پاشا کو وزیر اعظم سے خدیو بنا دیا گیا، اور خدیو سابق کو اس تقرر کی اطلاع دینے کے لیے دو تار بھیج دیے گئے (۲۶ جون ۱۸۷۹ء) - لیکن عبدالحمید ثانی نے حلیم پاشا کے منصب خدیوی پر تقرر سے متعلق اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور ان تمام مجالس میں، جو اس کے بہت جلد بعد منعقد ہوئیں، اس نے عرابی کو اس کام کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا .

جب سلطنت کے اخراجات گھٹانے کی مزید ضرورت محسوس ہوئی تو افسروں کے ایک اور گروہ کو معطّل کر دیا گیا جس سے فوج کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا، اور رجمنٹ نمبر ۴ کے افسر عرابی، رجمنٹ نمبر اول کے افسر علی اور ایک اور کرنیل نے وزرا کی کونسل میں افسران فوج کی ترقیوں کے بارے میں اس مسودۂ قانون کے خلاف جسے وزیر جنگ (عثمان رفقی پاشا جو سرکیشیا کا رہنے والا تھا) تیّار کر رہا تھا ایک احتجاجی عرضداشت پیش کی - ان کا یہ فعل فوجی قانون کے خلاف قرار دیا گیا اور انھیں ریاض پاشا نے کورٹ مارشل کرنے کے لیے فوراً زیر حراست کر لیا، لیکن وہ اپنی رجمنٹوں کی مداخلت کی وجہ سے بچ گئے - عرابی نے فوراً باغی دستوں کی کمان سنبھال لی، قصر عابدین پر ہلہ بول دیا اور وزیر جنگ کی معزولی کا مطالبہ کیا - توفیق پاشا مجبور ہو گیا کہ محمود سمیع پاشا البارودی کو جو پس پردہ قوم پرستوں کی تحریک چلانے والوں میں سے تھا وزارت حربیہ پر مامور کرے - لیکن چند ہی ماہ بعد اس نے وزیر اعظم ترکی ریاض پاشا کے ساتھ مل کر اپنا وار کیا، یعنی محمود سمیع پاشا کو برطرف کر کے اس کی جگہ اپنے ایک رشتے دار داؤد فتحمی پاشا کو وزیر حرب مقرر کر دیا اور ساتھ ہی چند رجمنٹوں کو قاہرہ سے باہر بھیج دینے کی کوشش کی - اس پر محب وطن گروہ نے (۹ ستمبر ۱۸۸۱ء کو) قصر عابدین کے سامنے ایک عظیم مظاہرہ کیا .

خدیو کو اس کی اطلاع قبل از وقت مل چکی تھی اور اگرچہ وہ انگریز اور فرانسیسی قونصلوں کے ایما پر ''باب عالی'' میں ایک عرضداشت بذریعۂ تار اس مضمون کی بھیج چکا تھا کہ مظاہرے کے دن بیس بٹالین فوج بھیج دی جائے، تاہم اس نے باغیوں کے آگے ہتیار ڈال دیے، شریف پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تاکہ وہ نُوّاب (deputies) کی اسمبلی قائم کرے اور آئینی حکومت بنانے کی طرح ڈالے؛ اسی دن اس نے باب عالی کو تار بھیجا کہ اب فوج بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور ساتھ ہی اپنے چچا حلیم پاشا کی سازشوں کی شکایت بھی کر دی .

اس معاہدے کے پیش نظر عرابی اور اس کے دوستوں نے اپنی اپنی رجمنٹوں کے ساتھ قاہرہ کو چھوڑ دیا؛ لیکن قاہرہ کو چھوڑتے وقت عرابی نے ایک زبردست شعلہ بار تقریر کی ۔ اصل اقتدار ہنوز عہدے داروں کی مجلس کے ہاتھ میں تھا، لہٰذا ۱۸۸۲ء کے آغاز میں مجلس وزرا نے اس امید پر کہ اپنے اقتدار کو کسی طرح بحال رکھے، عرابی کو وزارت جنگ کا رکن مقرر کر دیا ۔ اس سے دس روز قبل (۲۶ دسمبر ۱۸۸۱ء) ''دارالنُّوّاب'' کا افتتاح عمل میں آ چکا تھا، لیکن بیرونی مقتدرین اس اطمینان دہانی کے باوجود کہ ان کی مالی داد و ستد میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے گی اسمبلی کو بجٹ پر بحث کی اجازت دینے پر رضامند نہ ہوے ۔ اس سے وطن پرستوں میں بڑا غیظ و غضب پیدا ہوا، اور شریف حسین کی کابینہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ محمود سمیع پاشا کی کابینہ قائم ہوگئی ۔ ۴ فروری ۱۸۸۲ء کو بریگیڈیر (صاحب اللواء) کا مرتبہ حاصل کر کے 'عرابی' وزیر حرب ہو گیا ۔ خدیو نے مصری وکیل متعیّنہ باب عالی کے توسط سے ایک بار پھر 'باب عالی' سے درخواست کی کہ ''حالات کی شدت اس نقطے سے گزر چکی ہے جہاں فقط پند و نصائح سے کام نکل سکتا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس فتنے کو زبردست قوت سے دبا دیا جائے'' چنانچہ اس نے فوج بھیجنے کی ایک بار پھر درخواست کی؛ لیکن سلطان کے دل میں ایسا قدم اٹھانے کے بارے میں کچھ خدشات و وساوس تھے اور اس بات میں وزرا کی کونسل نے بھی اس سے اتفاق کیا اور اعلان کیا کہ حالات افواج کے بھیجنے کے لیے سازگار نہیں''۔ اس اثنا میں سمیع اور عرابی فوج کو از سر نو مرتّب و منظم کر چکے اور تقویت دے چکے تھے اور انھوں نے اپنے طرفداروں میں سے ۶۰۰ افسروں کو ترقی بھی دے دی تھی جن میں ۵ بریگیڈیئر، ۲۹ کرنل اور قائمقام تھے ۔ انھوں نے ترکی اور چرکسی افسروں کو سوڈان کی مہم پر مہدی سوڈان کے استیصال کے لیے بھیجنا چاہا جس نے اس وقت مصری حکومت کو ستانا شروع کر دیا تھا، اس کے تھوڑے دن بعد ان افسروں میں سے ۴۰ افسروں کے ایک جتھے کو جن میں سابق وزیر عثمان رفقی بھی شامل تھا زیر حراست کر لیا گیا ۔ اور اس عذر لنگ پر ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا کہ انھوں نے عرابی پاشا کو قتل کرنے کی سازش کی ہے (۱۱ اپریل) ۔

ایک خفیہ اجلاس میں فوجی عدالت نے انھیں مجرم ٹھہرایا اور جُرم کی پاداش میں ان سے ان کے منصب اور تمغے سلب کر لیے اور حکم دیا کہ وہ سوڈان کی طرف جلا وطن کر دیے جائیں ۔ ملزموں کی درخواست پر ''باب عالی'' نے اس معاملے میں مداخلت کی، جس کی وجہ سے خدیو نے فوجی عدالت کے فیصلے میں یہ ترمیم کر دی کہ ان کے منصب اور تمغے بحال رکھے جائیں لیکن انھیں ملک بدرْ کر دیا جائے ۔ اس پر وزرا کی کونسل نے خدیو سے قطع تعلّق کر لیا، اسمبلی کے نوّاب کا اجلاس طلب کیا اور توفیق پاشا کو تخت سے معزول کرنے کی کوشش کی ۔ قونصلوں نے اراکین حکومت سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تو استانبول نے موقع کو غنیمت جان کر محمود سمیع کی کابینہ سے براہ راست تعلقات قائم کرنا مناسب سمجھا ۔ اس وقت محمود سمیع اور عرابی نے چاہا کہ توفیق پاشا کو خدیو کے منصب سے معزول کر کے اس کی جگہ حلیم پاشا کو مسند خدیوی پر بٹھا دیا جائے، لیکن وزراء کی کونسل نے اس بہانے

کی آڑ میں کہ ''محبّان وطن'' اپنی اغراض (منویات لر) کے لیے حلیم پاشا کو آلۂ کار بنائیں گے، توفیق پاشا ھی کو مسند حکومت پر بحال رکھنے کا فیصلہ کیا (۱۴ رجب ۱۲۹۹ھ/ ۲۰ مئی ۱۸۹۸ء) - اس پر وزیر اعظم (ترکی) نے بذریعۂ تار وزیر اعلیٰ مصر کو حکم دیا کہ خدیو کی اطاعت کرے اور اس نے از سر نو توفیق پاشا سے روابط استوار کر لیے - اس موقع پر انگلستان اور فرانس نے خدیو کی حیثیت کو مضبوط کرنے کی غرض سے ۲۰ مئی کو اسکندریہ میں بحری جہازوں کا ایک بیڑا بھیج دیا اور قونصلوں کے توسط سے مطالبہ کیا کہ عرابی پاشا، فہمی پاشا اور اسی قسم کے دوسرے محب وطن راہنماؤں کو قاھرہ سے جلا وطن کیا جائے اور شریف پاشا کی زیر سرکردگی وزرا کی جدید کونسل مرتب کی جائے - اس پر سمیع پاشا مستعفی ھو گئے، لیکن سکندریہ اور قاھرہ کے افسروں کی دھمکیوں اور علما اور اکابر کے اس مطالبے سے دب کر کہ عرابی پاشا کو بحال کیا جائے خدیو شریف پاشا کی کابینہ کو نامزد نہ کر سکا اور اس نے استانبول سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا - ابھی کمیشن کی آمد کا انتظار ھی تھا کہ اس نے ۲۹ مئی کو عرابی کو وزارت جنگ پر بحال کر دیا (جو بظاھر اس وقت حکومت کا واحد نمائندہ تھا - عرابی نے فی الفور دول خارجہ کی مداخلت کا امکان دیکھ کر اسکندریہ کے دفاع کے لیے توپیں نصب کر دیں - یہ عذر کر کے کہ بندرگاہ میں متعین بحری بیڑے کو خطرہ ھے، انگریزی امیرالبحر سر بوشامپ سیمور Sir Beauchamp Seymore نے صدائے احتجاج بلند کی اور آناً فاناً میں ملک اشتعال و اضطراب کا اکھاڑا بن گیا - ۱۱ جون کو سکندریہ میں ایک ڈانڈی چلانے والے اور مالٹا کے ایک باشندے کے درمیان جھگڑا ھو گیا، جو دیکھتے ھی دیکھتے عربوں اور مالٹا کے یونانیوں کے مابین ایک عام لڑائی کی صورت اختیار کر گیا - اس میں ۵۷ یونانی اور ۱۴۰ عرب مارے گئے، لیکن بالآخر اسے مخلوط سپاھیوں کے ایک دستے نے ختم کر دیا اور بحری بیڑے کو اس میں مداخلت کی ضرورت نہیں پڑی - جنرل درویش پاشا کے زیر قیادت تحقیقاتی کمیٹی کے فیصلے پر رجب پاشا کی (جو محمد علی کے عہد کی یادگار تھا)، زیر نگرانی ایک کابینہ کی تاسیس اس غرض سے عمل میں آئی کہ حکومت کے تمام اختیارات عرابی پاشا ھی کے ھاتھ میں نہ رھنے پائیں؛ تاھم عرابی پاشا وزیر حرب ھی رہا اور سلطان نے اسے مجیدی تمغہ (درجۂ اوّل) عطا کیا .

استانبول سے مرسلہ احکام کی بنا پر اسکندریہ کی فصیلوں پر توپوں کا چڑھانا تو روکا جا چکا تھا؛ تاھم جولائی میں انگریزی امیرالبحر نے یہ احتجاج کیا کہ استحکامات کا سلسلہ جاری ھے - دس جولائی کو اس نے باقاعدہ ''الٹی میٹم'' دے دیا کہ (فوج کے) بعض حصے اس کی تحویل میں دے دیے جائیں تاکہ وہ ان سے ھتیار رکھوالے - کابینہ (جس میں درویش پاشا موجود تھے) کا جاسہ ھوا اور اس نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا - اس پر انگریزی بیڑے نے شہر کے استحکامات پر گولہ باری شروع کر دی (فرانسیسی اس عمل میں شریک نہیں ھوے، وہ ایک دن بیشتر ھی اسکندریہ کو چھوڑ چکے تھے)- ۱۳ جولائی کو استحکامات پر سفید جھنڈا لہرا دیا گیا .

پہلے تو عرابی (پاشا) نے خدیو کے محل کو

جو اس وقت موسم گرما کی وجہ سے اسکندریہ میں تھا محصور کر لینے کی ٹھانی، مگر بعد میں اس خیال کو ترک کر دیا اور اپنے سپاہیوں کو شہر سے واپس بلا لیا۔

عرابی کے ایک معاون سلیمان سمیع نے شہر اسکندریہ کو آگ لگا دینے کی کوشش کی (جیسے روسیوں نے ماسکو کو اس وقت جلا دیا تھا جب نپولین شہر کی دیواروں کے نیچے پہنچ چکا تھا)۔ اس پر زبردست لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا بازار گرم ہوا۔ ۱۵ (جولائی) کو انگریزوں نے اپنی فوجیں ساحل پر اتار دیں اور شہر پر قبضہ کر لیا۔

۱۴ جولائی کو وزرا کی کونسل باب عالی میں جمع ہوئی اور اس کے ارکان نے مسئلۂ زیر بحث پر سلطان کی بارگاہ میں احتجاج کرتے ہوئے طے کیا کہ مسئلۂ مذکور کو پر امن طریق سے حل کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا عام رجحان یہ تھا کہ مصر میں فوجیں بھیج دی جائیں۔ ۱۵ جولائی کو سفرا متعینۂ باب عالی نے بھی بالکل اسی قسم کے نوٹ بھیج کر مصر میں افواج بھیجنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن عبدالحمید ثانی نے اس میں تامل کیا اور انگریزی سفیر کی ان شرائط کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوا جن کی رو سے عرابی پاشا کو باغی قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بالآخر ۵ ستمبر کو باب عالی اور انگریزی سفیر متعینہ باب عالی میں مصر میں افواج بھیجنے کی بابت معاہدہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور اگلے ہی دن عرابی پاشا باغی قرار دے دیا گیا، لیکن سلطان نے اس معاہدے کی توثیق کبھی نہیں کی۔

اس پر مصر میں مقیم انگریزوں نے خدیو کی افواج پر دباؤ ڈال کر عرابی پاشا کو وزارت حرب سے معزول کرا دیا اور ۹ اگست کو اسے باغی قرار دے دیا گیا۔ مزید براں نہری علاقے میں اپنی افواج کے اتار لینے کی اجازت مل جانے پر، عرابی پاشا ۲ اگست کو اپنے آپ کو سلطان کا نمائندہ ہونے کا اعلان کر چکا تھا اور خدیو پر غدّاری کا الزام لگا چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی فوجوں کو تل الکبیر میں جمع کیا، لیکن چند ہی گھنٹوں کے اندر ان انگریزی افواج نے جو نہر کی راہ سے مصر پر چڑھائی کر رہی تھیں، اس کی فوجوں کا قلع قمع کر دیا اور اس کے دو دن بعد جب انگریزی افواج شہر میں داخل ہو گئیں تو عرابی پاشا نے ان کے سامنے ہتیار ڈال دیے۔

عرابی اور اس کے رفقا کے لیے فوجی عدالت نے موت کی سزا کا حکم صادر کیا، لیکن عین اس وقت انگریزی سفیر لارڈ ڈفرن استانبول سے قاہرہ پہنچ گیا اور اس کے توسط سے خدیو نے ان لوگوں کی سزاؤں کو جلا وطنی میں بدل دیا۔ اس پر وزیر اعظم ریاض پاشا نے بطور احتجاج استعفا دے دیا۔ بعض ایسے لوگوں کی رائے کے مطابق جو حالات کو غور سے دیکھتے رہے تھے عرابی پاشا نے بالکل مایوس ہو کر انگریزوں سے خفیہ روابط قائم کر لیے تھے اور تل الکبیر میں ورود ایک مقرر سازش کی بنا پر تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں نے اس کی سزا کو جلاوطنی میں تبدیل کرا دینے کا انتظام کر دیا اور عرابی کو جزیرۂ لنکا میں سکونت کے لیے بھیج دیا۔ ۱۹۰۱ء میں خدیو عباس حلمی نے عرابی کو معافی دے دی اور وہ مصر واپس چلا گیا۔ اس نے ۱۹۱۱ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) رؤف احمد: ''مصر مسئلہ سی'' (کاغذات جو آخری عالمگیر جنگ میں صلح کی تیاری

میں مرتب کیے گئے)، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۵۰، (حاشیہ ۴۹)، ۶۱ تا ۷۹، ۸۲؛ (۲) کامل پاشا : خاطرات، استانبول ۱۳۲۹ھ، ص ۱۰ ببعد؛ (۳) سعید پاشا : خاطرات، استانبول، ۱۳۲۸ھ، ۱ : ۷۲ تا ۸۳؛ (۴) ابن سبری : *La Genese de l'esprit National Egyptien*، ۱۸۶۳ء، ۱۸۸۲ء، پیرس ۱۹۲۴ء؛ (۵) Cromer : *Modern Egypt*، ۱:۱۷۴ ببعد؛ (۶) W. van Gruneau: *Agyptens*، ص ۱۳۳، ببعد؛ (۷) *Van Bemmelen*، *L'Egypte et l'Europe*؛ (۸) W. Blant: *Secret History of the British Occupation of Egypt*؛ (۹) A. Milner: *England in Egypt*؛ (۱۰) سالم خلیل المکّی : مصر للمصریین (اسکندریہ ۱۸۸۴ء)، ج ۴ تا ۹؛ (۱۱) C. F. Moberley Bell : *Khedives and Pashas*.

(RAUF AHMAD HOTINLI)

* **العراق** : جسے العراق العجمی کے مقابلے میں العراق العربی بھی کہتے ہیں، پہلے زمانے میں ''العراقان'' یا العراقیْن سے اس ملک کے دو قدیم ترین اسلامی شہر کوفہ اور بصرہ مراد لیے جاتے تھے (یاقوت؛ ۳: ۶۸۲، س ۱۱ ببعد)۔ بعد میں اس نام کا اطلاق العراق اور الجبال [رک بآں] دونوں پر ہونے لگا۔ یاقوت (۳ : ۱۵، س ۱۸) کو صرف یہی معلوم تھا کہ ایرانی بالعموم الجبال کو العراق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس نے یہ لکھ کر کی ہے کہ جو سلجوق فرمانروا عراق پر حکومت کرتا تھا اس نے الجبال بھی فتح کرلیا تھا اور چونکہ وہ ہمذان میں رہتا تھا اس لیے لوگوں نے اس کے لقب ''الملک العراق'' کا اشارہ اس صُوبے کی طرف سمجھا جس کا یہ صدر مقام تھا، حالانکہ حقیقت کچھ اس طرح تھی کہ اس سلجوقی حکمران ''ملک العراقین'' [دونوں عراقوں کا بادشاہ] کا لقب اختیار کر رکھا تھا (جس میں روایتی مبالغے سے کام لیا گیا تھا) اور لوگوں نے اس سلطنت کے مشرقی حصے کو بھی عراق کہنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ العراق العجمی اور العراق العربی کو بھی ایک دوسرے سے ممیّز کرنے لگے۔

اس نام کے معنی وثوق سے نہیں بتائے جاسکتے؛ عربوں کے حسب ذیل مفروضات قابلِ اطمینان نہیں : عراق = ''نشیبی علاقہ''، از روے ابن العرابی در یاقوت : ۳: ۶۲۸، س ۱۳ ببعد، اور ''ساحلی علاقہ''، از روے الخلیل، در یاقوت ۳: ۶۲۸، س ۲۱ ببعد۔ اس کے ساتھ ہی عراق کو السّواد (سیاہ ملک) بھی کہتے ہیں، یعنی گھاس کے میدانوں کی شوخ سفیدی مائل زرد رنگ کی مٹی کے مقابلے میں اس ملک کی زمین کا رنگ کاشت ہونے کی وجہ سے سیاہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان فرق بدویوں کے رکھے ہوے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے جو رنگ کے معاملے میں بیحد زود حس تھے، لیکن یہ دونوں نام مترادف نہیں۔ سواد ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا محلِّ اطلاق تبدیل ہوسکتا ہے اور عراق کے لفظ کا استعمال کسی متعیّن محل پر ہوتا ہے۔ ہم سواد کوفہ کہ سکتے ہیں لیکن عراقِ کوفہ نہیں کہ سکتے۔ البلخی کا بیان (الاصطخری، ص ۸۵، س ۳؛ ابن حوقل، ص ۱۶۶، س ۱ ببعد) اس سلسلے میں مثالی حیثیت رکھتا ہے : ''بغداد اور کوفے کے درمیان ایک سواد ہے جس میں (کاشت کیے ہوے کھیتوں کا) ایک جال بچھا ہوا ہے اور اس میں کوئی خلا نظر نہیں آتا''۔ یہ بیان ایک صحیح اور عام تصوّر پر مبنی ہے۔ یہ عراق میں ایک طویل مگر کم عریض، نہایت قیمتی اور زرخیز قطعۂ زمین پر مشتمل ہے جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے اور اگر کوئی شخص انہار کا نظام بیان کرنا چاہے تو اس مسلسل ثمر دار باغ

کو بنیاد ماننا پڑے گا - ابن خرّد اذبہ کے ہاں عراق کے اس نام کا بھی نشان ملتا ہے جس سے وہ ایرانی بادشاہوں کے عہد میں مشہور تھا، یعنی ''دل ایران شہر''، اس کا ترجمہ اس نے ''عراق کا دل'' کیا ہے (ص ۵، س ۱۸ ببعد : قب ابن رُستہ؛ ص ۱۰۴، س ۴) - اس سے اس امر کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ الخوارزمی ایران شہر سے ایران بشمولیت عراق مراد لیتا تھا اور یزید الفارسی کے بیان کے مطابق پورے ایران شہر کو ایک جسم سے تشبیہ دی جاتی تھی جس کا دل عراق تھا؛ اسی طرح الاصمعی بھی (بقول یاقوت : ۱:۱۷۴) - عراق کا پہلا ایرانی نام سورستان تھا (البلاذری، ص ۲۷۶، س ۵؛ ابن رُستہ، ص ۱۰۳، س ۲۳ ببعد؛ المسعودی، ص ۱۷۷، س ۱؛ الطبری، ۱:۸۱۹، س ۸؛ قب Nöldeke ص ۱۵، حاشیہ ۳) .

ملک کی حسب ذیل جغرافیائی اور تاریخی تفصیلات کا یہاں ذکر کر دینا چاہیے : عراق ایک ہموار میدانی ملک ہے جو مغرب میں دشت شام سے، جنوب میں عرب کے لق و دق میدانوں اور صحرائی علاقوں نیز خلیج ایران کے شمالی ساحل سے، مشرق میں جبل حمرین (Zagros) کی جنوبی شاخوں اور مغربی خوزستان سے، اور شمال میں الانبار سے تکریت تک کھینچے ہوے خط سے گھرا ہوا ہے - یہ شمالی سرحد اس بلند سطح زمین کے علاقے کو ظاہر کرتی ہے جہاں قدیم ترین زمانے میں خشک زمین ختم ہو جاتی تھی - اس کے جنوب میں رفتہ رفتہ سیلابی زمین بنتی چلی گئی جہاں پانی کی افراط اور اس کی آسان تقسیم کے باعث منفعت بخش کاشتکاری کے نہایت ہی عمدہ وسائل پیدا ہوگئے؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی انتظامی سرحد اس قدرتی سرحد سے مختلف تھی اور عموماً شمالی سرحد اس خط سے ظاہر کی جاتی ہے جو تکریت سے الحدیثہ تک کھینچا جاتا ہے - الحدیثہ بھی جو ہیت سے تقریباً ۶۰ میل شمال مغرب میں واقع ہے العراق ہی میں شامل تھا - جغرافیائی نقطۂ نظر سے خوزستان (سوسیانہ : Susiana) بھی جو عراق کی مشرقی سرحد سے ملتا ہے اسی کا ایک حصّہ ہے، کیونکہ کوئی طبعی حد بندی اسے عراق سے جدا نہیں کرتی - یہی حال طَفّ کا ہے، یعنی وہ بلند سطح زمین جو بصورت دشت کوفے اور بصرے کے دروازوں کے سامنے سے شروع ہوتی ہے - اس علاقے میں جہاں زمین دریاؤں کی وادیوں کی سطح سے بلند تر ہو کر ایسا بند سا بنا لیتی ہے جو دریاؤں کی طغیانی کے سیلاب سے بچا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی رہگزر کا کام بھی دیتا ہے، اسے عرب جغرافیہ دانوں نے ظَہْر یعنی ''ماہی پشت'' کا نام دیا ہے اور راستوں کے بیان میں دریائی راستوں کے ساتھ ساتھ ان کا بھی ذکر کیا ہے - اگر ہم شط العرب کے ڈیلٹا کے تمام بازوؤں، ان بڑے دریاؤں، ان کے معاونوں اور ان کی نہروں کے کناروں کو بحیثیت مجموعی پیش نظر رکھیں تو سارے ملک کی نسبت سے ساحل کی وسعت غیر معمولی طور پر بڑی نظر آتی ہے - سمندر بھی دریاؤں سے مل کر ایک نظام بناتا ہے - ترقی کے امکانات غیر محدود نظر آتے ہیں - صرف دریاؤں کو قابو میں رکھنے کے لیے پیہم توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ سیلاب کی صورت میں ان کے کنارے بہ نہ جائیں کیونکہ اس صورت میں اقتصادی ترقی ناممکن ہو جائے گی - کنارے ٹوٹ جانے کے باعث بڑی بڑی دلدلیں بن گئی ہیں - جب نہروں کے ذریعے آب پاشی نہیں ہوتی تو دریاؤں کے بیچ کی زمین ایک کف دست

میدان کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ اس ملک کے بہترین زمانے میں بھی اس پر قرار واقعی دھیان نہیں دیا گیا ۔ آج کل عراق کا تقریباً ¼ حصّہ زیر کاشت ہے (بڑا ذریعۂ معاش زراعت اور باقاعدہ مویشی پالنا ہے) ۔ [عراق کا مجموعی رقبہ ۱,۶۹,۲۴۰ مربع میل ہے ، اس میں سے کم و بیش پچیس ہزار مربع میل زیر کاشت ہے] ۔ میں یہاں Deutsch Willcoks (کی پیروی کرتے ہوئے) اس کا تخمینہ شامل کرتا ہوں، (*Mag. f. Technik und Industriepol.*، شمارہ ۴، ۷، ج ۱۰، ۱۹۱۳ء): بابلیّہ (Babylonia) کا رقبہ ۲۱۵۰۰ مربع میل اور آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے ۔ اس میں ۱۶۹۰ مربع میل کا رقبہ بغداد کے شمال، جنوب اور مغرب میں واقع ہے ۔ Tholenz (*Zeitschr. d. Ges. f. Erd.kunde Berlin*، ۱۹۱۳ء ص ۳۲۹ ببعد)، کا اندازہ ہے کہ نہری آب پاشی کے عظیم الشان منصوبے کے تحت ۵۱۹۰ مربع میل رقبہ زیر کاشت آیا تھا (اس کے منصوبے پر ۲,۶۵,۰۰,۰۰۰ پاؤنڈ لاگت آئی اور ۳۰ سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچا)۔ Tholenz کا بیان ہے کہ پورے ملک کو زیر کاشت لانے کے لیے ایک بڑی شرط تو یہ ہے کہ دریائے دجلہ کی تہ صاف کی جائے اور دوسرے وہ گزر آب یا کاریز دوبارہ جاری کی جائے جس کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ عربوں کے زمانے میں دریا کی سب سے بڑی گزر گاہ تھی، یعنی جسے آج کل شطّ الحیّ کہتے ہیں ۔ اگرچہ قُوت العمارۃ (جغرافیہ دانوں کے نزدیک مَاذرایا) پر یہ طاس دریا کی موجودہ گزر گاہ سے جدا ہو کر الگ شاخ بنا لیتا ہے، تاہم یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہی عربوں کے زمانے کا اصل طاس ہے اور انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی نہر نہیں ہے (یہی بات de Sarzec نے در Heuzey: *Origines Orient de l'Art*، ص ۱۷ میں کہی ہے) ۔ واسط اسی کے کنارے آباد تھا، لیکن بدقسمتی سے اس شہر کا محلِ وقوع معلوم نہیں ۔ جن سیّاحوں (Koldewey و Mortiz) نے سب سے آخر میں اس کے کھنڈروں کی سیر کی تھی انھوں نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی (Sarre و Herzfeld: *Archäolog. Reise*، ۱: ۲۴۷)۔ شطّ الحی جس میں Lynch نے دخانی کشتی پر ۱۸۳۸ء میں سفر کیا تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سال کے بعض مہینوں میں سُوق الشُّیُوخ تک اس میں سفر کرنا ممکن ہے، القُطر کے مقام پر دلدلوں یا البطائح [رکّ باں] میں داخل ہوتا ہے اور نہر ابی الاَسَد کے نام سے اس میں سے ہو کر دِجْلَۃُ العَوْراء میں جا گرتا ہے ۔ یہ دجلۃ العَوراء وہی دریا ہے جسے زمانۂ قبل اسلام اور زمانۂ حال میں دجلہ (Tigris) کہتے ہیں ۔ اَلْمُسَیَّب سے کچھ نیچے دریائے فرات دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، مغربی شاخ کا نام شطّ الہندیّۃ اور مشرقی کا شطّ الحِلّۃ ہے ۔ چونکہ اصل دریا کا بیشتر پانی اپنے زور میں ہندیّہ شاخ میں جانے لگا تھا، اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں حِلّے کا طاس بالکل خشک نہ ہو جائے ۔ ۱۹۱۳ء کے اواخر میں جا کر کہیں ہندیّہ کا بند پایۂ تکمیل کو پہنچا اور پانی کی احسن طریق سے تقسیم ہونے لگی ۔ قُدامۃ کے بیان کے مطابق مغربی شاخ جو مغرب کی جانب کو ذرا مڑی ہوئی ہے القَمْی کہلاتی ہے، (ص ۲۳۳، س ۱۶ ببعد؛ نیز المسعودی: تنبیہ، ص ۵۲، س ۵) اور مشرقی شاخ سُوْرَی کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اوّل الذکر کوفے کی جانب بہتی ہوئی دلدلوں میں گم ہو جاتی ہے ۔

سُوْرٰی یا زیادہ صحیح طور پر نہر سُوْرٰی الاعلٰی (Ibn Serapion ، ص ۲۸) قَصْر ابن ہُبَیْرہ (بابل کے ذرا شمال میں کھنڈر، تِل عمران علی) کے مشہور شہر کے پاس سے گزرتی ہے؛ قصر ابن ہُبَیْرہ سے چھے فرسخ نیچے بالائی نہر سُوْرٰی زیریں نہر سُوْرٰی میں جا گرتی ہے، مشرق کی طرف یہ برابر بہتی جاتی ہے اور اسے صرات الکبیرۃ کہتے ہیں - شہر النِّیل کو طے کر لینے کے بعد اس کا نام نہر النِّیل ہو جاتا ہے - بہتے بہتے یہ موضع الحَوْل (دریاے دجلہ کے کنارے النعمانیہ سے ۴ میل دور) تک جا پہنچتی ہے - یہاں سے اس کے ذریعے دریاے دجلہ تک یا تو سیدھے راستے سے سامان بھیجا اور سفر کیا جا سکتا ہے یا جنوب کی طرف مڑ کر نہر سابُوس پر دجلے تک پہنچا جا سکتا ہے (نہر سابُوس ماذارایا کے بالمقابل ہے جو دجلے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے) - (اس کے متبادل نام زاب، سریانی زابا، کے لیے دیکھیے Marquart ، ص ۱۶۴)- زیریں سوْرٰی (سوْرٰی الاسفل) متعدد مقامات سے گزرتی ہے - ان میں سے ایک مقام کا نام ابن سرابیون نے الجامعان بتایا ہے جو غالبًا وہی جگہ ہے جسے زمانۂ مابعد کے جغرافیہ دانوں نے الحِلّۃ کہا ہے (اسے سیف الدّولہ المَزْیَدی نے تقریبًا ۴۹۵ھ/۱۱۰۲ء میں بسایا تھا) - یہ شاخ آج کل کی شاخ حِلّۃ ہے - اَلْحِلّۃ کے مقام پر اس میں سے ایک شاخ نہر نرس جنوب مشرق کی طرف نکل جاتی ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ ساسانی بادشاہ نرسس Narses (۲۹۲ء) کے نام سے منسوب ہے جس کے حکم سے یہ تعمیر ہوئی تھی - سُوْرٰی اور نرس بالآخر نہر بُدات کوفے کے شمال میں ایک دن کی مسافت پر القناطر کے قریب دریاے فرات کی مغربی شاخ سے نکالی گئی ہے اور بطائح کے شمالی کنارے کو کاٹتی ہے - القناطر بظاہر آرامی پُمْبدِیْتہ (Pumbedita) (= فَم البُدات) ہی ہے، جو علماے یہود کا مشہور و معروف مرکز تھا (جس کا ذکر بن یامین التُّطیلی نے بارھویں صدی میں کیا ہے) - نہر بُدات (فرات کی شاخ) سُوْرٰی اور نرس کا پانی حاصل کرنے کے بعد کوئی چالیس میل تک بہتی ہے اور پھر بڑی دلدل میں گر جاتی ہے .

مندرجۂ بالا آبی گزرگاہوں کے علاوہ بھی اوپر جا کر دونوں بڑے دریا نہروں کے ذریعے آپس میں ملا دیے گئے تھے- مشہور نہر، دُجَیْل جو الرّب (اَنْبار سے ۹ میل اور ہیت سے ۱۶ میل) کے قریب فرات سے نکلتی ہے اور عُکْبرا اور بغداد کے درمیان دجلے میں جا گرتی ہے، دراصل عراق میں نہیں بلکہ الجزیرۃ میں شامل ہے جو عراق کے شمال میں ایک ملحقہ صوبہ ہے - اس میں سے متعدد شاخیں نکل کر عراق کے اضلاع (مَسْکِن، قُطْرَبُّل) کو سیراب کرتی ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہر (۳۴۰ھ/۹۵۱ء) میں مٹی سے اٹ گئی تھی اور اس کا نام ایک دوسری شاخ کو دے دیا گیا تھا جو سامرّے کے قریب ہی دجلے سے نکلتی ہے - اَلْاَنْبار سے آگے جا کر فرات سے چار نہریں نکلتی ہیں : (۱) نہر عیسیٰ : اس کی گزرگاہ کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن عام طور پر اسے آج کل کی نہر صَقْلاویّۃ ہی سمجھنا چاہیے - یہ عیسیٰ بن علی (از روے ابن سرابیون : موسیٰ) بن عبداللہ بن العبّاس کے نام سے منسوب ہے جس کا قصر نہر اور دریاے دجلہ کے سنگھم سے ذرا اوپر دارالحکومت کی حدود میں واقع ہے - بقول ابن سَرابیون (ص ۱۴؛ یاقوت، ۴ : ۸۴۲)، یہ قَنْطَرَۃ دِمَّی (ابوالفداء نے ص ۵۲، س ۱۴ میں دَھْمی لکھا ہے جو غالبًا دِمَّی

کی غلط کتابت ہے) کے مقام پر فرات سے نکلی تھی۔ ابو الفداء، محل مذکور (سلیمان بن مُہنّٰی کی سند سے) بتاتا ہے کہ یہ نہر ایک ایسے مقام سے نکلتی ہے جو اَلفلّوجة کے قریب اَلانبار (انگریزی نقشے میں اَلانبار کے کھنڈر صَقْلاویة کے شمالی کنارے پر اس کے منبع سے ۶ میل کے فاصلے پر "Sifera" کے نام سے دکھائے گئے ہیں) کے نیچے واقع تھی۔ یہ طَسُّوج فیروز سابور کو سیراب کرتی تھی۔ المُحوّل کے مقام پر اس میں سے کئی شاخیں بغداد کی جانب سے نکلتی تھیں، قصر ابن ہُبَیْرہ سے نیچے یہ دریائے دجلہ میں مل جاتی تھی۔ انگریزی نقشے میں نہر صَقْلاوِیّة جھیل اَکّر کُف (Akkar Kuf) میں سے گزرتی نظر آتی ہے جسے جغرافیہ دان (مثلاً یاقوت، ۳: ۶۹۷) عَقْرقُوف کہتے تھے اور جس کا محلِ وقوع جنوبی سرے پر فرض کیا گیا ہے۔ Le Strange اس مقام کا پتا لگانا چاہتا ہے جسے ابن سرابیون نے مُحوّل لکھا ہے۔ Oppenheim کی کتاب میں R. Kiepert کے تیار کردہ نقشے میں خور الصّقلاویة کو جنوبی حصے میں خور اَلعَسْج لکھا ہے۔ دریائے فرات کے مغرب میں نہر کے منبع سے تھوڑے فاصلے پر، انگریزی نقشے میں ھبّانیّہ (Habbania) کا بند دکھایا گیا ہے۔ ولکاک (Willcock) کے منصوبۂ انہار میں اس کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ صَقْلاویَہ کی دلدل کو خشک کرنے کے بارے میں مِدْحت [پاشا] کی تجویز کے لیے دیکھیے Oppenheim، ۲: ۲۸۱۔ البلخی نے ایک مختلف روداد بیان کی ہے (اَلاصْطَخْری، ص ۸۴ ببعد؛ ابن حَوْقَل، ص ۶۵ ببعد)۔ اس کی رُو سے نہر عیسٰی سے کئی چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں جو آگے جا کر پھر آپس میں مل جاتی ہیں اور ایک بڑی ندی یعنی نہر الصَّرات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور یہ نہر دجلے میں جا گرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اصلی نہر عیسٰی بغداد کے وسط میں دجلے سے ملتی ہے۔ اس میں آخری سرے تک جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس نہر الصَّرات میں بندوں کی وجہ سے جہاز رانی ممکن نہیں؛ (۲) نہر صَرصَر، دِجلہ سے تین فرسخ (تقریباً ۱۲ میل) نیچے فرات سے نکلتی ہے اور ضلع بادُورایا (یاقوت؛ ۱: ۴۶۰، میں اس کا املا، رَیّا دیا گیا ہے جو غلط ہے؛ یہ صرف رِیّا یا رایا ہو سکتا ہے) کے ایک حصّے کو سیراب کرتی ہے اور مدائن سے ۴ فرسخ (۱۶ میل) اوپر دجلے میں جا ملتی ہے۔ یہ ابن سرابیون (ص ۱۵) کا بیان ہے۔ اَلبلخی (الاصْطَخری، ۸۵؛ ابن حَوقل: ص ۱۶۶) کے نزدیک نہروں کا جو جال سواد مسلسل میں بغداد اور کوفے کے درمیان پھیلا ہوا ہے اس کا آغاز نہر صَرصَر سے ہوتا ہے۔ یاقوت کے بیان کے مطابق (۳: ۳۸۱) اس کے کنارے بغداد سے تین فرسخ کے فاصلے پر صَرْصَرْ کا شہر واقع ہے۔ یاقوت کا بیان ہے کہ بعض اوقات نہر عیسٰی کو نہر صَرْصَرْ بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ اسے نہر الصَّرات سے ملتبس کر گیا ہے، اس کے نہر عیسٰی سے تعلق کے بارے میں دیکھیے اوپر؛ (۳) نہر المَلک: نہر صَرْصَرْ سے ۵ فرسخ نیچے دریائے فرات سے نکلتی ہے اور المدائن سے ۳ فرسخ نیچے دجلے میں جا گرتی ہے۔ سواد میں ایک طَسُّوج بھی اسی نام سے مشہور ہے (یہ ابن سرابیون؛ ص ۱۶ کا بیان ہے)؛ Le Strange کا یہ کہنا (ص ۶۸) کہ نہر الملک الفلّوجة سے شروع ہوتی ہے درست نہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کیونکہ یہ مقام نہر عیسٰی کے منبع سے صرف ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے اور نہر الملک کا منبع نہر عیسٰی کے منبع سے کم از کم تیس میل دور ہے۔ اسے نقشوں پر خان مُقدّم کے آس پاس تلاش

کرنا چاہیے - نہر الملک بہقباذ الأوسط کے چار طسوجوں میں سے ایک طسوج کا نام بھی تھا - اس کے برعکس فَلُوجة نام کے دو طسوج بہقباذ الاعلیٰ کے تھے؛ (۴) نہر کُوثی : نہر الملک سے تقریباً ۳ فرسخ جنوب میں فرات سے نکلتی ہے اور المدائن سے ۱۰ فرسخ نیچے دجلے میں جا ملتی ہے - یہ ایک غیر معمولی زرخیز علاقے سے گزرتی ہے - اس میں کئی شاخیں نکلتی ہیں جو کُورہ اَرْدشیر بابکان طسوج کوثیٰ کو اور طسوج کی نہر جوبَر کے ایک حصے کو پانی دیتی ہیں - یہ کُوثی رَبّی (ابن سرابیون ص : ۱۵) میں سے ہو کر گزرتی ہے - ابن حَوْقَل (ص ۱۶۸؛ یاقوت، ۴ : ۳۱۶) نے کُوثی رَبّی کے علاوہ جہاں حضرت ابراہیم پیدا اور مدفون ہوئے تھے ایک کوثی الطّریق (آرامی لفظ کا معرّب ؟) کا بھی ذکر کیا ہے - کوثی رَبّی غالباً وہ مقام ہے جسے نقشوں میں تلّ ابراہیم (مُسیّب کے مشرق میں لکھا گیا ہے - دریاے دجلہ کی جن نہروں کا فرات سے کوئی تعلق نہیں ان میں سے ایک نہر دُجَیل کی طرف پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے - اَلبَلْخی (الاصْطَخْری، ص ۷۷ ببعد؛ ابن حَوقل، ص ۱۵۶) میں اس کا ''فُوہ'' (منبع) تَکْریت سے ذرا نیچے بتایا گیا ہے - یہ اس شہر کے بعض حصّوں اور آگے چل کر بغداد کے مضافات تک سامرّے کے سواد کو سیراب کرتا ہے (الاصطخری : ''بغداد کے سواد کا ایک بڑا حصہ اس سے سیراب ہوتا ہے'') - یہ صورت حال ابتدا میں تھی، بعد ازاں یہ نام نہرِ (زیادہ صحیح الفاظ میں) دجلہ کی شاخ کے صرف جنوبی حصّے کے لیے استعمال ہونے لگا - اس امر کا اظہار یاقوت (۲ : ۵۵۵) کے ایک بیان سے ہوتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ دریا تَکْریت اور بغداد کے درمیان سامرّے کے نیچے نکلتا ہے اور کافی مسافت طے کرنے کے بعد دجلے کی طرف مُڑ جاتا ہے - ابوالفداء نے اختلافات کی تحقیق کرنے کی زحمت اُٹھائے بغیر دونوں بیانات پیش کر دیے ہیں، ص ۱۵۶ س ۳ از روے یاقوت: المشترک؛ ص ۲۸۹ ازروے ابن حوقل - تاہم ابوالفداء نے ابن حَوْقَل کے بیان پر ابن سعید کے ایک حاشیے کا اضافہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہر الاسحاقی تکریت کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے، مؤخّرالذکر کا تفصیلی حال ابن سرابیون، ص ۱۸ ببعد (ترجمہ و شرح، ص ۲۶۵ ببعد) میں درج ہے - اگرچہ ابن سرابیون نے ابوالفداء (یا ابن سعید) سے اتفاق کرتے ہوئے ''مشرق'' لکھا ہے، لیکن صحیح قراءۃ یقیناً ''مغرب'' ہے - بیانات میں اختلاف کی توضیح متعدد مراحل سے ہو سکتی ہے؛ قدیم زمانے میں فرات کی ایک بڑی نہر (یا شاخ) اپنے بنانے والے کے نام کی وجہ سے اسحاقی کے نام سے مشہور تھی اور اسے بعض اوقات دُجَیل کے اسم تصغیر سے بھی پکارتے تھے - سامرّے کی وجہ سے بڑی تباہی رونما ہوئی، اندھا دھند عیّاشی کے لیے فضول خرچی کے باعث اراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا - جب شان و شوکت کا زمانہ بیت گیا تو قدیم زمانے کے بہت سے مفید کام مٹ گئے جن میں اسحاقی دُجَیل کی شمالی شاخ اور انبار بھی شامل تھیں - صرف علماے عہدِ عتیق ہی کو ان کے بارے میں کچھ علم تھا، باقی دنیا صرف دُجَیل سے واقف تھی جسے سامرّے کی فضول خرچیاں بھی نہیں مٹا سکی تھیں اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اب بھی موجود ہے (یہ Oppenheim کی تصنیف میں Kiepert کے نقشے میں درج ہے) - یہ آنے والی قرنوں کی تہذیب کا فرض ہے کہ وہ ان کاریزوں کو دوبارہ جاری کریں جو کسی زمانے میں زندگی کا سرچشمہ تھیں -

منصوبہ ایک انگریز انجینئر Willcocks نے تیار کیا تھا (قب Willcocks: *Irrigation of Mesopotamia*، قاہرہ ۱۹۰۵ء)، اب تک ہندیّہ اور ہبابہ کے بند تیار ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے بہت سا رقبہ زیر کاشت لایا جا چکا ہے۔ [ملک میں ایک ترقیاتی منصوبہ بھی زیر عمل ہے جس کے لیے عالمی بنک نے سرمایہ بہم پہنچایا ہے۔ بغداد اور بصرے اور بغداد اور موصل کے درمیان ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے] بعض اشیا کو نجف میں لانے اور وہاں سے لے جانے کے لیے آبی گزرگاہیں ضروری ہوں گی تاکہ منڈی میں وہ دوسرے مال کا مقابلہ کر سکیں۔ نہروں کی تجدید کا مقصد یہ نہیں کہ ان سے وسائل حمل و نقل کا کام لیا جائے۔ عراق میں یہ بالکل صحیح اصول قرار دیا گیا ہے کہ آبی گزرگاہوں یا نہروں سے آب پاشی کا کام لیا جانا چاہیے نہ کہ جہاز رانی کا، لیکن مؤخرالذکر استعمال کے خلاف لوگ جوش میں آ کر بہت آگے نکل گئے ہیں۔ یہ دونوں بڑے دریا زیادہ عرصے تک نظر انداز نہیں رہنے چاہییں بلکہ انہیں قیمتی اسباب کے نقل و حمل کے لیے استعمال کرنا چاہیے تاکہ کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ ایک اہم ترین اقتصادی عنصر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، قُرنة اور نئی بڑی نہر اور دجلے کے مقام اتصال یعنی گرمت علی Gurmat 'Ali (بصرے سے ۱۰ میل شمال میں) کے درمیان دریائے فرات کی زیریں گزرگاہ دلدلی علاقے [بطیحة، رکّ بان] میں واقع ہے جو غالباً قدیم زمانے میں مُحَمَّرة تک پھیلی ہوئی تھی۔ قدیم زمانے میں بطیحة کی وسعت کے مقابلے میں جو عرب جغرافیہ دانوں نے دی ہے (قُدامة، ۵۱۰۰ مربع میل ؟ چونکہ محض خطّی پیمائش ہے اس لیے غیر یقینی ہے؛ Sprenger کا تخمینہ المسعودی [*Babylonien*، ص ۴۷] کی رو سے غلط ہے، اس بارے میں دیکھیے Wagner، در *Nach. Gött. Ges. wiss* ۱۹۰۲ء، ص ۲۳۹؛ دلدلیں کوفے کے بالکل قریب ہی سے شروع ہو جاتی ہیں) ۔موجودہ رقبہ بہت کم ہے یعنی ۱۷۳۰ مربع میل (لیکن ابھی تک شط الحیّ اور دریائے دجلہ کے درمیان بطیحة کے شمالی علاقے کا رقبہ تحقیق نہیں ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی ایک وسیع دلدل موجود ہے (حتّٰی کہ آج کل بھی متعدد خَور (عامیانہ : خَور، نیز حَور؛ اس لفظ پر بعض حاشیوں کے لیے دیکھیے Lidsbarski: *Johanneshuch*، ص ۱۴۴، حاشیہ ۵)، یعنی سیلاب سے بنی ہوئی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی نقشے میں خور ابو کلام اور خور جزائر کے علاوہ خور الہمّر بھی درج ہے جو سب سے بڑا آبی رقبہ ہے۔ سیلاب سے بنی ہوئی جھیلیں ہندیّہ شاخ اور شط الحیّ کے درمیان کے سارے علاقے میں بھی پائی جاتی ہیں، یہ ان جھیلوں سے مختلف سمجھی جاتی ہیں جنھیں بحر کہتے ہیں، مثلاً بحر نجف اور بحر شنافیّہ۔ بطیحة اور خور کے کناروں کو ایسی نہریں کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں جن میں جہاز رانی ہو سکتی ہے، خور حُوَیْزة یا خورالاَعْظَم بھی جس میں سے نہر خرخا گزرتی ہوئی دجلے میں جا گرتی ہے عراق میں شامل ہے۔ شطّ العرب کے ڈیلٹا کی آبی گزرگاہوں کا نام بھی خور ہے لیکن یہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ان جھیلوں سے بالکل مختلف ہیں جو سیلاب سے بنی ہیں۔

اس ملک کی زرخیز زمین سے اول درجے کی کپاس پیدا ہوتی ہے۔ اس کا علم ایک زمانے میں ان بدویوں کی وساطت سے عرب میں پہنچا جن کے ریاست الحیرہ [رکّ بان] سے گہرے مراسم

تھے۔ یہ ریاست اس زرخیز ملک کی سرحد پر واقع تھی اور یہاں سے دونوں ملکوں کا مشاہدہ ہوسکتا تھا۔ جب کبھی عرب کی کسی حکومت کو عروج حاصل ہوتا اور اسے اپنی طاقت پر بھروسا ہو جاتا تو سب سے پہلے وہ عراق کے خوشحال ملک کو اپنے حملے کا نشانہ بناتی۔ یہاں اس حکومت کے لیے وہ مادّی بنیادیں استوار ہوجاتی تھیں جن کے پیش نظر فتوحات [آسان] ہو جاتی تھیں۔ عربوں نے فتوحات کی جو حکمت عملی اختیار کی تھی اور جس کے روح و رواں ابتدا ہی سے (حضرت) عمرؓ تھے، اس کے لیے ضروری تھا کہ ایران کی طاقت کمزور ہو جائے۔ دونوں سرحدوں پر ایسی جرأت سے جنگ شروع کی گئی کہ اس کی قرار واقعی تعریف ممکن نہیں۔ شام اور عراق کی فتح اسقدر مکمل تھی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے پچیس سال بعد پہلی خانہ جنگی کا بحرانی زمانہ یہاں کوئی خاص اثر چھوڑے بغیر گزر گیا۔ فاتحین اپنی پوری قوت کے ساتھ عراق پر پل پڑے اور یہیں انھوں نے اپنی ابتدائی عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ انھوں نے اچانک سخت حملے کرکے دریاے فرات کے کنارے ایران کی سرحدی چوکیاں چھین لیں اور بے خوف و خطر آگے بڑھتے گئے حتّٰی کہ جنگ نہاوند (۲۱ھ/۶۴۲ء) میں ساسانی شہنشاہوں کا تختہ الٹ دیا۔ عربوں نے بڑی دانشمندی اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوے اپنے حملوں کے لیے ایک ۴۰۰ میل لمبا عکسری مرکز قائم کیا، جس کی مشرقی اور مغربی سرحدوں پر بصرے اور کوفے کی چھاؤنیاں تھیں (ان دونوں شہروں کی بنیاد کے متعلق مکمّل مواد Caetani نے دیا ہے: سال ۱۶ھ، ص ۲۳۸ ببعد؛ سال ۱۷ھ، ص ۱۳ ببعد)۔ طَیسفُون (ف: توسفون، انگریزی: (Ctesiphon) اس ملک کا خوشحال دارالحکومت تھا جسے بری طرح تاخت و تاراج کیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا قلعہ بند شہر المدائن کے [تاریخی] شہر کے کھنڈروں پر بسایا گیا (رک بہ (۱) Nöldcke، ص ۱۶، حاشیا ۱؛ (۲) Streek: ص ۲۴۶ تا ۲۷۹) جو مدت تک خستہ حال رہا، حتّٰی کہ بغداد میں مدغم ہو کر رہ گیا۔ نوزائیدہ سلطنت کے اس حصّے کے انتظام کے بارے میں دور اندیش خلیفہ عمرؓ نے بیحد توجہ صرف کی اور کوفے اور بصرے میں علٰحدہ علٰحدہ عامل مقرر کیے گئے۔ ابتدا میں حضرت سَعْدؓ بن ابی وقاص کوفے کے عامل مقرر ہوے، لیکن ہمیشہ شاکی رہنے والے کوفیوں کی درخواست پر ان کی جگہ حضرت عمّارؓ بن یاسر [رک بآن] کو بھیجا گیا، مگر وہ اس عہدے کی ذمّے داریوں کو نباہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے جانشین مُغیرہؓ بن شُعْبہ ہوے۔ بالآخر سعدؓ کو دوبارہ یہ عہدہ دیا گیا (۲۵ھ/۶۴۶ء)۔ ان کے بعد ولید بن عُقبہ (۲۵ھ تا ۳۰ھ/۶۴۶ تا ۶۵۰ء) اور سعید بن العاص ۳۰ تا ۳۳ھ/۶۵۱ تا ۶۵۴ء) مقرر ہوے۔ بصرے کا نظام زیادہ پائدار ثابت ہوا۔ وہاں ۱۷ھ سے ۲۹ھ تک (۶۳۸ تا ۶۵۰ء) ابوموسیٰؓ الاشعری [رک بآن] حکومت کرتے رہے۔ انھوں نے حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین جنگ صفّین کا جھگڑا نمٹانے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُن کی جگہ عبداللہ بن عامر [رک بآن] کا تقرّر ہوا جو بڑی تیزی سے حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے روانہ ہوے، مگر بہت دیر سے پہنچے۔ ۳۵ھ/۶۵۵ء میں حضرت علیؓ نے عثمان بن حنیف کو بصرے کا اور عمّار بن شہاب کو کوفے کا عامل بنا کر بھیجا۔ زیاد بن اَبیہ

(قب مخصوص تصنیف از Lammens *(mcnazmph)*

جسے امیر معاویہؓ نے ۵۶ھ/۶۶۶ء میں بصرے کا عامل مقرر کیا تھا، ۵۰ھ/۶۷۰ء میں سارے عراق کا عامل بن گیا اور اپنی مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوے اس نے ملک میں امن و انتظام بحال کر دیا - ۵۳ھ/۶۷۳ء میں اس نے اپنے بھائی امیر معاویہؓ سے قبل وفات پائی - ۵۵ھ/۶۷۵ء میں اس کا بیٹا عُبَیْداللہ بصرے اور کوفے کا عامل مقرر ہوا - اس کے عہد میں سانحہ کربلا پیش آیا - بصرے کے حالات میں ایک زبردست تبدیلی ان پر آشوب ایّام میں رونما ہوئی جب یزید کی موت (۶۴ھ/۶۸۳ء) کے بعد بصرے کے شمالی علاقے کے عرب بنو تمیم اہل کوفہ کی طرح حضرت عبداللہؓ بن الزُّبَیْرؓ [رک بآں] سے جا ملے - کچھ عرصے کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا کہ عراق بنو اُمیّہ کے قبضے سے نکل گیا ہے حضرت عبداللہؓ بن الزُّبَیْرؓ نے جو نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے، مکّے میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے - انھوں نے عراق میں اپنے عامل مقرر کیے - چھاپا مار فوج سالار اور ہوشیار سردار مختار ۶۶ھ/۶۸۶ء میں بصرے کے عامل کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا، لیکن وہ اگلے ہی سال کوفے کے نزدیک حروراء [رک بآں] کی لڑائی میں مارا گیا - مُصْعَبؓ بن الزُّبَیْر کی موت نے صورت حال یکسر بدل دی - ان کا بہترین سردار المُہَلّب عبدالملک [رک بآں] سے مل گیا اور بصرے میں ایک بار پھر حکومت دمشق کی طرف سے عامل مقرر کر دیا گیا (۷۲ھ/۶۹۲ء) - خوارج ایک مستقل بے اطمینانی اور بد امنی کی جڑ تھے - وہ سارے عراق اور اس کے نواح میں خوزستان کے علاقے میں پھیلے ہوے تھے - انھیں مستقل طور پر کبھی غلبہ حاصل نہ ہو سکا اور دوسری تمام جماعتیں ان کی مخالفت کرتی رہیں - کبھی کبھی کوفے اور بصرے کا ایک ہی عامل مقرر کر دیا جاتا تھا، لیکن ایسی صورت میں عامل اعلیٰ کے ماتحت نائب عامل کام کرتے تھے - ہمارے علم میں کوفے کے حسب ذیل عامل مقرر ہوے : ۵۳ تا ۵۵ھ/۶۷۳ تا ۶۷۵ء عبداللہ بن خالد؛ ۵۵ تا ۵۸ھ/۶۷۵ تا ۶۷۸ء الضّحاک بن قَیْس؛ ۵۸ تا ۵۹ھ/۶۷۸ تا ۶۷۹ء ابن اُمّ الحَکَم؛ ۵۹ تا ۶۰ھ/۶۷۹ تا ۶۸۰ء؛ النعمان بن بشیر؛ ۶۴ھ/۶۸۴ء میں، ہم دیکھتے ہیں کہ عامر بن حُرَیْث (ابن الأثیر، ۴ : ۱۰۹) عُبَیْداللہ (قب بصرہ) کے نائب کی حیثیت میں کوفے پر حکومت کرتا تھا - اسی سال مختار نے کوفے میں خروج کیا جہاں عبداللہ بن الزّبَیْرؓ کی جانب سے ایک عامل متعین تھا - ۷۵ھ/۶۹۴ء سے کوفے میں الحجّاج بن یُوسف [رک بآں] کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا - اسے عبدالملک نے کل عراق کا عامل مقرر کیا تھا - اور اس نے اپنی اعلیٰ انتظامی قابلیت سے کام لیتے ہوے ساری بغاوتوں کو کچل دیا - اہل بصرہ کی بغاوت جنھوں نے مُدعی خلافت عبدالرحمٰن بن محمد بن الأشعث [رک بآں] کا ساتھ دیا تھا دَیرالجَمَاجِم [رک بآں] اور مسکن کی لڑائیوں (۸۳ھ/۷۰۲ء) میں فرو کر دی گئی - الحجّاج نے کوفے اور بصرے کے شہروں کی شورش پسندانہ سرگرمیاں ختم کرنے کے لیے بڑے مؤثر اقدامات اختیار کیے - اس نے واسط کو عراق کی اقتصادی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا (جو دجلے (شط الحّی) کے کنارے واقع تھا اور جہاں سے کوفہ اور بصرہ بھی زیادہ دور نہیں تھے (کوفہ ۱۲۰ میل اور بصرہ ۱۸۰) اور ان پر بآسانی حکومت کی جا سکتی تھی - عبدالملک کی انتظامی اصلاحات

سے بھی عراق کو بہت فائدہ پہنچا، ان اصلاحات کا بنیادی اصول اتحاد تھا جس کے بغیر صحیح ترقی ناممکن تھی۔ ان میں سب سے اہم اصلاح سکّوں کے بارے میں تھی۔ اس پر پہلی بار ۷۵ھ/ ۶۹۴ء میں عمل کیا گیا اور رائج الوقت بوزنطی اور ایرانی سکّوں کی جگہ عربی سکّے استعمال ہونے لگے اگرچہ تانبے کے بعض سکوں پر قدیم علامات اور نشانات بدستور قائم رہے، چنانچہ سلطنت کے بعض حصّوں میں [کچھ دیر تک] چاندی کے سکّوں پر خسرو کی شبیہ آتشکدے کی تصویر کے ساتھ بدستور کندہ ہوتی رہی صرف حاشیے پر کلمۂ طیّبہ لکھ دیا گیا۔ عبدالملک کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ڈاک [برید] کا محکمہ قائم کیا اگرچہ اس وقت اس سے محض سرکاری پیغامات اور اہلکاروں ہی کو لانے لے جانے کا کام لیا جاتا تھا۔ بالآخر عربی حکماً سرکاری زبان قرار دی گئی، قبل ازیں سرکاری دستاویزات ملکی یا غیر ملکی اور عربی زبانوں میں تحریر کی جاتی تھیں۔ الولید کے عہد میں بھی (۸۶ تا ۹۶ھ/۷۰۵ تا ۷۱۵ء) الحجّاج اپنے امتیازی منصب پر برقرار رہا۔ عرب وقائع نگاروں کے متضاد اور عام طور پر ناخوشگوار بیانات کے باوجود اس شخص کی پوری اور واضح تصویر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ ایک گروہ ایسا موجود تھا جس نے نہایت منظم طریق سے بنو امیّہ خصوصاً ان کے ممتاز ترین سیاست دانوں کے تمام کارناموں کو بری صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ دبستان عراق تھا جس کا سب سے بڑا نمائندہ سیف بن عمر ہے (Wellhausen نے اس مسئلے کی بڑی وضاحت سے تشریح کی ہے، قب Caetani : سال ۲۱ھ، ص ۳۰۵)۔ تعصّب کو نظر انداز کرکے جب تاریخی تحقیق سے کام لیا جائے گا تو الحجّاج کی خوبیاں منظر عام پر آئیں گی؛ تاہم اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ اس کے نظم و نسق میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس نے ساری سلطنت کی ترقی پر بہت برے اثرات چھوڑے اور وہ عنصر تھا اپنے ہموطنوں بنو قیس کی جا و بے جا حمایت جو کہ شمالی عرب کے رہنے والے تھے۔ اسی باعث وہ تمام یمنی جو فوج یا حکومت کے دوسرے شعبوں میں ملازم تھے اور وہ سارے باشندے جو اہل یمن کے حامی تھے اس کے خلاف ہوگئے۔ اسی طرح عَلَوی بھی اس کے سخت مخالف تھے کیونکہ ان کے تمام دعووں کو اس نے سختی اور بے دردی سے دبا دیا تھا۔ الحجّاج نے ان تمام لوگوں کے خلاف مؤثر قدم اٹھایا جنھوں نے اپنے اپنے مفاد کے لیے لڑنے کی ٹھانی۔ مثال کے طور پر اَلْمُہَلَّب کا نام پیش کیا جا سا ہے جس نے اپنا کام نکالنے کے لیے حسب موقع ہر جماعت سے فائدہ اٹھایا۔ الحجّاج کی متشدّدانہ کاروائیوں سے جو شدید کشاکش پیدا ہوگئی تھی، اس نے بڑھ کر جنگ و فساد کی شکل اختیار نہ کی کیونکہ الولید حقیقی معنوں میں اپنے باپ کا خلف الرّشید تھا اور وہ اپنی محتاط اور دانشمندانہ حکمت عملی سے کام لے کر قیسیوں اور یمنیوں کے درمیان خانہ جنگی روکنے میں کامیاب رہا، لیکن الولید کے وفات پاتے ہی طوفان پھوٹ پڑا کیونکہ اس کا بھائی اور جانشین سلیمان (۹۶ھ تا ۹۹ھ/۷۱۵ تا ۷۱۷ء) الحجّاج کے دشمنوں یعنی آزردہ خاطر یمنیوں کے زیر اثر تھا جن کا الحجاج ناک میں دم کر چکا تھا۔ بہر حال حجاج اس تکلیف دہ انقلاب سے بچ نکلا کیونکہ وہ خود الولید سے چھے ماہ پیشتر داعی اجل کو لبیک کہ چکا تھا۔ سلیمان کے مسند خلافت پر بیٹھنے سے جو نیا دور شروع

ہوا ۔ اس کا سب سے پہلا واقعہ یہ ہے کہ یزید ابن المُہَلّب کو [جو نہایت شجاع اور مدبر سردار تھا] عراق کا عامل مقرر کر دیا گیا (۹۵ھ/۷۱۴ء)۔ نئے حاکم کے مقرر ہوتے ہی شمالی عربوں کی جماعت کے ممتاز ترین افراد کو جبر و تعدّی کا نشانہ بنایا گیا اور ان سے نہایت متشددانہ سلوک کیا گیا ۔ سلیمان کے انتقال کے بعد مختلف دھڑوں کی حکومت شروع ہوگئی ۔ جب کبھی تخت پر کوئی نیا خلیفہ بیٹھتا تو لوگوں کے دلوں میں ناقابل برداشت حد تک خدشات و خطرات پیدا ہو جاتے ۔ عمرؓ ثانی بن عبدالعزیز بن مروان نے کچھ عرصے کے لیے یزید بن اَلْمُہَلَّب کو قلعۂ حَلَب میں قید کر کے اس کی کارروائیوں کا سدّ باب کر دیا، (ابن الأثیر : ۵ : ۳۶) لیکن ابھی عمرؓ کو وفات پائے (۱۰۱ھ/۷۲۰ء) زیادہ دن نہیں گذرنے پائے تھے کہ یزید فرار ہوگیا اور اس نے فوراً بصرے میں بغاوت برپا کر دی جسے مَسْلَمَة ابن عبدالملک نے فرو کیا (۱۰۲ھ/۷۲۱ء) ۔ اس کے بھائی یزید ثانی (۱۰۱ھ/۷۲۰ء تا ۱۰۵ھ/۷۲۴ء) نے بطور انعام اسے خراسان، بصرے اور کوفے کا عامل بنا دیا ۔ مَسْلَمة نے ان مقامات پر علٰحدہ علٰحدہ اپنے نائب مقرر کیے ۔ ہشام (۱۰۵ھ/۷۲۴ء تا ۱۲۵ھ/۷۴۳ء) نے خالد بن عبداللہ القَسْری کو عراق کا عامل بنا دیا جس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوے ۔ ہشام کی وفات کے ساتھ ہی ساری مملکت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے تک مکمّل ابتری رونما ہونے لگی ۔ جوش و ہیجان کا بے تأمل اظہار ہونے لگا ۔ ہر قسم کے اختلافات نے شمالی عربوں اور جنوبی عربوں کی مخاصمت میں شامل ہوکر اس حد تک شدت اختیار کرلی کہ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے ۔ الولید ثانی کی جو ہشام کے بعد خلیفہ ہوا بنو قیس سے ہمدردی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ۔ اس نے القسری کو بڑے ظالمانہ طریق سے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ مَرْوان ثانی نے ایک سچے مروانی کی طرح اپنے عہد (۱۲۷ھ/۷۴۴ء تا ۱۳۲ھ/۷۵۰ء) میں ایک بار پھر بغاوتیں فرو کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے ۔ اس نے عراق میں خوارج کا فتنہ بھی دبایا، لیکن ابوالعبّاس السّفاح اور ابو جعفر المنصور جیسے ہوشیار عبّاسیوں نے خراسان میں جو آگ بھڑکائی تھی، اسے بجھانا اب ممکن نہیں رہا تھا ۔ ان کے سپہ سالار ابو مُسْلم نے مَرْوان کے عامل نَصْر بن سَیّار کے خلاف ۱۳۰ھ/۷۴۸ء میں فیصلہ کن فتح حاصل کی ۔ عراق کا عامل ابن ہبیرہ بھی اس فتنے کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا ۔ کوفے میں یمنیوں نے بغاوت کر دی اور شہر دشمن کے حوالے کر دیا جسے کچھ عرصے کے لیے عبّاسیوں نے اپنا صدر مقام بنا لیا ۔ ۱۳۲ھ/۷۵۰ء میں خود مَرْوان کو زاب اعلٰی کے مقام پر قطعی شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بنو عبّاس نے بنو امیّة کی جگہ لے لی ۔ ایک لمحے کے لیے ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوے ہم اس سیاسی اصول کا ذکر کر دیں جسے سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے پیش کیا تھا اور جس پر ان کے تمام جانشین پوری طرح عمل پیرا رہے تھے اور جس کے بغیر غالباً بنو امیّہ کی حکومت اس سے بہت جلد ختم ہو جاتی ۔ امیر معاویہؓ اپنی دانشمندانہ معتدل حکمت عملی سے کام لے کر بہت تھوڑی مدّت میں عراق میں اپنی حکومت مستحکم کرنے اور اسے عربی اور اسلامی تمدّن کے رنگ میں ڈھال دینے میں کامیاب ہوگئے تھے ۔ ان کی اس حکمت عملی کا ثبوت اس امر سے خاص طور پر

ملتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کے رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوے فوج میں علاقائی عسکری ملازمت کا اصول رائج کر دیا - جہاں ابتدائی زمانے میں عراق کی فوج غیر ملکی ہوتی تھی اور اس کے دستے صرف چند ایک مقامات پر متعیّن ہوتے تھے وہاں اب بے شمار نو مسلم بڑی تعداد میں بھرتی ہونے لگے - اس بات سے کہ یہ فوجیں ملک سے باہر نہیں بھیجی جاتی تھیں اور صرف مشرقی مہمات میں استعمال کی جاتی تھیں یہ نقصان ہوا کہ بنو اُمیّہ کے دشمن انھیں اپنا زبردست حامی بنانے میں کامیاب ہوگئے - ابو مُسْلم نے عراقیوں اور ایرانیوں کو ساتھ لے کر بنو اُمیّہ کے خلاف جنگ کی جن کے عَلَم کے نیچے صرف شامی تھے - شہری انتظامات کے سلسلے میں بھی امیر معاویہؓ اور ان کے جانشینوں نے دور اندیش مدبر ہونے کا ثبوت دیا اگرچہ انھوں نے عراقیوں کو اپنا عامل منتخب کرنے کا حق نہیں دیا تھا بلکہ ان پر حاکم مسلّط کیے جاتے تھے، تاہم وہ از راہ عقلمندی عراقیوں کی درخواست مان لیتے تھے اور مختلف افراد کی تبدیلی عمل میں لے آتے تھے ؛ لیکن یہ ایک بڑی غیر اہم سی رعایت تھی جس سے ان کے نظامِ حکومت میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی - ان فرمانرواؤں نے یہ بخوبی سمجھ لیا تھا کہ عراق ایک زرعی ملک ہے جس کی زراعت کا انحصار فلاحت (کاشتکاری) کے خاص خاص طریقوں پر ہے، اس لیے اس کا نظم و نسق چلانے کے لیے خاص توجہ درکار ہے اور ان حالات میں نہ تو حاکمانہ مداخلت موزوں ہے نہ مکمّل عدم مداخلت - بارہا ایسا ہوا کہ مرکز کے نمائندوں نے ترقی کے بارے میں مقامی باشندوں کی تجاویز پر عملدرآمد کیا، مثلاً خلیفہ کے بھائی مَسْلَمة نے ایک نہر تعمیر کرائی - بنو اُمیّہ کے عہد میں عراق کو جو اقتصادی خوشحالی نصیب ہوئی وہ اس لحاظ سے اور بھی قابل تعریف ہے کہ انھیں یہاں کے لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا (کوفہ شیعیوں کے ہاتھ میں تھا اور بصرے میں خوارج برسر اقتدار تھے) - اموی عہد میں عراق اور شام میں یہ فرق تھا کہ شام میں اتّحاد اور یگانگی تھی اور عراق میں مسلسل کشمکش اور اختلافات؛ شیعی اور خارجی شورشوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے - ان کے علاوہ شمالی اور جنوبی عرب کے رہنے والے تمیم اور اَزْد قبائل آپس میں برسر پیکار رہتے تھے - ان تمام شورشوں کے باوجود آل مروان کے جلیل القدر فرمانروا ان اختلافات کو کم کرنے اور اپنی سلطنت میں ایک حد تک اتحاد قائم کرنے میں کامیاب رہے - بنو عبّاس کی فتح سے اسلامی سلطنت میں جو انقلاب آیا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایک مستقل اتحاد قائم ہو جائے گا - بغداد کے نئے شہر میں دارالخلافت کی تبدیلی سے مرکز کے مختلف علاقوں کے درمیان ایک مضبوط راستہ استوار ہوگیا ، لیکن دوسری طرف اس اقدام کی تہ میں انحطاط کے جراثیم پرورش پانے لگے کیونکہ اس سے نہ صرف اب بغداد سے مغربی ممالک پر حکومت نہیں ہوسکتی تھی بلکہ اس کارروائی سے مشرقی علاقوں پر بھی گرفت کچھ زیادہ مضبوط نہ رہ سکی - بہر حال وہ علاقہ جو خلیفہ کے براہ راست حلقۂ اثر میں تھا، یعنی مصر، الجزیرہ، عراق اور ایران وہ اپنی وسعت اور زمانۂ قبل از اسلام کی متروکہ اقدار کے اعتبار سے اس قدر اہم تھا کہ بنو عبّاس اور ان کے سیاست دان ایک ناقابل شکست سیاسی قوت اور اقتصادی خوشحالی کا مستقل ڈھانچا تعمیر

کرسکتے تھے ۔ اَلمنصُور اور اس کے ان جانشینوں کے عہد میں جو المأمُون سے قبل تخت خلافت پر بیٹھے، یہ عظیم الشان سلطنت سیاسی اقتدار اور وسعت کے اعتبار سے اتنی بڑی تھی کہ اس سے قبل [دنیا میں] کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ اس کا مقابلہ صرف ہیڈرین (Hadrian) کے عہد کی رومی سلطنت سے کیا جاسکتا ہے ۔ رومی سلطنت اور عباسی خلافت (دور اول) دونوں ایسے دیو قامت مجسّموں کی مانند تھیں جن کے پاؤں چکنی مٹی کے ہوں اور جن کے مقسوم ہی میں یہ لکھا ہو کہ وہ بہت جلد دھڑام سے زمین پر آ رہیں گے ۔ ان کے زوال کے اسباب بہت حد تک یکساں تھے، لیکن دونوں کی بعض الگ الگ امتیازی وجوہ بھی تھیں ۔ خلافت کے قیام میں جس مہلک غلطی کا ارتکاب کیا گیا وہ یہ تھی کہ خاندانی شاہی اقتدار کی بنیاد پیدائش اور مذہب پر رکھی گئی تھی ۔ اس دعوے کا نعرہ لگانے والے گروہ (بنو عبّاس) کے علاوہ اسی قسم کا ایک اور گروہ بھی موجود تھا جو اپنے حقوق کو ثابت کرنے اور غالب آنے والے خاندان کو معزول کرنے کے لیے ان تھک کوششیں کرتا رہا ۔ یہ لوگ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد و احفاد تھے جو ایک مذہبی سیاسی جماعت کی صورت میں منظّم ہو گئے اور سلطنت کے لیے خطرہ ثابت ہونے لگے ۔ وہ اپنی تعداد کی وجہ سے خطرناک نہیں تھے، کیونکہ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی ان کی تعداد مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے دسویں حصے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ خطرے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمان آبادی میں وہ سب سے زیادہ ذہین اور محنتی لوگ تھے ۔ لوگ قبائلی اور مذہبی بنیادوں پر تو برسر پیکار تھے ہی، اب اس خانہ جنگی میں ایک تیسرا یعنی نسلی عنصر بھی کارفرما ہو گیا ۔ مفادات میں عرب ایرانی کش مکش کہیں نہ کہیں ظاہر ہو ہی جاتی تھی ۔ ایرانیوں کو کسی نہ کسی عرب قبیلے کے ساتھ مَوالی کی حیثیت سے بھی منسلک رہنا پڑتا تھا ۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر وہ مجبوراً دوسری جماعت یعنی شیعیان علیؓ میں شامل ہو گئے جنھیں بر سر اقتدار خاندان اور حکومت سختی سے کچل رہی تھی اور جو لوگ مصائب و تکالیف مشترکہ طور پر برداشت کر رہے تھے، انھوں نے ان کے درمیان ایک مضبوط رابطۂ اتحاد کا کام دیا ۔ اس طرح ایک مذہبی اور قومی جماعت ظہور میں آ گئی جو شروع شروع میں خالص عربی النّسل شیعیانِ علیؓ پر مشتمل تھی، لیکن رفتہ رفتہ ایرانی اور شیعی ایک دوسرے کے مترادف الفاظ بن گئے ۔ شروع میں اس خطرے کو تقریباً نظر انداز کیا گیا اور دانشمندانہ حکمتِ عملی سے تقریباً چالیس سال تک اختلافات کی خلیج پاٹنے کی کوشش ہوتی رہی ۔ دوسرے عبّاسی خلیفہ المنصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء) نے خاندان برامکہ کے ایک ممتاز فرد خالد برمکی کو حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر مقرر کر دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک قدیم شاہی خاندان سے تعلّق رکھتا تھا ۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں جو غیر معمولی طور پر ہوشیار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے، یہ خاندان عروج کو پہنچ گیا ۔ اس زمانے میں خلافت کی سیاسی قوت اور اقتصادی خوشحالی اوجِ کمال کو پہنچ گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی ان دنوں ایک ایسا طرز زندگی بھی

ترقی پر تھا جو ان غیر ملکی اعلیٰ تمدنی عناصر پر مشتمل تھا جن کا عرب فاتحین نے شام اور بابل میں مشاہدہ کیا اور مشروط طریقے سے ایک خاص حد تک اسے اپنا لیا، لیکن اس کی مزید ترقی کے لیے بنیادیں استوار نہیں کی گئیں؛ تاہم اس کے سوا کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا تھا ۔ وہ نظام حکومت جس نے بنو اُمیّہ کے آغاز عہد ھی میں ابتدائی جمہوری اصول کی جگہ لے لی تھی، اس تصوّر پر مبنی تھا کہ ملّت اسلامیہ کی خوشحالی کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ھے کہ حکومتی اقتدار کا منصب اعلیٰ کسی ایسے شخص کے سپرد کیا جائے جو اس کی بہترین صلاحیت رکھتا ھو اور اسے غیر محدود اختیارات دے دیے جائیں تاکہ وہ اپنے تسلّط کو پوری طرح قائم و برقرار رکھ سکے، چنانچہ تھوڑے ھی عرصے میں خلافت کا یہ تصوّر اس حد تک مقبول و مستند ھو گیا کہ لوگ خلیفہ کو حقیقی معنوں میں ''ظلِّ الٰہی'' سمجھنے لگے ۔ یہ خلفا عموماً قابل اور صالح ھوتے تھے لیکن بعض ان میں ایسے بھی تھے جو معیاری اور مثالی نہ تھے ۔ اس قسم کے نظامِ حکومت میں دو رجحانات انتہائی خطرناک طور پر ترقی پا گئے : دولت و ثروت کی حد سے بڑھی ھوئی ہوس اور ایک خاص دبستان فکر کے علما کا برسر اقتدار آنا ۔ اسی زمانے میں ایسے منچلے بھی میدان عمل میں آگئے جو خلیفہ کی چنداں پروا نہ کرتے تھے چنانچہ خلافت ایسی متعدد جماعتوں میں بٹ کر رہ گئی جو بیک وقت جداگانہ اور آزاد وجود کی حامل تھیں ان میں سے ھر ایک جماعت اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق ترقی کی منازل طے کرتی گئی ۔ عراق میں بھی یہی کچھ ھوا ۔ آل بُوَیہ کے آغاز حکومت سے لے کر عہد سلجوقیہ کے انجام تک یہ ایک ایسی سلطنت کا صوبہ بنا رہا جس کا دارالحکومت عراق عجم میں واقع تھا اور فرمانرواؤں کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت تک اس کے معاملات میں واضح طور پر دخل اندازی نہ کریں جب تک وھاں کے باشندے اپنے غیر ملکی آقاؤں کا استبداد صبر سے برداشت کرتے رھیں اور روپے پیسے کے متعلق ان کے مطالبے پورے کرتے رھیں ۔ اس کے بدلے میں انھیں یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی قومی زندگی کو اپنے حسب حال جاری رکھیں ۔ بلند ھمّت خلیفہ النّاصر کے عہد میں جب خلافت کے اقتدار کو بحال کر دیا گیا تو اس سے بھی عراق کے حالات میں کوئی بنیادی تبدیلی رُونما نہ ھوئی، علاوہ ازیں تھوڑی ھی مدّت میں تاتاری [مغول] حملے نے اس دَور کا خاتمہ کر دیا ۔

بنو عبّاس کے طویل دورِ حکومت میں عراق کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ۔ اگر عنان خلافت کسی طاقتور خلیفہ کے ھاتھ میں ھوتی تو مختلف عناصر کی باھمی چپقلشوں اور قسمت آزما منچلوں کی شورشوں اور بغاوتوں کو بڑی سُرعت سے کُچل دیا جاتا، ورنہ اس سر زمین میں سخت بدامنی پھیلی رھتی ۔ کوفے اور بصرے کے باشندے اپنی جبلّی خصوصیات کی وجہ سے ناقابل اصلاح تھے ۔ نئے دارالخلافہ میں ایسے ھی کچھ اور عناصر آگئے ۔ اسی زمانے میں اقتصادی خوشحالی کے دوبارہ بحال ھو جانے سے اس ملک میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی کثیر تعداد آباد ھو گئی جنھیں وقت آنے پر قسمت آزما افراد شورش پر آمادہ کر سکتے تھے ۔ مثال کے طور پر یہ کلّیہ ان زنجیوں (زنگیوں) پر صادق آیا جو مشرقی افریقہ سے درآمد کیے گئے تھے ۔ ان کے علاوہ مذھبی

تعصّب کی جو چنگاریاں راکھ کے نیچے سلگ رہی تھیں، وہ بارہا بھڑک کر جہاں سوز شعلوں کی صورت اختیار کر لیتی تھیں ۔ جس غیر معمولی دانش مندی سے کام لے کر برامکہ اور اُن کی رہنمائی میں (پہلے) تین [عبّاسی] خلفا نے عربوں اور ایرانیوں کے درمیان نازک توازن برقرار رکھا تھا، وہ برامکہ کے زوال کے بعد مفقود ہوگئی ۔ برامکہ کے اخراج کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عراق میں نسلی اعتبار سے جو توازن اقتدار قائم تھا، وہ جاتا رہا ۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ ملک کے دو بڑے عناصر یعنی عربوں اور ایرانیوں کے درمیان یگانگی اور مفاہمت پیدا کرنے کی حکمت عملی کا خاتمہ ہوگیا ۔ اس توازن کے خاتمے کے آثار پہلے پہل علویوں کی شورشوں کے ایک سلسلے کی صورت میں ظاہر ہوے جن کا آغاز ابن طَبا طَبا کی بغاوت (۱۹۹ھ/۸۱۴ء) سے ہوا ۔ دارالخلافہ کے لوگ سُنّی خلافت کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوے اور اس سلسلے میں اُنھوں نے اتنے غلو سے کام لیا کہ جب خلیفہ [المامون] نے مفاہمت کی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوے علوی امام [علیؓ] الرِضّا کو اپنے داماد کی حیثیت سے اپنا وارث بنانا چاہا اور علویوں کا سبز رنگ اختیار کر لیا، تو وہ خود خلیفہ کے مخالف ہوگئے ۔ جونہیں خلیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے اپنی اس کارروائی کو کالعدم قرار دیا اور اس سلسلے میں اسے طاقت بھی استعمال کرنا پڑی ۔ برامکہ کے اخراج سے عراق میں عربوں کے سیاسی اقتدار میں کوئی اضافہ نہ ہوا بلکہ اس سے اُن کی بربادی کا راستہ ہموار ہوگیا، کیونکہ مرکز میں گھریلو روابط کی تنظیم و ترتیب میں خلل واقع ہو جانے کے باعث دربار خلافت اور اس کے ذریعے وہاں کی سیاسی زندگی میں ایک نیا عنصر بار پا گیا ۔ اَلْمُعْتَصِم نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ترکوں کا ایک دستہ تیار کیا اور انھیں کے زیر حفاظت اپنے بسائے ہوے شہر سامرّے میں زندگی گزاری ۔ خلفا نے جو ترکی فوج اپنے گرد جمع کر لی تھی، اسے امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور عرب عساکر جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، اُن کے مقابلے میں پس منظر میں جا پڑے، کیونکہ ترک طاقت، سرگرمی اور عسکری روح میں اُن سے بڑھ کر تھے ۔ اس طرح لوگوں میں اپنی حفاظت خود کرنے کی اہلیت جاتی رہی اور وہ غیر ملکی فوجوں کی مدد سے حکومت کرنے والے اُن اشخاص کے رحم و کرم پر رہ گئے جو یا تو خلیفہ کے نامزد کردہ حاکم تھے اور یا اپنے بل بوتے پر انھوں نے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا ۔ ان غیر ملکی فوجوں نے دوسرے صوبوں پر تسلّط جمانے کی کوشش کی ۔ ہم قبل ازیں دیکھ چکے ہیں کہ مصر اور اس کی وجہ سے شام میں ترک خاندانوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آ چکی تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ علاقائی حکومتوں کا طریقہ چل نکلا؛ اگرچہ اس سرزمین سے شاید ہی کوئی قابل ذکر فوج بھرتی ہو سکتی تھی ۔ اَلْمُتَوَکّل کے عہد میں ترک حفاظتی دستہ برسراقتدار آگیا اور ایک با امن اور منظّم حکومت کا قیام ناممکن ہوگیا، چند مستثنیات (اَلْمُعتضد: ۸۹۲ تا ۹۰۲ء اور اَلْمُکتفی: ۹۰۲ تا ۹۰۸ء) سے قطع نظر بعض خلفا معیاری نہ تھے ۔ دربار خلافت میں امیرالامرا کے منصب کے لیے جو جنگ اقتدار جاری تھی اس کا آل بُوَیْہ کے برسر حکومت آ جانے سے (۳۳۴ھ/۹۴۵ء) خاتمہ ہوگیا کیونکہ دونوں عراق یعنی بابل اور میڈیا (مادّای) (دیکھیے آغاز مادّۂ ھٰذا) انکے زیرنگین تھے ۔ ان بغاوتوں کے دوران میں جو انحطاط پذیر

آل بویہ کے زوال اور طاقتور ترک خاندان سلجوق کے اقتدار کے آغاز (۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء) کا باعث ہوئیں، ایک عجیب اشتراک ظہور میں آیا۔ بُوَیہی فوج کے ایک ترک سپہ سالار آرسلان البَسَاسِیْری نے کچھ عرصے تک فاطمی خلیفہ اَلْمُسْتَنْصر (۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء) کے نام پر عراق میں حکومت کی، لیکن چونکہ عراق اور مصر اور جنوبی شام کے درمیان بہت فاصلہ حائل تھا (شام کے صحرا میں کھانے پینے کی اشیا کے نہ ملنے سے سفر ممکن نہ تھا، لہٰذا شمالی شام کی راہ سے چکر کاٹ کر پہنچنا پڑتا تھا)، اس لیے عراق میں فاطمیوں کی صحیح معنوں میں حکومت قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البَسَاسِیْری کی مداخلت ایک ایسا واقعہ تھا جو بہت جلد گزر گیا۔ سلاجقہ جو ترکوں کے حقوق کے سب سے بڑے حامی کی حیثیت سے میدان میں آئے تھے اور جنھوں نے خلیفہ کو بالکل کٹھ پتلی بنا رکھا تھا، اپنے آپ کو مذہب اسلام کے صحیح عقائد کے محافظ بھی سمجھتے تھے، چنانچہ عراق میں جہاں کہیں کسی نے سر اٹھایا، اُنھوں نے اُنھیں نہایت سختی سے دبا دیا۔ اگرچہ اُنھوں نے ایرانی تہذیب کی طرف اپنا میلان طبع ظاہر کیا (سلاجقۂ اعظم بغداد میں نہیں بلکہ اصفہان میں رہتے تھے)، لیکن اُنھوں نے عراق کے عربی تمدن میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی۔ ناصرالدّین کے عہد میں جب عارضی طور پر ایک حد تک خلافت کا اقتدار بحال ہوا تو بھی سیاسی اور مذہبی صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ عراق تاتاری [مغول] فاتح ہلاکو کے لیے لُقمۂ تر ثابت ہوا (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) اور خلافت کا چراغ گل ہو جانے کے بعد اس کے دارالخلافہ بغداد کی حیثیت ایک معمولی صوبائی صدر مقام کی ہو کر رہ گئی۔ منظم آب پاشی کو نظرانداز کرنے کا جو سلسلہ دسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہوگیا تھا، برابر جاری رہا اور رفتہ رفتہ عراق ایک لق و دق صحرا بنتا گیا۔ جہاں کہیں کہیں کوئی بڑا گاؤں نظر آ جاتا تھا وہاں صرف کھجور کے درختوں کی کاشت ہی قابل ذکر تھی۔ طاقتور صفوی بادشاہ شاہ اسمٰعیل کے عہد میں عراق کی ایران میں شمولیت (۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء) مستقل نہیں تھی۔ جلد ہی یہ ملک سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں چلا گیا (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) اور ۱۹۱۸ء تک اسی کا صوبہ رہا

[حکومت ۱۹۱۴ء کے بعد]۔ ۱۹۱۴ء سے قبل عثمانی حکومت کے لیے عراق پر فرمانروائی نہ صرف دقت طلب بلکہ کثیر مصارف کا موجب تھی۔ اگرچہ اس وقت ملک انتظامی اعتبار سے چار وحدتوں یعنی موصل، بغداد اور بصرے کے صوبوں اور دیرالزور کی کمشنری میں منقسم ہو چکا تھا لیکن استانبول سے متعین کیے ہوئے گورنروں کا اختیار اور حکومت برائے نام تھی۔ عراق میں مختلف قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی گروہ، مثلاً کرد، ترکمان، آشوری، شیعہ، یزیدی، دلدلی مقامات کے مکین اور دوسرے قبائلی آباد تھے، اس لیے اہل عراق کو قابو میں رکھنا مرکزی حکومت یا اس کے نمائندے کے لیے بہت مشکل تھا۔ انیسویں صدی میں ذرائع آمد و رفت اور نظام رسل و رسائل میں ترقی سے شاید وہ مرکزی حکومت کے مطیع و فرمان بردار بن گئے ہوں۔

عراق پر قابض برطانوی افواج دو سال (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰ء) کے بعد سارے ملک میں کسی قدر امن و امان اور نظم و نسق پیدا کر سکیں۔ برطانوی سپہ سالار کے ماتحت ایک

سول کمشنر تھا جس نے بغداد میں حکومت کے جدید محکمے قائم کر کے مرکزی انتظامیہ کی بنا ڈالی ۔ ان میں اہم ترین محکمے وہ تھے جن کا امن و امان اور ملک کی سالمیت سے تعلق تھا کیونکہ بہت سے علاقے ابھی تک بغداد کی حکومت سے منحرف تھے ۔ مالیات کے علاوہ زراعت، تعمیرات اور آبپاشی، صحت اور صفائی کے محکمے بھی اہمیت کے لحاظ سے کم نہ تھے ۔ حکومت کے جدید محکموں کے کاروبار کے لیے صوبجاتی تنظیم قائم تھی ۔ ان کا حال انتظامی وحدتوں کا تھا جو پہلی جنگ عظیم سے پیشتر موجود تھیں اور تعداد میں سولہ تھیں؛ آجکل بھی ان انتظامی وحدتوں کی تعداد سولہ ہے ۔

فوجی حکومت کا اختتام اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوا تو عراق میں سرکاری کونسل کی تشکیل عمل میں آئی جو ملکی انتظام کی ذمّے دار تھی ۔ اس کے مشیر انگریز عہدہ داران حکومت تھے ۔ برطانوی افسروں کے زیر نگرانی عراقی کابینہ کا نظام حکومت بادشاہت کے دوران میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک قائم رہا جب کہ عراق آزاد ہو کر جمعیۃ الاقوام کا رکن بن گیا اور عراق پر برطانوی انتداب کا خاتمہ ہوا ۔ اس کی جگہ انگریزی-عراقی معاہدے نے لے لی ۔

مضبوط فوج، فضائیہ، اور پولیس دستوں کی تشکیل و ترتیب بھی ملک پر حکومت کرنے کے لیے ضروری تھی ۔ ۱۹۳۶ء تک حکومت کے تینوں انتظامی شعبوں میں دوسرے زرخیز علاقوں کے شعبوں کی نسبت کہیں زیادہ ترقی ہوئی ۔ ملک کی فرقہوارانہ، قبائلی اور نسلی تقسیم کی بنا پر ایک عمدہ عدلیہ کی تکمیل بھی یکساں طور پر ضروری تھی ۔ اگرچہ بیشتر مرکزی طاقت بغداد میں تھی پھر بھی قبائل کے لیے مصالحتی عدالتیں اور خاص انتظامی طریق کار تھا ۔ عراق میں آبپاشی اور زراعت کے میدانوں میں قدرتی ذرائع کی ترقی اور تکمیل بھی حکومت کی ذمّے داری میں شامل تھی ۔ مقامی علاقوں کو ترقی دینے کے لیے بلدیات کی ہمت افزائی کی گئی اور انھیں مالی مدد بھی دی گئی (دیکھیے ۱۹۲۹ء کا بلدیاتی قانون) ۔ ذرائع آمد و رفت بہتر ہوئے تو قبائلی سرداروں کے بجائے حکومت بغداد کا اقتدار بڑھنے لگا ۔

صوبوں کی ابتدائی عدالتوں کا نظام کار مصر جیسا تھا ۔ عراق میں ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء عثمانی حکومت کے ضابطۂ دیوانی یعنی مَجلّہ [رک بآن] پر عملدرآمد ہوتا رہا ۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک نیا ضابطۂ دیوانی نافذ کر دیا گیا ۔ مصر کی طرح عراق میں بھی صوبائی انتظامیہ وزارت داخلہ کے ماتحت ہے، اس لیے شہریوں کا حق قانون سازی محدود ہے ۔ یہ بات عراق کے لیے بے حد اہم ہے، کیونکہ وہاں بے شمار فرقے ہیں جو عراقی حکومت کے مدمقابل بنے رہتے ہیں، پھر بھی دوسرے عرب ممالک کی طرح گذشتہ سالوں میں مستقل سرکاری ملازموں کی ایک جماعت قائم ہوگئی تھی جس کے ارکان کی تعداد میں اب اضافہ ہوگیا ہے ، خاص کر جبکہ جولائی ۱۹۵۸ء سے شروع ہونے والے فوجی انقلابات نے عوامی فلاح و بہبود کے عُمّال کو بھی حکومت کی انتظامیہ میں شامل کر لیا ہے ۔ تعلیم یافتہ عراقیوں کی بیشتر تعداد دیوانی ملازمتوں میں شامل ہوتی رہتی ہے ۔ ۱۹۵۷ء کے قانون کی رو سے دیوانی ملازمتوں کے طریق کار کو بہتر بنایا گیا ہے اور ''مجلس سرکاری ملازمت'' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے ۔ مصر کی طرح عراق نے بھی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء سے محنت اور سماجی تحفظ

کی ملازمتوں کی ذمّے داری خود لے رکھی ہے۔ ۱۹۵۶ء سے ان میں مزید توسیع کی گئی ہے۔ ۱۹۵۳ء سے حکومت کا بڑا فریضہ اہم ترقیاتی منصوبوں کے لیے پٹرول سے حاصل شدہ آمدنی کا معتدل استعمال ہے۔

حکومت ۱۹۴۰ء سے مفت اور لازمی تعلیم کی ذمّے دار ہے، لیکن فوج کی سیاسی معاملات میں بار بار مداخلت، ماضی میں مختلف قبائل کی بغاوت اور حکومت اور کردوں کی آویزش سیاسی عدم استحکام کے وہ مظاہر ہیں جنھوں نے انتظامیہ کے کاروبار کو بری طرح متأثر کیا ہے۔ اگست ۱۹۵۸ء سے حکومت کی کارگزاری مجروح ہو چکی ہے جب کہ سازش کے خلاف قانون کا نتیجہ سیاسی تطہیر، سیاسی جماعتوں کی پارلیمانی تنظیمات، عوامی فوج اور دوسرے گروہوں کا وجود میں آنا ہے۔

۱۹۵۸ء کے پرامن انقلاب سے فوج میں حکومت کے انتظام و انصرام سنبھالنے کا رجحان روز افزوں رہا ہے۔ مئی ۱۹۶۴ء کے قانون کی رو سے صدارتی نظام حکومت کو وسیع اختیارات حاصل ہیں (بادشاہی دور میں بھی اتنے اختیارات نہ تھے)۔ صدر مملکت کابینہ کے وزیروں کا عزل و نصب کرتا ہے اور قومی حفاظتی مجلس کی مدد سے حکومت کا کاروبار چلاتا ہے۔ مصر کی طرح صرف ایک سرکاری سیاسی تنظیم، جس کا نام ''عرب سوشلسٹ یونین'' ہے، کے قیام کا اعلان ہوا ہے۔ علاوہ ازیں حکومت منصوبہ بندی کی پابند ہے جو کہ معیشت، امداد باہمی کے وسیع نظام اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کے لیے دلیل راہ کا کام دیتی ہے۔

مآخذ: (۱) *Bibl. Geogr. Arab*، طبع ڈخویہ، جلد ۱؛ (۲) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۲۴ تا ۸۵؛ (۳) Ibn Serapion: *Description of Mesopotamia and Baghdad*، طبع و ترجم، G. Le. Strange، در *Journ of the Roy. As. Soc.*، ۱۸۹۵ء؛ (۴) یاقوت: معجم، تحت مادّۂ العراق و دیگر متعدد مادّے؛ (۵) Ritter: *Erdkunde von Asien*، ج ۱۰ تا ۱۱؛ (۶) J. F. Jones: *Memoirs on the province of Baghdad*، در *Selections from the Records of the Bombay Government*، ص ۴۳، نیا سلسلہ؛ (۷) M. Streck: *Die alte Landschaft Babylonien nach den arbabischen Geographen*؛ (۸) Petermann's: *Reisen im Orient*، ج ۲؛ (۹) Cuinet: *La Turquie d'Asie*، ج ۳؛ (۱۰) v. Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum Perzischen Goly*، ج ۲؛ (۱۱) Sprenger: *The Irrigation of Babylonien*؛ (۱۲) Willcocks: *Mesopotamia* (قاہرہ ۱۹۰۵ء)؛ (۱۳) Sarre و Herzfeld: *Archaeologische Reise im Euphrath-und Tigris-Gebeit*؛ (۱۴) M. Hartmann: *Aus Nadschd und dem Irak*، در *Welt des Islams*، ج ۲، ص ۲۴ تا ۵۴، ص ۲۹۷ تا ۳۰۸ و ج ۳: ص ۳۸ تا ۴۸؛ (۱۵) Stuhlmann: *Der Kampf um Arabien*؛ (۱۶) نقشے: *Lower Mesopotamia between Baghdad and the Persian Gulf* [برطانوی] دفتر جنگ، حصۂ جغرافیہ، جنرل سٹاف، شمارہ ۲۵۶۳ (پیمانہ ۱:۱۰۰۰۰۰۰).

(M. HARTMANN)

* **عِراقی**: ساتویں صدی ہجری کے مشہور شاعر، شیخ فخرالدّین ابراہیم بن بزرگ مہر بن عبدالغفّار جوالیقی ہمدانی متخلص بعراقی، کمجان [کَمیجان] نام کے گاؤں میں ہمدان کے بیرونی علاقے میں ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ء میں پیدا ہوے۔ ان کے اجداد اپنے زمانے کے فضلا میں سے تھے۔ انھوں صرف و نحو اور ادبیات عربی

اور تفسیر و حکمت کی تعلیم ہمدان میں حاصل کی اور سترہ سال کی عمر میں وہیں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا - ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ - ۱۲۳۰ء میں انھیں اپنے اندر ایک روحانی جستجو محسوس ہوئی - بزرگوں کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے مولد ہمدان سے روانہ ہو گئے اور قریب کے ایک مقام سجّاس میں رکن الدّین سجّاسی کے ہاں پہنچے - اس کے بعد بابا کمال خجندی اور شمس الدّین محمّد بن علی بن ملک داد تبریزی کی خدمت میں جو اس عہد کے مشہور عرفا میں سے تھے شرف یاب ہوئے (شوّال ۶۳۲ھ/ جون - جولائی ۱۲۳۵ء) - پھر وہ اصفہان گئے اور وہاں سے ہندوستان پہنچے - ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ - ۱۲۳۴ء میں عراقی ملتان کے شیخ بہاء الدّین زکریّا (از ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ - ۱۱۷۰ء تا سہ پہر پنج شنبہ ۷ صفر ۶۶۶ھ/۲۸ اکتوبر ۱۲۶۷ء) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور پچیس سال تک ریاضت کی، اس مدت میں ایک سفر دہلی کا اور دوسرا سومنات کا کیا، پندرہ سال ملتان میں درس دیا - یہاں شیخ بہاء الدّین زکریا کی بیٹی سے شادی کی جس کے بطن سے ایک لڑکا کبیرالدّین پیدا ہوا - شیخ بہاء الدّین زکریّا نے انھیں اپنا جانشین قرار دیا تھا لیکن شیخ کے انتقال کے بعد ان کے مریدوں میں اختلاف پیدا ہو گیا - یہی وجہ تھی کہ عراقی نے اسی سال (۶۶۶ھ/۱۲۶۷ - ۱۲۶۸ء) ملتان سے ہجرت کی اور عمّان کے راستے حج کے لیے چلے گئے، مدینے میں روضۂ اطہر کی زیارت کے بعد وہ بغداد پہنچے اور پھر عازم ملک روم (آج کا ترکی) ہو گئے، کچھ عرصے تک وہاں کے شہروں، مثلاً قونیہ، توقاد (توقات یا طوقات) جو قونیہ اور سیواس کے درمیان ہے، اور سنوب (یا سینوپ) میں، جو نواح قسطمونی میں ہے، بحر اسود کے ساحل پر قیام پذیر ہو گئے - اس زمانے میں وہ اپنے زمانے کے دو سب سے بڑے مشائخ کی خدمت میں باریاب ہوئے - پہلے انھیں مولانا جلال الدّین بلخی جو رومی کے نام سے معروف ہیں، (۶ ربیع الاول ۶۰۳ھ تا ۵ جمادی الآخرہ ۶۷۲ھ/ ۲۱ اکتوبر ۱۲۰۶ء تا ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء) کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا - وہ ان سے چند بار ملے اور ان کے جنازے کی شرکت کے لیے قونیہ میں موجود تھے - دوسرے مشہور بزرگ شیخ صدرالدّین ابوالمعالی محمّد بن اسحٰق بن محمّد قونوی (م ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ء) تھے، جن کے رفقا میں ایک زمانے تک ان کا شمار رہا اور معروف عارف ابوبکر محمّد بن علی حاتمی طائی اندلسی مالکی معروف بہ ابن العربی (۷ رمضان ۵۶۰ تا ربیع الآخر ۶۳۸ھ/۱۸ جولائی ۱۱۶۴ء - اکتوبر ۱۲۴۰ء) کی کتاب الفتوحات المکّیہ فی اسرار المالکیہ والملکیہ جس کی تصنیف وہ ماہ صفر ۶۲۹ھ/ نومبر ۱۲۳۱ء میں ختم کر چکے تھے، ان سے پڑھی - اور معین الدّین ابو نصر سلیمان بن محمّد سلیمان بن مہذّب الدّین علی دیلمی معروف بپروانہ سے بھی ملے جو ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ - ۱۲۷۷ء میں قتل ہوا اور ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ء سے ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ - ۱۲۷۷ء تک رکن الدّین قیلج آرسلان چہارم (از سلاجقۂ روم) کا وزیر رہ چکا تھا اور اپنے عہد کے اہل تصوف کا بے حد معتقد تھا - اس نے توقاد میں ان کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی - اس سفر کے دوران میں انھوں نے اپنی کتاب لمعات قونیہ میں لکھی - بظاہر معین الدّین پروانہ کے قتل اور ایشیائے کوچک

کے حالات کی ابتری کے بعد ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ - ۱۲۷۷ء سے ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ - ۱۲۷۸ء تک انھوں نے مصر کا سفر اختیار کیا، اور رکن الدّین بیبرس بندقداری حاکم مصر (۶۵۸ تا ۶۷۶ھ/ ۱۲۵۹ - ۱۲۶۰ تا ۱۲۷۷ - ۱۲۷۸ء) نے کہ وہ بھی مشائخ صوفیہ کا بے حد معتقد تھا، انھیں شیخ الشّیوخ کا منصب تفویض کر دیا اور بظاہر وہ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ - ۱۲۷۸ء میں اس کی وفات کے بعد ایشیاے کوچک واپس آ گئے اور کچھ مدت کے لیے توقاد میں رہے - ۶۸۰ھ/ ۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ء میں جب مغل سپاہی ہولاگو خان کے نویں بیٹے تنقوربای کے، جو اسی سال مارا گیا، اور مشہور وزیر شمس الدّین محمّد بن بہاء الدّین محمّد بن شمس الدّین محمّد بن بہاء الدّین علی الجُوَینی صاحب دیوان کے ساتھ جو بروز دو شنبہ، ۳ شعبان ۶۸۳ھ/۱۶ اکتوبر ۱۲۸۴ء کو قتل کیا گیا، ایشیاے کوچک آئے - اس نے الجوینی سے ملاقات کی اور اسی سال (۶۸۰ھ/۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ء) اپنی مثنوی عُشّاق نامہ یا دہ نامہ شمس الدّین صاحب دیوان الجوینی کے لیے لکھی - اس کے بعد وہ دمشق چلے گئے - چھے ماہ کے بعد ان کا بیٹا کبیر الدّین بھی ملتان سے ان کے پاس آ گیا - انھوں نے دمشق میں پانچ روز کی بیماری کے بعد ۸ ذوالقعدہ ۶۸۶ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۲۸۷ء کو انتقال کیا - انھیں صالحیۂ دمشق میں محی الدین ابن العربی کے مزار کی پشت پر دفن کیا گیا - ان کا مزار دسویں صدی کے نصف اول تک معروف رہا، لیکن آج اس کا کوئی نشان باقی نہیں - ان کے دیوان کے پیش لفظ میں جو بظاہر آٹھویں صدی کے آغاز میں ان کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے کسی نے تحریر کیا ہے اور عشاق نامہ کی ابتدا میں جسے آربری Arberry نے شائع کیا ہے، اور اسی طرح ان کے کلیات میں جسے راقم مقالہ نے شائع کیا ہے، ان کے حالات زندگی تفصیل سے مذکور ہیں.

فخر الدّین عراقی ساتویں صدی ہجری کے نصف ثانی کے سب سے بڑے صوفی شعرا میں سے ہیں اور اس سلسلے کے عظیم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں - عارفانہ غزلیات میں وہ بہت قادر الکلام تھے - ان کے متصوفانہ ترجیع بند بھی مشہور ہیں - انھوں نے قصیدہ غزل، ترجیع بند، قطعات اور رباعیات کی شکل میں ۸۰۰ اشعار چھوڑے ہیں - ان کے علاوہ مثنوی دہ نامہ یا عشاق نامہ بھی ان کی یادگار ہے جسے انھوں نے ۶۸۰ھ/ ۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ء میں توقاد میں شمس الدّین صاحب دیوان الجوینی کے لیے نظم کیا تھا - اس میں ۱۰۶۴ اشعار ہیں - تصوف میں ان کی بے حد بدیع اور عمدہ تصنیف لمعات ہے - یہ کتاب انھوں نے کتاب السوانح فی معانی العشق کی تقلید میں (جو امام حجّۃ الاسلام غزالی کے بھائی ابوالفتوح احمد بن محمّد بن احمد الغزالی طوسی (م ۵۱۰ھ/۱۱۲۶ء) کی مشہور کتاب ہے) ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ - ۱۲۷۵ء سے پہلے قونیہ میں تصنیف کی - یہ تصوف کی معروف ترین کتابوں میں سے ہے اور اس پر متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں - ان میں سے بعض یہ ہیں: صائن الدّین علی ترکہ اصفہانی (۸۳۵ھ/ ۱۴۳۱ - ۱۴۳۲ء) کی شرح الضّوء کے عنوان سے، شیخ یار علی شیرازی کی شرح بنام اللمحات فی شرح اللمعات (۸۲۶ھ/۱۴۲۲ - ۱۴۲۳ء) اور شرح خاوری و شرح برہان الدین خَتْلانی (۸۹۳ھ/۱۴۸۷ء)، نیز زبدۃ الطریق کے مصنف درویش علی بن یوسف کوکھری کی شرح ۸۰۵ھ/

۱۴۰۲ء میں، اشعۃ اللمعات کے نام سے نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی شرح جسے جامی نے ۸۸۹ھ/ ۱۴۸۴ء میں مکمل کیا ہے۔

مآخذ : (۱) حمداللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ، مطبوعۂ یادگار سلسلۂ کب؛ (۲) جامی: نفحات الانس، کلکتہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء؛ (۳) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، لائیڈن؛ (۴) خواندامیر : حبیب السیر؛ (۵) مجالس العشاق، کانپور ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء؛ (۶) ملا عبدالنبی فخر زمانی : میخانہ، لاہور ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء؛ (۷) داراشکوہ : سفینۃ الاولیا، لکھنؤ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء؛ (۸) شیر خان لودی : مرآۃ الخیال، بمبئی ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء؛ (۹) محمد قدرت خان کوہاموئی : نتائج الافکار، مدراس ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء؛ (۱۰) لطف علی بیگ آذر : آتش کدہ، بمبئی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء؛ (۱۱) سید محمد صدیق حسن خان : شمع انجمن، بھوپال ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء؛ (۱۲) رضا قلی خان ہدایت : ریاض العارفین، تہران ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء؛ (۱۳) غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیا، کانپور ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء؛ (۱۴) رضا قلی خان ہدایت : مجمع الفصحا، تہران ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء؛ (۱۵) نائب الصدور معصوم علی شاہ شیرازی : طرائق الحقائق، تہران؛ (۱۶) اسمٰعیل پاشا بغدادی : ہدیۃ العارفین، استانبول ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء؛ (۱۷) محمد صادق ناظم تبریزی : منظم گرویدہ، نسخۂ خطی مملوکۂ نگارندہ؛ (۱۸) امین احمد رازی : ہفت اقلیم، نسخۂ خطی مملوکۂ نگارندہ؛ (۱۹) شیخ ابوالقاسم بن ابو حامد نصر بلیانی انصاری : سلّم السّماوات، نسخۂ خطی مملوکۂ نگارندہ؛ (۲۰) محمدعارف نقائی: مجمع الفضلاء، نسخۂ خطی متعلق بنگارندہ؛ (۲۱) احمد علی خیر آبادی : قصر عارفاں، نسخۂ لاہور (اورینٹل کالج میگزین)، ۱۹۶۵ء (۲۲) تاریخ فرشتہ؛ (۲۳) اشعۃ اللمعات، تہران؛ (۲۴) مقالۂ دکتر آربری Arberry در مجلۂ روزگار نو، ج ۱، شمارہ ۱؛ (۲۵) مقالۂ عبدالحسین نوائی در مجلۂ یادگار، سال چہارم، شمارہ ۶؛ (۲۶) قاسم غنی : تاریخ تصوف در اسلام و تطورات و تحولات مختلفۂ آن از صدر اسلام تا عصر حافظ، تہران ۱۳۲۲ھ (شمسی)؛ (۲۷) کلیات عراقی، لاہور؛ (۲۸) فخرالدین عراقی : عشاق نامہ، مع سوانح عمری مصنف، تصحیح آربری Arberry، سلسلۂ مطبوعات اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، شمارہ ۸، ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۹ء؛ (۲۹) بالخصوص فخرالدین ابراہیم ہمدانی متخلص بعراقی : کلیات (جو مقدمہ، دیوان، قصائد، قطعات، ترکیبات، ترجیعات، غزلیات، رباعیات، عشاق نامہ یا دہ نامہ، لمعات اور اصطلاحات تصوف پر مشتمل ہے)، یہ کلیات اٹھارہ مختلف نسخوں سے مقابلے کے بعد سعید نفیسی کی سعی سے اور ان کے مقدمے کے ساتھ تہران سے ۱۳۳۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔

(سعید نفیسی)

العَرائش : ''انگور کی بیلوں کی جعفریاں یا ٹٹیاں''؛ فرانسیسی اور ہسپانوی میں لراشے Larache؛ بحراوقیانوس کے کنارے مرّاکش کے ساحل سمندر پر واقع ایک قصبہ، طنجہ کے شمال مغرب میں تقریباً ۴۴ میل اور فاس کے شمال مغرب میں ۸۳ میل کے فاصلے پر، جای وقوع ۳۳°، ۳۲′، عرض البلد شمالی، ۸°، ۲۸′، ۲۲″ طول البلد مغربی (پیرس سے)۔

العرائش ایک پہاڑی کی ڈھلان پر پھیلا ہوا ہے، جو ایک راس کی شکل میں سمندر کے اندر چلی گئی ہے، اور وادی لکّوس کے شمالی کنارے پر اس جگہ واقع ہے جہاں دریا سمندر میں گرتا ہے۔ اسلامی شہر کی حیثیت سے یہ مقام قطعی غیر اہم ہے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی کے لیے دلچسپی کا موجب ہو، سوا ایک بازار (سوق) کے جو چوکور شکل کا ہے اور جس کے دونوں جانب محراب دار راستے ہیں، جن کی وجہ سے اس کی شکل ایک مبہم سی تاریخی عمارت کی ہوگئی ہے۔ پہلے

ہسپانوی قبضے (۱۶۱۰ء تا ۱۶۸۹ء) کی یادگار کے طور پر یہاں ایک قلعہ اب بھی موجود ہے جس کا نام Castillo de las Cigüeñas (بگلوں کا قلعہ) یا سنتا ماریا Santa Maria de Europa ہے۔ اسلامی شہر کے جنوب اور جنوب مغرب میں ہسپانویوں نے جنھوں نے ۱۹۱۱ء میں اس شہر پر از سرنو قبضہ کر لیا تھا، ایک یورپی شہر بسایا جس کا مرکز ۱۹۵۰ء میں دائرے کی شکل کا ایک علاقہ تھا جسے Plaza de España کہتے تھے۔ وادی لکّوس کی سیلابی مٹّی کے اکھٹا ہو جانے سے وزنی جہازوں کا بندرگاہ تک پہنچنا غیر ممکن ہوگیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں العرائش کی آبادی پینتالیس ہزار سے کچھ کم تھی، جس میں اٹھائیس ہزار کے قریب مسلمان تھے، ان کے علاوہ تیرہ سو یہودی اور تیرہ ہزار یورپی تھے، جو تقریباً سب کے سب ہسپانوی تھے۔ العرائش کے آس پاس زیادہ تر آلو اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ صنعت و حرفت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں؛ ماہی گیری کے پیشے نے البتہ کسی قدر ترقی کی ہے (۱۹۵۳ء میں ۲۳۰ چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں)۔ شہر کا سرپرست للہ منّانہ Lalla Mennana ہے، جس کا قبّہ خشکی کی طرف سے یہاں آنے والے کے لیے شہر کے شروع ہو جانے کی نشان دہی کرتا ہے۔

العرائش زیادہ پرانا شہر نہیں۔ الادریسی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور دوسرے عرب مصنّفین بھی ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی سے قبل تک اس کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ مزید برآں عام تصانیف میں بھی اس کا ذکر شاذ ہی آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد قبیلۂ بنو عَرُوس نے رکھی تھی جنھوں نے آس پاس انگور کی بیلوں کی افراط کی وجہ سے اس کا نام العَریش ''متاع بنی عروس'' رکھ دیا۔ الموحد سلطان یعقوب المنصور نے وادی لکّوس کے دہانے پر ایک قلعہ تعمیر کروایا، جس پر ۱۲۷۰ء میں ہسپانوی عیسائیوں نے اچانک یلغار کر دی اور اسے سر کر لیا۔ لیکن جیسا کہ مرّاکشی ساحل کے غیر اہم مقامات کے ساتھ اکثر پیش آیا ہے، العرائش کے تاریخی حالات کسی قدر یقین و اعتماد کے ساتھ اسی وقت سے سامنے آتے ہیں، جس وقت سے پرتگیزوں نے اس کی سر زمین پر قدم رکھا۔ سَبْتہ Ceuta [راک بآن] پر قبضہ کرنے (۱۴۱۵ء) کے اگلے ہی سال سے انھوں نے اس شہر پر حملہ کیا۔ لیکن اس فتح کے اثرات دیرپا ثابت نہیں ہوے ۱۴۷۱ء میں پرتگال کے بادشاہ الفانسو پنجم کا ارزیلا Arzila اور طنجہ پر قبضہ العرائش کی آزادی سلب کرنے کا باعث ہوا جو معاہدۂ صلح کی رو سے پرتگال کے زیر اثر علاقے میں شامل ہوگیا اور اس کے بعد بیس سال تک غیر آباد رہا۔ ۱۴۸۹ء میں شاہ پرتگال جان John ثانی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوے شمالی مراکش میں اپنی قوت کو زیادہ مستحکم کرنے اور فاس اور قصر الکبیر کے لیے براہ راست خطرہ پیدا کرنے کی غرض سے اس دریا اور وادی مخازن کے سنگھم سے نیچے ہٹ کر لکّوس Lukkos کے دائیں کنارے پر la Graciosa نامی ایک قصبہ بنا لیا۔ مراکشیوں کے نرغے میں آ جانے، دلدلی بخار میں مبتلا ہو جانے اور دریا کے اتھلے ہونے کی وجہ سے رسد اور فوج کی کمک رسانی کے مسدود ہو جانے کی بنا پر پرتگیزوں کو طویل مدافعت کے بعد سمجھوتا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور وہ بغیر کسی تکلیف وزیاں کے یہاں سے نکل گئے۔ العرائش کو وطّاسی سلطان محمّد الشیخ کے بیٹے مولائی النّاصر نے

دوبارہ لے لیا - الوزّان الزیاتی Leo Africanus نے اس شہر کے سولھویں صدی عیسوی کے شروع کے حالات بیان کیے ہیں - وہ لکھتا ہے کہ وہاں جِرّیث مچھلیوں (eels) کی بہت بڑی تعداد پکڑی جاتی تھی، اور شکار بافراط موجود تھا؛ نیز لُکُّوس کے کناروں پر جنگل تھے جن میں وحشی جانور بکثرت ملتے تھے- وہاں کے باشندے لکڑی کا کوئلہ بناتے تھے، اور اسے ارزیلا اور طنجہ بھیجتے تھے، لیکن وہ ہمیشہ پرتگیزوں سے دہشت زدہ رہتے تھے جو اس علاقے پر برابر حملے کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ۱۵۰۴ء میں خود بندرگاہ پر بھی حملہ کیا - (۱۵۴۶ء میں ہسپانیہ والوں نے بھی قادس Cadiz سے بندرگاہ پر حملہ کیا، مگر ناکام رہے) - غیر محفوظ زندگی کے باوجود اس شہر کے باشندوں نے کسی حد تک بحری تجارت کا سلسلہ قائم رکھا، اس لیے کہ شمالی مرّاکش میں العرائش ہی وہ واحد بندرگاہ تھی جس پر عیسائیوں کا قبضہ نہیں تھا اور فاس سے تجارت کے مختلف راستوں میں سے ایک راستہ یہ بھی تھا جہاں سے (فاس) نسبۃً قریب تھا - پرتگیزوں کا ایک تجارتی ایجنٹ (Feitor) وہاں رہتا تھا، جینوآ کے تاجر یہاں باقاعدہ آتے جاتے تھے اور بندرگاہ کے دہانے پر ''جینوآ'' نام کا ایک قلعہ بھی تھا - اس کے بعد سے العرائش بحری ڈاکوؤں کا اڈّا بن گیا اور ۱۵۵۰ء میں پرتگیزوں کے وہاں سے انخلا کے بعد تو بحری ڈاکا زنی وہاں بہت ہی بڑھ گئی - ہسپانوی ساحل پر بحری ڈاکوؤں نے جو تباہی و بربادی پھیلائی تھی، وہی ۱۶۱۰ء میں العرائش پر فیلقوس (Philip) ثالث کے حملے کا محرّک ہوئی جس کا خاتمہ سَعْدی سلطان مولائی محمّد الشیخ سے ایک معاہدے پر ہوا - ۱۶۸۹ء میں اس شہر پر علوی سلطان مولائی اسمٰعیل نے دوبارہ قبضہ کر لیا اور بنو جَبالہ اور ریف کے بعض قبائل یہاں از سر نو آباد ہو گئے - اس تاریخ کے بعد سے ۱۹۱۱ء تک العرائش پر یورپی طاقتوں کے اقدامات گولہ باری یا سمندری راستے سے کم و بیش کامیاب حملوں تک محدود رہے - ۱۷۶۵ء میں فرانسیسی امیر البحر Du Chaffault نے وہاں بری طرح شکست کھائی - ۱۸۶۰ء میں ''ہسپانوی-مرّاکشی'' جنگ کے دوران میں العرائش پر ہسپانوی بحری بیڑے نے گولہ باری کی - ''مراکشی بحران'' کے دوران میں ۸ جون ۱۹۱۱ء کو ہسپانوی فوجیں العرائش میں اتر پڑیں اور ۱۹۵۲ء تک جب کہ مراکش کی آزادی کا اعلان ہوگیا، یہ شہر باقاعدہ ہسپانوی حلقۂ اثر میں رہا .

العرائش کے بالمقابل وادی لُکُّوس کے دوسرے کنارے پر شمّش پہاڑی پر Lixoz یا Lixus کے قرطاجنی شہر کے کھنڈر موجود ہیں، جہاں بہت سے آثار کھود کر نکالے گئے ہیں .

مآخذ : (۱) Leo Africanus, *Description de l' Afrique*، طبع Schefer، پیرس ۱۸۹۷ء، ۲ : ۲۱۵ تا ۲۱۹ ؛ (۲) León Galindo y de Vera : *Historia, vicisitudes y politica tradicional de España respecto de sus posesiones en las costas de Africa*، میڈرڈ ۱۸۸۴ء، ص ۲۲۴ تا ۲۸۴ (باحتیاط استعمال کرنا چاہیے) ؛ (۳) Eugéne Aubin : *Le Maroc d' aujourd' hui*، طبع ششم، پیرس ۱۹۱۰ء، ص ۸۹ تا ۹۵؛ (۴) Maximiliano Alarcón y Santón : *Textos àrabes en dialecto vulgar de Larache*، میڈرڈ ۱۹۱۳ء؛ (۵) Real Sociedad Espanola de Historia Natural، *Yebala y el bajo Lucus*، میڈرڈ ۱۹۱۴ء، ص ۴۴ تا ۵۱، ۲۸۷ ؛ (۶) *Relato de la expedicion de Larache*

(1765) por Bidé de Maur ville، فرانسیسی ایڈیشن سے ترجمہ شدہ، ایمسٹرڈم ۱۷۷۵ء، و "طنجہ ــ العرائش" ۱۹۴۰ء (Du Chaffault کی مہم کے بارے میں)؛ (۷) Tomās Garcia Figueras : *Miscelánea de estudios africanos*، العرائش ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء، ص ۱۰۹ تا ۱۴۷؛ *La Graciosa* کے لیے دیکھیے ماخذ تحت *Les sources inédites de l' histoire du Maroc*، پر تکال ج ۱، پیرس ۱۹۳۴ء، ج ۱۵ (حاشیہ ۳ از Pierre de Cenival) اس کے ساتھ شامل کر لیا جائے - Tomās Garcia Figueras : *Miscelānea de estudios varios sobre Marruecos*، تطوان ۱۹۵۳ء، ص ۷ تا ۳۳ - اعداد و شمار، کے متعلق معلومات "Delegación de Asuntos Indígenas" نے تطوان میں مہیا کی ہیں - Lixus کے لیے دیکھیے Jérôme varcopino : *Le Maroc antique*، پیرس ۱۹۴۸ء، مواضع کثیرہ، بالخصوص ص ۴۹ تا ۵۶، ۶۶ تا ۷۲، ۸۵ تا ۱۰۵، ۳۰۸، ۳۰۹؛ (۸) Pierre Cintas : *Contribution a l' etude del' expansion Carthaginoise au Maroc*، پیرس بلا تاریخ (۱۹۵۴ء)، ص ۶۰ تا ۶۶؛ اور وہ ماخذ؛ (۹) جو *Congreso arqueológico del Marruecos español*، تطوان ۱۹۵۴ء، ص ۴۶۹ تا ۴۷۲، ۴۷۴ تا ۴۷۵، میں دیے گئے ہیں .

[G. Yver - (R. Ricard)]

* **(جزیرۃ) العرب** : جزیرہ نمائے عرب کو اہلِ عرب عموماً جزیرۃ العرب کے نام سے یاد کرتے ہیں .

(۱) تمہید؛ (۲) طبیعی ساخت اور بڑی بڑی جغرافیائی خصوصیات؛ (۳) آب و ہوا ، پانی کا بہاؤ اور وسائل آب؛ (۴) سیاسی تقسیم؛ (۵) نباتات و حیوانات؛ (۶) نسلیات؛ (۷) تاریخ : (الف) زمانۂ قبل از اسلام؛ (ب) اسلامی قرون وسطٰی؛ (ج) جدید عرب کی تشکیل ــ دسویں / سولھویں صدی سے لے کر آج تک .

(۱) تمہید :

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ جزیرہ‌نمائے عرب اقوام کا اصلی گہوارہ نہ ہو، تاہم یہ لوگ وہاں ہزاروں سال سے آباد چلے آتے ہیں اور اسے ایک مخصوص مفہوم میں اپنا وطن سمجھتے ہیں - اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مغربی عرب کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، اس لیے کہ یہی وہ سر زمین ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پیدا ہوئے، جہاں آپؐ نے زندگی گزاری اور جہاں آپؐ نے وفات پائی - یہیں آپؐ پر اللہ تعالٰی کی جانب سے وحی نازل ہوئی اور یہیں ہر سال دنیائے اسلام کے سب حصوں سے ہزاروں مسلمان مکّے میں حج بیت اللہ اور مدینۂ منوّرہ میں مسجد نبوی اور روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے آتے ہیں .

اس جزیرہ نما کی شکل ایک بے قاعدہ چوکور کی سی ہے جس کا طول شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۲۲۰۰ کیلومیٹر اور عرض تخمیناً ۱۲۰۰ کیلومیٹر ہے - اس چوکور کے توازن میں عمان کا وہ آگے نکلا ہوا خطہ خلل انداز ہوتا ہے جو ایران کے ساحل کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے - مغرب، جنوب اور مشرق میں جزیرہ نمائے عرب کی حدبندی بہت واضح طور پر بحیرۂ احمر خلیج عدن، بحیرۂ عرب، خلیج عمان، اور خلیج فارس سے ہوتی ہے - شمال میں خود عربوں کے ہاں اس بارے میں اکثر اختلاف رہا ہے کہ عرب کہاں ختم ہوتا ہے اور شام (وسیع معنوں میں) کہاں سے شروع ہوتا ہے - شمال کی طرف نُفُود کے صحرائے اعظم سے ایک وسیع ہموار چٹیل میدان پھیلا ہوا ہے جس میں کوئی ایسا طبعی خطّ و خال نہیں ہے جسے جزیرہ نما کی حد قرار دیا جا سکے - اس مقالے کے مقاصد کے لیے جزیرہ‌نما

کو صرف ان سرحدوں تک پھیلا ہوا مانا گیا ہے جو سعودی عرب اور کویت کو اُردُن اور عراق سے جدا کرتی ہیں، اگرچہ یہ سرحدیں محض مصنوعی سیاسی تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں - اس تعین کی رو سے جزیرہ‌نما کا انتہائی شمالی نقطہ عُنازہ قرار پاتا ہے، یعنی وہ نیچی سطح مرتفع جو یروشلم یا عمّان دونوں سے دور تر شمال میں واقع ہے۔ عُنازہ سے سعودی عرب اور اُردُن کی درمیانی سرحدیں، جن پر ابھی تک پورا اتفاق رائے نہیں ہوا، خلیج عقبہ کے سرے کے قریب سمندر تک چلی جاتی ہیں، بحالے کہ ایک طرف سعودی عرب اور کویت کی درمیانی سرحدیں اور دوسری طرف سعودی عرب اور عراق کی درمیانی سرحدیں بصرے کے جنوب میں خلیج فارس کے سرے تک چلی گئی ہیں۔ ان مشرقی سرحدوں کے ساتھ ساتھ دو چھوٹے چھوٹے غیر جانبدار خطّے ہیں جن میں سے ایک میں سعودی عرب اور عراق کو اور دوسرے میں سعودی عرب اور کُوَیت کو غیر منقسم مساوی حقوق حاصل ہیں۔

عرب کے باشندوں کی تعداد کا کوئی قیاسی اور قابل اعتماد اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ وہ تمام اعداد جو حوالوں کی کتابوں میں ملتے ہیں انتہائی مشتبہ ہیں، اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح حساب و شمار یا پورے جزیرہ نما سے کافی واقفیت پر مبنی نہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کئی وسیع علاقے محض منتشر خانہ‌بدوشوں سے آباد ہیں اور بیشتر اقامت پذیر علاقوں میں بھی آبادی مقابلۃً کم گنجان ہے، بہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مجموعی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے یا نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ اس تعداد سے کئی ملین کم ہو۔ سب سے زیادہ گنجان آباد ملک یمن ہے۔ سعودی عرب میں آبادی کے بڑے مرکز الحجاز کے چند شہروں، عسیر اور تہامہ کے شاداب پہاڑوں اور میدانوں، نجد کی بعض وادیوں اور الحسا و القطیف کے مشرقی نخلستانوں میں ہیں۔ حضرموت اور عمان دونوں میں متعدد شہر ہیں جن میں بدوی قبائل آباد ہیں۔

موجودہ علم کی کیفیت: عرب کے باشندوں کو قدرتی طور پر اپنے ملک کے بارے میں بہت کچھ علم رہا ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک کا علم کسی خاص علاقے تک محدود ہے اور اس طرح اسے مخصوص و مفصل کہا جا سکتا ہے، نہ کہ عام اور جامع۔ عربی کی کسی ایک کتاب میں بھی عرب کا مکمل اور صحیح بیان موجود نہیں ہے اس زبان میں ابھی تک بہترین کتاب الہمدانی (م - ۳۳۴ھ/۹۵۴ - ۹۴۶ء) کی صفۃ جزیرۃ العرب ہے جو اگرچہ بیش بہا معلومات کی حامل ہے، تاہم پورے جزیرہ نما کا کوئی مجتمع اور مربوط و مسلسل منظر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عرب کے سنجیدہ سائنسی اکتشاف کا آغاز کارسٹن نیبور Carsten Niebuhr اور ۱۷۶۲ء کی ڈنمارک کی مہم سے ہوا۔ اگرچہ مختلف اقوام کے سیاح انیسویں صدی کے دوران میں اندرون ملک تک رسائی میں منہمک رہے، لیکن حکومت ہند کے برطانوی افسروں نے اس کے اردگرد کے سمندروں اور ساحل کے بعض حصوں کے اصطلاحی جائزے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اندرون ملک کے اصطلاحی جائزے کو بیسویں صدی تک انتظار کرنا پڑا جب کہ اس کی ابتدا یمن کی جنوبی سرحد کی چھان بین اور حجاز ریلوے کے لیے ابتدائی مطالبات سے ہوئی۔ حالیہ سالوں میں تیل کی شرکتوں (کمپنیوں) نے مشرقی عرب کے بڑے بڑے حصوں کا جائزہ لیا ہے اور اس کام کے لیے انھوں نے نہایت عمدہ قسم کے ارضیاتی اور ''ارضی-طبیعیاتی'' اکتشافی طریقوں کو

استعمال کیا ہے اور اس کے علاوہ دیگر علاقوں کا بھی وسیع پیمانے پر جائزہ لیا ہے۔

۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء تک مغرب اور عرب سیاحوں نے عملاً دور دراز کے سب علاقوں کی سیاحت کر لی تھی اور اس طرح ملک کی سطح سے متعلق کوئی ایسا بڑا معما باقی نہ رہا تھا جو حل نہ ہو گیا ہو، تاہم ان سیاحوں کے بیانات اکثر نامکمل اور بعض اوقات غیر صحیح ہوتے ہیں اور اس وقت جو بیانات موجود ہیں ان کی تفتیش اور انہیں ربط دینے کا بہت سا کام باقی ہے۔ کئی اہم بیانات ابھی تک شائع بھی نہیں ہوے یا محافظخانوں میں دبے پڑے ہیں۔

زمانۂ حال میں نقشہ کشی میں، ایک ناگزیر عمل کی حیثیت سے، فضا میں سے عکسی تصاویر لینے کا دستور بھی رائج ہوگیا ہے، چنانچہ ۱۹۵۴ء تک جزیرہ نما کے ایک خاصے بڑے حصے کی تصویریں لی جا چکی تھیں اور ان کے بعض نتائج کو نقشوں میں منتقل کیا جا چکا تھا، لیکن فضا میں سے لی گئی تصاویر کا پورا فائدہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تائید زمینی ربط و ضبط سے کی جائے، یعنی زمین پر ایسے معیّنہ نقطے قائم کیے جائیں جن کا ان تصویروں سے تعلق بالکل صحیح طور پر معلوم ہو۔ عرب کے بیشتر حصے کے لیے اب تک اس نوعیت کا ربط و ضبط مفقود ہے۔

جہاں تک عرب کے نقشے کا تعلق ہے اس کا عام خاکہ اور اس کے بڑے بڑے خط و خال اب خاصی اچھی طرح اور بعض صورتوں میں بہت اعلیٰ اور قابل اعتماد طریقے پر معیّن کیے جا چکے ہیں، لیکن اس میں تمام جزئیات بھرنے کے لیے ابھی کئی سال کا مطالعہ درکار ہے۔ قدیم تر زمانے میں جو جائزے لیے گئے تھے، مثلاً خلیج فارس میں، ان پر زیادہ جامعیت اور زیادہ صحت کے پیش نظر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ گزشتہ زمانے کی غلطیاں، جن میں سے بہت سی نقشوں میں جگہ پا گئی تھیں، اب دور کی جا رہی ہیں، لیکن یہ عمل دقت اور دیر طلب ہے۔

عرب حکومتیں اب اپنے ملکوں کے بارے میں اپنی سرکاری اشاعتوں میں جن کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، ضروری معلومات فراہم کر رہی ہیں اور جدید عرب مصنفین جزیرہ نما کے مختلف حصوں کے بارے میں کتابیں اور مقالے لکھنے میں برابر مصروف ہیں۔ بعض ایسی متفرق چیزوں، مثلاً تیل اور جنوبی عرب کے قدیم آثار میں دل چسپی کے باعث یورپی مصنفین کی جانب سے بھی مطلوبہ مواد کا ایک بڑا سیلاب امنڈ آیا ہے جس کا ایک حصہ تو درست ہے، لیکن بہت سا سطحی، گمراہ کن اور حقیقت کے صریحًا خلاف ہے۔ عربی مآخذ بھی اسی طرح ناقابل اعتماد ہیں، لہٰذا عرب کا مطالعہ کرنے والے کو اپنے راستے میں جگہ جگہ لغزش کے مقامات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۲) طبیعی ساخت اور نمایاں جغرافیائی خصوصیات:

عرب جو ایشیا اور افریقہ کے درمیان واقع ہے، اتنا بڑا اور اپنی خصوصیات میں اس حد تک منفرد ہے کہ اگر اسے ایک برصغیر قرار دیا جائے تو جائز ہوگا۔ اسے بالعموم ایشیا کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سینا کے ذریعے، جو اگرچہ سیاسی طور پر مصر کا ایک جزو ہے، تاہم اپنے طبیعی ماحول اور اپنی انسانی زندگی کی نوعیت کے لحاظ سے عرب سے قریب تر ہے، یہ افریقہ سے بھی ملا ہوا ہے۔ پہاڑیوں کے وجود میں آنے سے قبل یہ وادیاں بحرۂ احمر کا، حصّہ تھیں۔ اس طرح مغربی عرب براعظم افریقہ کا جز تھا چنانچہ مغربی عرب کے جنوبی نصف میں ابھی تک کئی باتوں میں صومالیا۔ ایتھوپیا سے،

بہ نسبت شمالی عرب یا باقی ماندہ ایشیا کے، زیادہ مماثلت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس شمالی عرب، بادیۃ الشام کے ذریعے ایشیائی عرب میں غیر محسوس طریقے پر ضم ہوگیا ہے، اور عمان کے آگے کو نکلے ہوے خطّے میں ایک ایسا پہاڑی علاقہ موجود ہے جو ایران کے کوہستانی سلسلوں سے بہت قریبی مشابہت رکھتا ہے۔

ارضی ساخت کے اعتبار سے جزیرہ نماے عرب کے دو بڑے حصّے ہیں: مغرب میں آتش فشاں اور تبدیل شدہ ہیئت کی چٹانوں والا ڈھال نما علاقہ اور زمانۂ حال کے دُردی علاقے جو اس ڈھال نما علاقے سے ہٹ کر شمال مشرق، مشرق اور جنوب مشرق کی سمت نیچے ہوتے ہوے اس وسیع طاس میں جا ملتے ہیں جو عراق عرب، خلیج فارسی اور الرّبع الخالی کے مشرقی حصّے پر مشتمل ہے۔ عرب کا یہ ڈھال نما علاقہ در حقیقت عرب۔نوبہ ڈھال کا محض مشرقی حصّہ ہے جو تہ زمینی چٹانوں — سبز پتھر، پرت‌دار پتھر، ابرق، وغیرہ — کا ایک بہت بڑا تودہ ہے جو اوپر کو ابھر آئی ہیں اور جن سے دشوارگزار اور چٹیل پہاڑ بن گئے ہیں۔ یہ پورا تودہ ان کٹی پھٹی وادیوں کے ذریعے جو بحر مُردار سے جنوب کی سمت اور البحرالاحمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہیں، دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے عربی حصّے کی قدیم تر چٹانیں ابتدائی زیادہ پرانے عہد کی آتشیں سرگرمی کی نشان‌دہی کرتی ہیں، بحالیکہ زیادہ زمانۂ حال کے آتش فشاں پہاڑوں نے اپنے گرد و پیش کے علاقوں میں برکانی میدانوں (حَرّة، جمع: حَرّات) کی ایک چادر بچھا دی ہے جو اکثر خاصے وسیع و عریض ہیں۔ برکانی اور متغیر ہیئت کی چٹانوں کے یہ خطے ممکنؔ ہے کہ معدنیات اور قیمتی پتھروں سے مالا مال ہوں، لیکن عرب میں اب تک یہ چیزیں بہت تھوڑی مقدار میں دریافت ہوئی ہیں۔

شمال اور جنوب کی سمت میں عرب کے اس ڈھال نما علاقے کی مشرقی حد بحراحمر سے اندرون ملک میں زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔ ان دونوں سروں کے درمیان یہ حد ایک بھدّے سے ابھار کی شکل میں آگے چلی گئی ہے یہاں تک کہ دوادیمی کے نزدیک پہنچ جاتی ہے، جو طُوَیق کی مغربی سد کے مغرب میں ۲۰۰ کیلومیٹر سے کم فاصلے پر واقع ہے۔ یمن کے پہاڑ جن کی ارضیاتی ساخت بہت مخلوط قسم کی ہے، اگرچہ انہیں سے ملتی جلتی چٹانوں سے بنے ہیں، تاہم طبیعیاتی شکل و صورت کے اعتبار سے باقی ماندہ ڈھال سے بہت مختلف ہیں۔ یمن میں نیز ان پہاڑوں میں بھی جو جنوبی ساحل کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں اور عمان کے آگے کو نکلے ہوے خطّے میں واقع ہیں، آتش فشاں علاقے پائے جاتے ہیں۔

اُن پہاڑوں کی وادیاں جو بحراحمر کے متوازی چلے گئے ہیں، مغرب کی سمت ایک دم نیچی ہوتی ہوئی تہامہ کے ساحلی میدان سے جا ملتی ہیں۔ خلیج فارس کی جانب جو ہلکی سی مشرقی ڈھلان ہے اس کے بیچ بیچ میں نجدکی پہاڑیاں، مثلاً طُوَیق اور العَرَمہ، آ جاتی ہیں جن کی سیدھی ڈھلانوں کا رخ مغرب کی سمت ہے اور جن کی پشتوں سے ڈھلان دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔ حضرموت اور ظُفار کی سطح مرتفع سے جنوب کی طرف جو ڈھلان خلیج عدن اور بحرالعرب تک جاتی ہے وہ چھوٹی سی ہے، لیکن شمال کی جانب ایک زیادہ لمبی ڈھلان الرُّبْع الخالی تک جاتی ہے۔ سطح مرتفع عمان میں ایک مختصر سی ڈھلان شمال مشرق کی سمت

خلیج عمان تک جاتی ہے اور جنوب مغرب کی جانب اس سے ایک بہت زیادہ لمبی ڈھلان اسی ریتلے سمندر تک چلی گئی ہے، اگرچہ یہاں جو پہاڑ ہیں وہ ساحل کے قریب کے دوسرے پہاڑوں کے برخلاف دونوں طرف سے سیدھے بلند ہیں جن سے ایک خنزیر پشت سلسلہ بن گیا ہے۔

دُردی علاقے میں زیادہ تر چونے کا پتھر ہے اور اس کے ساتھ بھربھرے پتھر اور نرم سلیٹی پتھر (Slate) بافراط ہیں۔ یہ چٹانیں ان تلچھٹوں سے بنی ہیں جنھیں ان سمندروں کا پانی پیچھے چھوڑ گیا تھا، جو بہت قدیم زمانے میں عرب کے ڈھال نما علاقے تک پھیلے ہوئے تھے۔ خلیج فارس کے قرب و جوار میں ان تلچھٹی تہوں کی گہرائی کئی کیلومیٹر ہے۔ ان پودوں اور جانوروں کا نامیاتی مادّہ جو ان قدیم سمندروں میں رہتے تھے پٹرولیم کے ان بڑے بڑے ذخائر کا منبع ہے جو بیسویں صدی میں مشرقی عرب میں دریافت ہوئے ہیں۔

جزائر۔ اگر بحرۂ احمر میں شمال سے جنوب کی سمت جائیں تو ان جزیروں، ٹاپوؤں اور مونگے کی چٹانوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو ساحل عرب سے ذرا فاصلے پر واقع ہیں۔ سطح مرتفع فَرسان تقریباً ۵۰۰ کیلومیٹر تک ساحل کے متوازی چلا گیا ہے اور اس کے جنوبی حصے میں فرسان [رأس بان] کا مجمع الجزائر ہے جس میں بحیرۂ احمر کے مشرقی کنارے کے سب سے بڑے جزیرے پائے جاتے ہیں۔ جزیرۂ کامران [رأس بان] یمن کے ساحل کے قریب واقع ہے۔ کامران کے مغرب میں جبل الطّیر کی جو آتش فشاں چوٹی گہرے سمندر میں ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سے انیسویں صدی تک دھواں اور سیّال مادّہ نکلتا تھا۔ گہرے سمندر ہی میں الزُّقُر ہے جو بحیرۂ احمر کا بلند ترین جزیرہ ہے (تقریباً ۷۰۰ میٹر) مَیّون (Perim) کا جزیرہ جو بحیرۂ احمر کے مدخل یعنی آبنائے باب المَنْدَب میں واقع ہے، افریقہ کی بہ نسبت عرب سے زیادہ قریب ہے۔

جزیرۂ سُقُطْرٰی [رأس بان] کو، جو ۱۱۰ کیلومیٹر لمبا ہے اور عرب سے ۴۰۰ کیلومیٹر دور خلیج عدن کے مدخل پر واقع ہے، سیاسی اور نسلی دونوں وجوہ سے جزیرہ نما کا حصّہ سمجھنا ضروری ہے۔ کُوریا مُوریا نامی جزیرے رأس نَوس کے مشرق میں عرب کے ساحل سے ذرا دور ایک بڑی خلیج میں واقع ہیں۔ اس مجمع کا عربی نام خُوریان مُوریان [illegible] آج کل شاذ و نادر استعمال ہوتا ہے، بلکہ زیادہ مانوس نام الحَلّانیّہ، الحاسکیّہ اور السّوداء ہیں جو در اصل الگ الگ جزیروں کے نام ہیں۔ عمان سے ایک تنگ رودبار کے ذریعے ہٹا ہوا جزیرہ مَصِیْرہ ہے جو پورے جنوبی ساحل کے ساتھ وسیع رقبے کا واحد جزیرہ ہے۔ خلیج عمان کا عربی ساحل بھی ایسے جزیروں سے تقریباً خالی ہے جو جزیرے کہلانے کے مستحق ہوں۔ ہمیں صرف چٹانی ٹاپو ملتے ہیں جو یا تو الگ الگ واقع ہیں، جیسے الفَحل جو مسقط کے شمال مغرب میں ہے، یا جھرمٹوں کی شکل میں، جیسے دَیمانیات جو مغرب میں ذرا فاصلے پر ہیں۔

عمان کے پہاڑ آبنائے ہُرمز پر جو خلیج فارس کا مدخل ہے، ایک دم ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی بعض چوٹیاں بڑے سلسلے سے الگ ہو کر ناملایم و غیرہموار جزیروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن میں سے ایک کا شمالی سرا رأس مُسَنْدَم ہے۔ ابو موسیٰ نامی جزیرے میں جو خلیج فارس میں الشّارقہ کی بندرگاہ کے شمال مغرب میں واقع ہے، آئرن آکسائڈ کے ذخائر موجود ہیں جو تجارتی

اغراض کے لیے کام آتے ہیں۔ خلیج کے سب سے جنوبی ساحل کے نزدیک چند ریتلے جزیرے ہیں جن میں سب سے بڑا مُقَیْشط ہے (جسے اکثر نقشوں میں ابا الاَبْیض لکھا جاتا ہے جو در اصل اس کے شمالی حصّے کا نام ہے)۔ عمان کے (Trucial) آبنائے قطر کے درمیان میں جو لنگرگاہ ہے، اس کے مغربی نصف میں کئی جزیرے ہیں جن کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ نمک کے گنبد ہیں جو سطح سمندر کے اوپر نکل آئے ہیں۔ ان میں صِیْر بنی یاس، دَلْمَاء، زَرَکُوہ، داس اور حالول شامل ہیں۔ بحرین (البحرین) کے بڑے جزیرے کے ساتھ کئی منتشر ٹاپو ہیں اور حَوار نامی ایک ذرا بڑا جزیرہ بھی ہے جو قطر کی سرحد کے بہت قریب ہے۔ تاروت، ابوعلی اور بعض دیگر جزائر سعودی عرب کے ساحل سے متصل ہیں، بحالیکہ جزائر العربیّہ [رَکّ بآن] اور الفارسیّہ [رکّ بآن] ذرا فاصلے پر خلیج فارس کے وسط میں ہیں۔

موتیوں کے بڑے پشتے (حیرْ، جمع: حَیرات) جزیرۃ العرب کی جانب خلیج فارس کی تقریباً پوری لمبائی کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوے ہیں اور ان میں سے زیادہ مالدار پشتے مرکزی حصّے میں ہیں۔ اس خلیج میں ریف reef کے لیے شَعْب کی اصطلاح مستعمل نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ قَشْت (جمع قُشُوت)، نَجْوہ اور قَطْعہ کے نام رائج ہیں۔ حدّ (جمع حُدود) ریت کے پشتے کو کہتے ہیں، حالہ (جمع حُوَل) کسی نشیبی ریتیلے ٹاپو کو کہا جاتا ہے جو مدّ آب بلندی پر ہونے کے وقت پانی سے ڈھک سکتا ہے اور قَصّار سے مراد ایک آگے کو نکلی ہوئی چٹان ہے۔ پایاب پانی کے لیے عام اصطلاح رَقّ ہے، بحالیکہ گہرے پانی — ۱۵ فیدم fathom (باع، جمع اَبْواع یا بِیْعان، لیکن عربی فیدم انگریزی فیدم سے جو چھے فٹ کا ہوتا ہے، ذرا چھوٹا ہوتا ہے) کے کسی رقبے کو غُبّہ (جمع غُبیب) کہتے ہیں۔ خلیج فارس ایک کم گہرا سمندر ہے جس کی گہرائی بہت کم جگہوں پر نوے میٹر سے زائد ہے، برعکس بحیرۂ احمر کے جس کی گہرائی کہیں کہیں دو ہزار میٹر سے بھی زیادہ ہے۔

خلیجیں اور سواحل: جزیرہ نماے عرب کے ساحلوں میں جو تین طرف سے سمندر کے سامنے ہیں نسبۃً کوئی بڑے موڑ یا کٹاؤ نہیں پائے جاتے۔ کرۂ زمین کی سطح پر کوئی اور اتنا بڑا علاقہ نہیں ہے جس میں جہازوں کے لیے پناہ گاہوں کی اتنی قلّت ہو۔ بحیرۂ احمر میں عرب کی سمت معدودے چند بڑی خلیجیں ہیں، لیکن اس قسم کی چھوٹی چھوٹی خلیجیں جنھیں شَرْم کہتے ہیں، بہت سی ہیں جو اندرون ملک تک چلی گئی ہیں اور پھر چوڑی ہو کر جھیلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن میں چھوٹے بادبانی جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں۔ جنوبی ساحل پر واحد قدرتی اور اچھی بندرگاہ عَدَن ہے۔ رأس فرْتَک اور رأس الحدّ کے درمیان دو بڑی خلیجیں ہیں، جنھیں یہاں غُبّہ کہتے ہیں (دیکھیے اس اصطلاح کا استعمال خلیج فارس میں جو اوپر مذکور ہے)، لیکن یہ سب اس طرح سمندر کی زد میں ہیں کہ ان سے کوئی حفاظت نہیں ملتی۔ مسقط جو خلیج عمان پر واقع ہے البتہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک ایسی بڑی خلیج ہے جس میں درمیانی حجم کے دخانی جہاز لنگر انداز ہیں۔ مُسَنْدَم کے نزدیک چٹانوں سے محصور خلیجوں میں بہت عمدہ بندرگاہیں موجود ہیں، لیکن وہ اتنی گرم اور اندرون ملک سے اس قدر دور ہیں کہ ان تک رسائی نہیں ہو سکتی اور ان سے کبھی زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ خلیج فارس کے عربی ساحل کی چھوٹی خلیجیں خَوْر کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، اگرچہ یہ اصطلاح

یہاں کسی زیر آب وادی کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ان خلیجوں کی ایک بہترین مثال خَورُالعُدَید ہے جو جزیرہنمائے قَطَر کے دامن کے مشرقی پہلو میں ساحل کے اندر چلی گئی ہے۔

پہاڑ، سطح مرتفع اور میدان: خلیج العَقبہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے متوازی کوہستانی سلسلے کو مجموعی طور پر السَّراۃ [رَکّ بہ سَرَاۃ] کہتے ہیں، اگرچہ اس نام کا استعمال زیادہ عام نہیں ہے۔ بہت سی جگہوں پر کوئی زیادہ نیچا سلسلہ ساحل کے بالکل نزدیک واقع ہے اور کسی زیادہ اونچے سلسلے سے جو زیادہ اندرون ملک میں واقع ہے ایک سطح مرتفع کے ذریعے جدا ہو گیا ہے۔ السَّراۃ کی اوسط بلندی دو ہزار میٹر سے خاصی کم ہے۔ مَدْیَن کے علاقے اور مکّے کے مابین صرف مشہور رَضْوٰی [رَکّ بآن] نامی پہاڑیاں جو مدینے کے مغرب میں ہیں اور چند دیگر پہاڑ قابل ذکر بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔ مکّے کے جنوب مشرق میں کئی چوٹیاں ڈھائی ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہیں اور اس کے بعد یہ سلسلہ جنوبی عَسیر اور یمن میں اپنی سب سے زیادہ بلندی کو پہنچ جاتا ہے (حَضُور شُعَیب، صَنْعاء کے مغرب میں، تقریباً ۳۷۶۰ میٹر)۔ مغربی ڈھلانیں جو زیادہ سیدھی ہیں بالعموم بلند تر ہیں، لیکن اندرونی مشرقی ڈھلانوں میں بھی متعدّد بلند مقامات پائے جاتے ہیں۔ سلسلۂ حَضُن نے، جو مکّے کے مشرق میں ہے اور جسے الحجاز اور نجد کے درمیان تاریخی حد مانا جاتا رہا ہے، عوامی ذہنوں میں اپنا یہ امتیاز بظاہر کھودیا ہے، اگرچہ یہ بھی مشرقی ڈھلانوں یا السَّراۃ کی دامنی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ خط فاصل متصور ہوتا ہے۔ السَّراۃ میں سے جو درّے گزرتے ہیں، جنھیں عسیر میں عَقَبہ اور یمن میں نَقِیل کہتے ہیں، تعداد میں کم اور ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں اور عموما دشوار گزار ہیں۔ اس سلسلے میں قابل ذکر وہ درّے ہیں جن میں سے مکّے اور مدینے کو راستہ جاتا ہے۔

پہاڑوں کے بیچ بیچ میں اور اکثر ان کی مشرقی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ کئی ایک سطح مرتفع ہیں جن میں سے زرخیز ترین وہ ہیں جو عسیر میں ہیں اور وہ جو یمن میں صنعاء اور ذمار کے ارد گرد واقع ہیں اور ان پر اکثر آتشیں مادّے کی تہ جمی ہوتی ہے اور یہ مادّہ بعض مغربی ڈھلانوں سے بہ کر بحیرۂ احمر کے کنارے تک پہنچ گیا ہے۔

یمن کے پہاڑ جنوب کے رخ سیدھے اوپر چلے گئے ہیں اور ان کا مشرقی علاقہ الکَوْر ہے جس کا نام مغرب میں آباد کَوْر العَوَلِق اور مشرق میں مقیم کَوْرالعوالق کے مقامی قبیلوں کے نام پر ہے۔ کَوْرالعَوالِق کے شمال مشرق میں الجَول کی بہت کٹی پٹی چونے کی سطح مرتفع ہے جسے وادی حضرموت نامی ندی جو مشرق کی سمت بہتی ہے دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ الجَول کا جنوبی حصّہ تقریباً دوہزار میٹر کی بلندی تک پہنچ جاتا ہے بحالیکہ شمالی حصّے کی بلند تر سطحیں بھی ایک ہزار میٹر سے زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ الجَول کے کنارے کنارے جو پہاڑی چوٹیاں ہیں وہ اکثر اس قدر سیدھی چلی گئی ہیں کہ دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔

دور مشرق کی جانب ظُفار کے علاقے میں قَرَہ قبیلے کے پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں پندرہسو میٹر سے خاصی اونچی ہیں۔ اس کوہستانی سلسلے میں درختوں اور گھاس کی اتنی کثرت ہے کہ یہاں کے باشندے اسے اکثر جَبَل اَسْود (=کالا پہاڑ کہتے ہیں۔ رأس النَّوس کے شمال مشرق میں وہ پہاڑ جو ساحل سمندر کے متوازی چلے گئے ہیں حَجْم

اور تعداد میں گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور رأس صَوقرہ سے لے کر رأس الحدّ تک کے ساحل کی پشت پر بالعموم نشیبی علاقہ ہے۔

اس کے بعد پہاڑ پھر خلیج عمان پر سایہ فگن نظر آتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ الحَجَر کا سلسلہ رأس الحدّ سے رأس مُسَنْدَم تک چلا جاتا ہے۔ الحَجر کی سربلند چوٹیاں وسطی حصّے میں الجبل الاخضر کے نواح میں پائی جاتی ہیں جن میں سے سب سے اونچی ۳۰۰۰ میٹر سے ذرا ہی زیادہ بلند ہیں۔ الجبل الاخضر کے شمال مغرب میں الکَوْر نامی پہاڑ بڑے سلسلے کا ایک حصّہ بن جاتے ہیں، بحالیکہ اس سلسلے کے شمالی نصف حصے کے مغرب میں جو کھلا علاقہ واقع ہے وہاں جبل حَفِیْت کی بلند نوکدار چوٹی واقع ہے۔

اندرون ملک میں الطُّبَیْق کا سلسلہ اُرْدُن اور سعودی عرب کے درمیان سرحدی علاقے میں واقع ہے۔ صحرائے نُفُود کے عین جنوب میں آجا [رکّ بآن] اور سَلْمیٰ کے متوازی سلسلے ہیں جو مل کر جبل شَمّر کہلاتے ہیں۔ النّیر کی پہاڑیاں عربی ڈھال نما علاقے کے وسطی ابھرے ہوئے حصے میں اس کے مشرقی سرے کے قریب واقع ہیں۔

ڈھال نما علاقے کے مشرق میں کم و بیش متوازی وادیوں کا ایک سلسلہ بلّوری ابھار کے ساتھ ساتھ شمال سے جنوب کو بل کھاتا ہوا چلا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں طُوَیق [رکّ بآن] ہے جسے نجدی ریڑھ کی ہڈی کہہ سکتے ہیں اور جس کی لمبائی خَشْم جَزْرہ سے خَشْم خَتْمہ تک، جہاں الرُّبْع الخالی کا ریگستان اس کے جنوبی سرے کو گھیر لیتا ہے، ۱۰۰۰ کیلومیٹر ہے۔ الدَّھْناء کے ریگستان کے عین مشرق میں الصُّمّان (کلاسیکی الصَّمّان، کی پست سنگلاخ سطح مرتفع ہے۔

سطوح مرتفعہ اور میدانوں کے اوپر جگہ جگہ چپٹی سطح کی اور منفرد پہاڑیاں، نیز تیغہائے کوہ یا تو الگ الگ اور یا گروہ در گروہ سر بلند ہیں۔ بدوی پتھریلی پہاڑیوں اور بڑے پہاڑوں دونوں کے لیے جَبَل کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور وہ دوسرے الفاظ جو عام طور پر مستعمل ہیں ضِلع (جمع ضُلُوع یا ضِلْعَان، جبل کا عام مرادف؛ یہ ضروری نہیں کہ وہ ضلع [پسلی] نما پہاڑی ہو، حَزْم (بالعموم جبل سے پست تر)، اَبْرَق (جمع: بُرقان، جس سے کویت کے تیل کے بڑے علاقے کا نام البُرْقان ماخوذ ہے)، اور بَرْقاء (جمع بُرَق) جن میں سے دو آخرالذکر کا اطلاق اُن پہاڑیوں پر ہوتا ہے جن کے پہلوؤں میں جگہ جگہ ریتلے علاقے ہوں۔ اندرون ملک پہاڑی ڈھلانوں سے جو راسیں آگے کو نکلی ہوئی ہیں انہیں خَشْم (جمع: خُشُوم) کلاسیکی خیشوم (جمع: خیاشیم) کہتے ہیں جس کے معنی ناک ہیں۔

عرب کی شمالی حد کے اندر الحَمّاد کا سب سے جنوبی حصّہ واقع ہے جو ایک پتھریلا میدان ہے اور شمال کی سمت چٹیل میدان سے جا ملا ہے، اور اس کے جنوب میں ایک اور پتھریلا میدان الحَجَرہ ہے۔ بڑے بڑے حدّباس۔ کنکر سے ڈھکے ہوئے میدانوں ۔ میں ایک جزیرہ نما کے شمال مشرقی گوشے میں واقع الدِبْدِبَہ ہے اور ابوبحر اور رَیْدہ ہیں جو دونوں الدَّھْناء کے جنوبی سرے کے جنوب میں واقع ہیں۔ الجَلَدہ کا میدان جو رَیْدہ کے جنوب مغرب میں ہے مکمّل طور پر الرُّبْع الخالی کے صحرا سے گھرا ہوا ہے۔ بعض اور میدان الرُّبْع الخالی کے جنوبی اور مشرقی کناروں کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں اور سب کے سب اُس طاس کی طرف ڈھلان اختیار کرتے گئے ہیں جہاں ریت ہی ریت ہے۔

مغرب اور جنوب کے میدان ایک خاصے تنگ

رقبے میں تقریباً ہر جگہ ان پہاڑوں سے گھرے ہوے ہیں جو آپس میں مل کر ساحل سمندر تک چلے گئے ہیں ۔ تہامہ [رکّ بآن] کو، جو البحرالاحمر کے کنارے کے ساحلی میدان کا عمومی نام ہے، بعض اوقات تہامَة الحجاز، تہامَةُ العَسیر اور تہامة الیمن میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ۔ خلیج عمان پر رأس الحدّ اور مسقط کے درمیان میدانوں کے محض دھندلے سے آثار پائے جاتے ہیں، مسقط اور شناس کے درمیان میدان پھیل کر البَاطِنَه [رکّ بآن] کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو عرب کے کھجور پیدا کرنے والے بڑے اضلاع میں سے ایک ہے ۔ نمک کے گڑھے (Saltpans) بالخصوص خلیج فارس کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتے ہیں اور اس خطے کی اکثر نشیبی زمین ریتلی ہے ۔

ریگستانی صحرا : ریت کے ٹیلے ستارے، گنبد یا ہلال کی شکل کے ہو سکتے ہیں (ہلال نما یا (Barchans) ٹیلا = مُحَوّی، جمع مُحَاوی) ۔ جو ٹیلے نباتات سے معرّا ہیں انہیں طُعُوس (واحد: طِعْس، غالباً کلاسیکی لفظ دِعْس سے) کہتے اور ان میں سے زیادہ بڑوں کے لیے نقا (جمع: نِقْیان) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے ۔ ریت کے تودے طویل اکہری یا متوازی رگیں (عِرْق؛ جمع: عُرُوق) اور بعض اوقات پیچیدہ اشکال بھی بنا سکتے ہیں جن کے نیچے اکثر کوئی نہ کوئی باقاعدہ شکل نظر آتی ہے ۔ زمین کے بڑے بڑے خطّوں پر متحرک ریت کی مقابلةً پتلی پتلی چادریں بچھی ہوئی ہیں ۔ مُحَوّی (Barchane) قسم کے ٹیلے تقریباً ایک میٹر سے لے کر تقریباً ۲۰۰ میٹر کی بلندی کے پائے جاتے ہیں اور ان میں سے سب سے بڑے کئی کیلومیٹر یا زائد لمبائی کے ہیں ۔ تقریباً سب کے سب ٹیلے خالص ریت سے بنے ہیں اور ان میں پتھروں یا کسی اور چیز کی آمیزش نہیں ہے ۔ خود ریت کا رنگ اور اس کی ساخت ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف ہے، اگرچہ اندرون ملک میں غالب رنگ سرخی مائل ہے ۔

کسی ریتلے علاقے کو شمال میں بالعموم نَفُوْد (جمع قلّت: نَفَائد، جمع کثرت: نِفْد) کہتے ہیں اور جنوب میں رَمْلَه (جمع: رِمال) ۔ اصطلاح عِرْق کا اطلاق اس پورے علاقے پر بھی ہو سکتا ہے جس میں متعدّد عُروق ہوں، جیسے مثلاً عِرْق المَظْہُور میں سات بڑی رگیں شامل ہیں ۔ عربوں کے ہاں یہ اکثر ہوتا ہے کہ ان اسماے نکرہ کو اسماے معرفہ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو ان کی اقسام کی سب سے زیادہ قابل ذکر مثالوں کے لیے استعمال ہونے لگتے ہیں : مثلاً وہ صحرا جس سے اہل یورپ Great Nafud کے نام سے واقف ہیں اسے عرب محض النَّفُوْد کہتے ہیں، وہ سارا جنوبی ریگستان جسے اہل یورپ الرُّبع الخالی کہتے ہیں عربوں کے ہاں عام طور پر محض الرَّمْلَه کہلاتا ہے، بحالیکہ العُرَیق قطر کے جنوب میں واقع ایک صحرا کا نام ہے ۔

تقریباً سب کے سب ریگستانی صحرا دُردی (یا رسوبی) علاقے میں واقع ہیں جہاں وہ بلّوری ڈھال نما علاقے کے مرکزی ابھرے ہوے حصّے کے گرد اسی طرح بل کھاتے چلے گئے ہیں جیسے کہ وادیاں (cuestas)، جس کے مغربی دامنوں میں ان میں سے بہت سی واقع ہیں ۔ ان میں دو صحرا سب سے بڑے ہیں : النفود [رکّ بآن]، اور الربع الخالی [رکّ بآن] کا رقبہ تقریباً النفود ۷۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے، اور الرُّبع الخالی کا رقبہ تخمیناً ۵۰۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر سے زائد ہے ۔ اس طرح مؤخّرالذکر دنیا کا سب سے بڑا مسلسل ریگستان قرار پاتا ہے ۔ یہ دونوں صحرا الدَّھْناء [رکّ بآن] کی لمبی پتلی قوس کے ذریعے ملے ہوے ہیں جو طُوَیق اور العَرَمَه کے مشرق میں

واقع ہیں ۔ اسی سے مماثل ایک اور قوس طُوَیق کے مغرب میں چلی گئی ہے جو انھیں دونوں صحراؤں کے مابین ہے، لیکن اس کا تسلسل کئی جگھوں پر ٹوٹ جاتا ہے ۔ یہ نسبۃً چھوٹی قوس عرق المَظْہور سے شروع ہوتی ہے جو النّفود کے اس نقطے کے جنوب میں الگ ہو جاتی ہے جہاں سے الدَّھْناء کا آغاز ہوتا ہے اور تین متوازی انگلیوں کی طرح پھیلی ہوئی ریت میں جا ملتی ہے جو مشرق سے مغرب کو علی الترتیب یہ ہیں : نَفُوْد الثُّوَیْرات، نَفُود السِّر اور الشُّقَیْقَۃ

الثُّوَیرات کا جنوبی سلسلہ وَشْم کے ضلع کے اُن شہروں کے نام پر جو اس کے جنوب مغربی کنارے پر ہیں نَفُوْد البَلادِین کہلاتا ہے ۔ السِّر سے تقریباً ملحق نَفُوْد قُنَیْفذہ کا جنوب مشرقی سرا طُوَیق کی مغربی سد کے نیچے واقع ہے ۔ قُنَیْفذہ کے جنوب میں اُس قوس میں ایک بڑی رکاوٹ آ جاتی ہے، جس کے بعد ریت عرقُ الدَّحْی میں دوبارہ نمودار ہو جاتی ہے جو وَادِی الدَّوَاسِر کے نام سے شمال میں ختم ہوتی ہے ۔ ریت جنوب کی سمت میں منتقل ہو رہی ہے؛ بالفاظ دیگر یہ ریت آہستہ آہستہ مگر بالاستقلال النفود کو چھوڑتی جا رہی ہے اور مذکورۂ بالا دونوں قوسوں کے ساتھ ساتھ الرّبع الخالی کی جانب منتقل ہوتی جارہی ہے ۔

اگرچہ نقشے میں الرّبع الخالی کی دو بانہیں دکھائی جاتی ہیں جو شمال کی طرف پھیلی ہوئی ہیں، تاہم ان میں سے مغربی یعنی اَلْجَافُوْرَہ کو عرب ایک الگ صحرا سمجھتے ہیں جسے الجَوب کا نشیبی میدان (جَوْبِ یَبْرِیْن) الرّبع الخالی سے علٰحدہ کر دیتا ہے ۔ دونوں بانہوں میں سے مشرقی کو بھی ایک علٰحدہ خطّہ تصوّر کیا جاتا ہے اور یہ عمان کے ساحل کے عقبی علاقے میں دور تک اندر چلی گئی ہے ۔

رَمْلۃ السَّبْعَتَیْن، الرّبع الخالی کے جنوب مغربی گوشے کے جنوب میں اس نظام سے خارج ہے جو ابھی بیان ہوا ہے ۔ شاید ڈھال نما علاقے میں ریت کا سب سے بڑا انبار عِرق سُبَیع ہے جو مرکزی ابھرے ہوئے خطّے کے جنوبی حصّے میں ہے ۔

آئندہ فصل میں اُن متفرّق خصوصیات سے بحث کی جائے گی جو پانی کے نکاس اور ذرائع آب سے متعلق ہیں ۔

(۲) آب و ہوا، پانی کا نکاس اور ذرائع آب

خطّ سرطان مدینے اور مکّے کے، الخَرْج اور اَلْاَفْلَاج کے ضلعوں کے اور مسقط اور راس الحَد کے درمیان عرب کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کے بیشتر حصّے کی آب و ہوا بالعموم معتدل رہتی ہے ۔ بلکہ جنوب میں بھی جہاں جزیرہ نما کا سرا ۱۲ عرض البلد شمالی کے قریب پہنچ جاتا ہے، زیادہ تر علاقے کی بلندی ایسی ہے کہ وہ سخت گرمی سے محفوظ رہتا ہے ۔ صرف وہ نشیبی علاقے جو بحر احمر کے، خلیج عدن اور بحیرۂ عرب کے بعض حصّوں کے ساتھ ساتھ واقع ہیں، ایسے ہیں جن کا ماحول معتدل نہیں بلکہ نیم استوائی ہے ۔

موسم سے متعلّق اندراجات، اگرچہ زمانۂ حال میں انھیں بہت بہتر بنا دیا گیا ہے، عرب کے موسم کی مکمّل طور پر مفصّل تصویر پیش کرنے کے لیے ابھی تک بہت ناکافی ہیں ۔ موسم گرما کی حرارت سارے جزیرہ نما میں بہت شدید ہوتی ہے اور گرم ترین مقامات میں ۵۰ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے ۔ اندرون ملک کے بیشتر حصّے کی خشکی وہاں کی گرمی کو قابل برداشت بنا دیتی ہے، لیکن ساحلوں کے ساتھ ساتھ اور بعض جنوبی بلند علاقوں میں موسم گرما میں نمی بہت زیادہ اور مضمحل کر دینے والی ہوتی ہے ۔ کہر اور اوس مرطوب

خطّوں میں بہت عام ہے، لیکن اندرونی عرب میں سورج سال بھر چمکتا رہتا ہے اور محض کبھی کبھی آندھی یا زیادہ شاذ طور پر بارش کی وجہ سے چھپ جاتا ہے۔ اگرچہ وہ روے زمین پر بہترین نہیں کہی جا سکتی، تاہم عرب کی آب و ہوا استحقاق سے کہیں زیادہ شدّ و مد سے لعن طعن کی جاتی ہے۔ خزاں اور بہار میں بہت سے دن ٹھنڈے یا معتدل طور پر گرم ہوتے ہیں۔ جاڑے کا موسم قوت بخش طریقے پر ٹھنڈا ہوتا ہے اور سخت سردی صرف بلند تر مقامات میں پڑتی ہے جہاں بعض پہاڑی چوٹیوں پر برف جم جاتی ہے اور دور شمال میں جہاں ہوائیں بہت سرد چلتی ہیں۔

مختلف حصّوں میں ہواؤں کی نوعیت بہت مختلف ہے جو بالخصوص اردگرد کے سمندروں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ مشرقی عرب میں ہوا کا رجحان ایک ہی سمت سے چلنے کا رہتا ہے، لیکن بعض اوقات یہ اچانک اپنا رخ پورے دائرے کے نصف حصّے سے بدل لیتی ہے اور اس طرح تقریباً شمال شَمال مغرب سے چلنے والی ''شَمال'' تقریباً جنوب مشرق سے چلنے والی ''کَوْس'' بن جاتی ہے۔ جو ہوائیں تیز ہو کر آندھیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جلد ہی دھیمی پڑ سکتی ہیں یا کئی کئی دن تک جاری رہ سکتی ہیں۔ نجد میں ہوا قطب نما کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے کیونکہ بعض اوقات ہر آدھے گھنٹے میں کوئی بڑا تغیّر ہو سکتا ہے۔ بحر ہند کی موسمی ہوائیں جو جنوبی عرب کے بعض حصّوں تک پہنچتی ہیں ملک کی حالت اور وہاں کے لوگوں کی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔

بارش کی قلّت سے عرب کا بیشتر حصّہ ریگستان بن گیا اور ابھی تک بنا ہوا ہے۔ الرُّبع الخالی کے بعض حصّوں میں ممکن ہے کہ مسلسل دس سال تک بارش نہ ہو اور جزیرہ‌نما کے اور بہت سے حصّوں میں سالانہ بارش کی مقدار اگر کبھی ۱۵۰ ملی میٹر سے زیادہ ہو تو ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ جب صحرا میں بارش ہوتی ہے تو اکثر وہ موسلادھار بارش کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے اتنی رطوبت ہو جاتی ہے کہ زمین پر جنگلی پھولوں کا بچھونا بچھ جاتا ہے۔ خشک سالی کے ادوار بعض مرتبہ کئی کئی سال تک چلتے ہیں اور باشندوں کی مصیبت بلکہ موت کا باعث بھی بن جاتے ہیں اور بعض لوگوں کو مجبوراً ترک وطن کرنا پڑتا ہے۔ بلند تر مقامات میں آس پاس کے پست علاقوں کی نسبت بارش کا زیادہ امکان رہتا ہے، چنانچہ ایسا ہو سکتا ہے کہ سطوح مرتفعہ اور شمالی میدانوں پر زورکی سرمائی بارشیں ہوں بحالیکہ وادی السِّرْحان کا نشیبی علاقہ بالکل خشک رہے۔ صرف ان علاقوں میں جہاں موسمی ہوائیں چلتی ہیں خاصی زیادہ بارش ہوتی ہے۔

اگرچہ عرب میں بڑے دریا ہمیشہ جاری رہنے والے نہیں ہیں، تاہم موسمی ہواؤں کے منطقے میں وادیوں (جنھیں جنوب مغرب میں غَیْل کہتے ہیں) کے بعض حصّوں میں پانی سال بھر دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان وادیوں میں سے جو سمندر کی سمت بہتی ہیں بعض کا میٹھا پانی نمکین پانی سے مل جاتا ہے، لیکن ان میں سے زیادہ تر اس پانی کو اپنی دریائی مٹّی کی شاخوں (fans) کے ذریعے ساحلی میدانوں میں منتشر کر دیتی ہیں۔ خشک منطقے میں کبھی کبھی بلند علاقوں سے پانی سیلاب کی شکل میں آ جاتا ہے، یعنی اُن ندی نالوں (وَادِی، جمع: وِدْیَان، یا شَعِیْب، جمع: شِعْبَان) کے ذریعے جن میں بالعموم معدودے چند جوہڑ ہوتے ہیں یا وہ بھی نہیں۔ یہ اچانک

قسم کے سیلاب (سَیْل، جمع: سُیُول) بعض دفعہ بہت نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کا گراں قدر پانی ضائع جاتا ہے۔ بعض اور سیلاب چپٹی سطحوں، مثلاً کنکریلے میدانوں یا ندیوں کے دہانے کے پھیلے ہوئے حصّوں پر چادروں کی شکل میں آ جاتے ہیں۔ پانی، جو زیر زمین جذب ہو جاتا ہے، اسے لوگ کنووں اور چشموں کے ذریعے دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اگرچہ بعض وادیوں کی گزرگاہوں کا سراغ خاصی دور تک لگایا جا سکتا ہے، تاہم ریت کے تودے جو راستے میں جگہ جگہ آ جاتے ہیں پانی کے مکمّل نکاس میں حارج ہوتے ہیں۔ عرب کے پانی کے نکاس کے نظام کا ایک مخصوص پہلو وہ چھوٹے یا بڑے مقامی طاس ہیں جن کے گرداگرد حصار ہوتے ہیں۔ وادی السِّرحان صحیح معنوں میں وادی نہیں، بلکہ یہ تقریباً ۳۰۰ کیلومیٹر لمبا اور ۵۰ سے ۷۰ کیلومیٹر چوڑا ایک نشیب ہے جس میں دونوں طرف سے بہت سی وادیوں کے سیلاب آ کر شامل ہوجاتے ہیں۔ زیادہ چھوٹے طاسوں کی ایک قسم الخَبْرَاء ہے، یعنی ایک ایسا نشیب جس کی تہ میں پانی سرایت نہیں کرتا اور جس میں بارش کے بعد کچھ دیر تک پانی کھڑا رہتا ہے؛ دوسرا ''رَوضہ'' (شمال میں اسے ''فَیْضہ'' کہتے ہیں) ہے جس کی تہ میں پانی نہیں ٹھیرتا اور اس طرح وہاں جنگلی نباتات بکثرت ہو سکتی ہے۔ ایک اور قسم کا طاس نمک کا گڑھا یا شورچٹا علاقہ ہے، جو ساحلوں پر اور اندرون ملک میں بھی پایا جاتا ہے جہاں یہ چاروں طرف سے بند ہوتا ہے۔

وادی الحَمْض، بحیرۂ احمر تک چلی گئی ہے اور اس کی مشرقی معاون ندیاں، حرّۃ خیبر سے نکلتی ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر مشرق کی سمت وادی الرُّمّہ (ہمدانی کے ہاں الرُّمّۃ)، جو اپنی شاخ الباطن کے ذریعے بصرے کے قریب خلیج فارس کے طاس میں جا گرتی ہے، کے سرچشمے ہیں اگرچہ الرُّمّہ اور الباطن کو ملانے والا علاقہ الدَّھناء کی ریت سے اٹا ہوا ہے۔ الحمض اور الرُّمّہ کے سرچشموں کے درمیان حرّۃ خیبر کا جو چھوٹا سا علاقہ ہے، وہ سارے جزیرہ نما میں تنہا ایک ایسا مقام ہے جس کے دونوں طرف سمندروں کی جانب ہلکی سی ڈھلان دیکھی جا سکتی ہے۔

السَّراۃ کی مشرقی ڈھلان سے نیچے اتر کر رَنْیہ، بیشہ [رکّ بان] اور تَثْلیث کی تین بڑی ندیاں وادی الدَّواسر [رکّ بان] کے بالائی حصّوں پر مل جاتی ہیں، جن میں ان کے غیر معمولی سیلابوں کا پانی آ جاتا ہے۔ پھر جب وہ طُوَیق کی سدّ میں سے نکل کر الرُّبع الخالی کے ریگ زار میں پہنچتے ہی ادھر اُدھر پھیل جاتی ہیں تو یہ اپنا پانی بھی کھو دیتی ہیں۔ حَبونا (الہمدانی کے ہاں حَبونَن) اور نَجران [رکّ بان] دو ندیاں ہیں جو اس ریگستان کی طرف بہتی ہیں، جو طُوَیق کے جنوبی سرے کے جنوب میں واقع ہے۔ یمن کی سطح مرتفع سے الخَرید ندی، الجوف، [رکّ بان] کے طاس میں بہتی ہے۔ (جوف ابن نَاصر) قدیم مَعِیْنیوں (Minaeans) کا وطن تھا۔

یمن کے پہاڑوں کا پانی تِبْنَ، بَنا اور دیگر ندیوں کے ذریعے عدن کے قریب ساحل سمندر کی طرف چلا جاتا ہے۔ بَنا کے پانی کو اَبْیَن میں زراعت کی وسیع پیمانے پر ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ الجَول کی جنوبی شاخوں سے وادی مَیْفَعہ اور وادی حَجر بنتی ہیں۔ حَجَر عرب کا صحیح معنوں میں واحد ایسا دریا ہے جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے، لیکن اس کی کل لمبائی غالباً ۱۰۰ کیلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا پانی، جس کا کچھ حصّہ بلند علاقوں میں واقع الصَّدَارہ کے گرم

چشموں میں سے آتا ہے، دریا کے دہانے پر واقع مَیْفعہ کے علاقے میں (جسے مغرب میں واقع وادی مَیْفعہ سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے) زراعت کا کفیل ہے۔

وادی حَضرموت [رکّ بآن]، میں جو پانی کے نکاس کے نظام کا بڑا ذریعہ ہے، یہ الجَول کے جنوبی اور شمالی دونوں حصّوں سے آنے والی ندیوں سے سیراب ہوتی ہے، جنوب سے آنے والی شمال سے آنے والی ندیوں سے بہت زیادہ گنجان آباد ہیں۔ تریم کے شہر سے ذرا دور جا کر وادی حضرموت کا نام المَسیْلہ ہو جاتا ہے اور سمندر تک اس کی باقی ماندہ رہگزر کا بھی یہی نام رہتا ہے۔

سمائل، الحَجَر سے خلیج عمان کی طرف جانے والی وادیوں میں سے ایک ہے۔ ساحل سے اندرون عمان کی شاہراہ اسی وادی میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ الباطنہ کی بڑی بڑی وادیوں کے نام ان قبائل کے ناموں پر ہیں جو ان کے کنارے آباد ہیں، مثلاً المَعاول، وغیرہ۔ وادی الجزی اور وادی القور کے اوپر جا کر ہم ان دروں تک پہنچ جاتے ہیں جو پہاڑوں میں سے ہو کر ساحل عمان کی طرف جاتے ہیں۔

الدّھناء کے مشرق میں واقع اس خطّے میں جو الباطن اور السّھباء کے مابین ہے، ندی نالوں کی قلّت قابل ذکر بڑی وادیوں [ندیوں] کی تشکیل میں مزاحم رہی ہے، چنانچہ وادی المیاہ، جو القَطیف کے شمال مغرب میں ہے، ایک طاس ہے نہ کہ کوئی بہتی ہوئی ندی اور اس کا یہ نام ["پانیوں کی وادی"] ان کنووں اور چشموں کی مناسبت سے ہے جو اس کی حدود میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے بڑے طاس وادی المیاہ کے جنوب میں واقع الفَروق اور شہر کویت کے جنوب مغرب میں واقع الشّق ہیں۔

دور شمال میں وادیوں کا ایک سلسلہ الوِدیان (ودیان عَنَزہ) شمال مشرق کی جانب دریائے فرات کی طرف چلا گیا ہے؛ ان میں تُبَل، عَرعَر اور الخُرّ شامل ہیں۔ نجد میں الرُّمہ اور وادی الدّواسر کے مابین کئی وادیاں طُوَیق کو قطع کرتی ہیں، جن کی انتہائی شمالی سمت میں اَلْعتک [رکّ بآن] ہے۔ وادی [ندی] حَنیفہ [رکّ بآن] جو طُوَیق کی چوٹی سے نکلتی ہے، نہ کہ اس کے پہلو میں کسی شگاف سے۔ یہ بل کھاتی ہوئی الخَرْج کے طاس تک پہنچتی ہے جہاں کئی اہم ندیوں کا پانی السّھباء میں گرتا ہے اس کی گزرگاہ کا سراغ الدّھناء اور الجافُورہ کے پار خلیج فارس کے طاس تک لگایا جا سکتا ہے۔ بِرْک نامی وادی ایک خوش منظر گھاٹی کے ذریعے طُوَیق کی سدّ کو چیر کر نکل گئی ہے اور العَقیمی کے نام سے شمال کی طرف مڑ کر السّھباء کی طرف چلی جاتی ہے۔

عرب میں دوامی بڑی جھیلیں نہیں، البتہ جگہ جگہ گہرے جوہڑ ملتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی وہ ہیں جو الخَرج اور الافلاج کے ضلعوں میں ہیں۔ بعض نخلستانوں، مثلاً الحَسا، میں اُس پانی سے جو آب پاشی کے وقت بہ نکلتا ہے، بڑے بڑے تالاب بن سکتے ہیں۔ خشک جھیلیں جو شمال میں واقع ہیں، ان میں بارش کے بعد دس یا اس سے زائد مربّع کیلومیٹر کے رقبے میں پانی بھر سکتا ہے۔

صحرا کے اُن ہزاروں کنووں (بئر، تلفّظ بِیْر، جمع: اَبْیار، یا قَلیب، جمع: قُلبان) کی بدولت جن میں سے بعض الرّبع الخالی کے مرکزی حصّوں میں بھی پائے جاتے ہیں، بدویوں کی خانہ بدوش زندگی قابل گزران ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے سب سے گہرا کنواں زمین میں تقریباً ۱۷۰ میٹر تک گیا ہے اور ۷۰ میٹر سے زائد کی گہرائی عام ہے۔ یہ کنویں پکّے اور کچے دونوں طرح کے ہیں، کبھی تو ان کی طرف خاصی آمد و رفت

ہوتی ہے اور کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوتا ۔ پانی حاصل کرنے کے دیگر مقامات ریت یا وادیوں کے پیندوں میں بعض ایسے خطّے ہیں جن میں ایک میٹر یا اس سے کچھ زیادہ گہرائی میں قلیل سی مقدار میں پانی حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ اڑتی ہوئی ریت تیزی سے ان اُتھلے نشیبوں کو بھر دیتی ہے اور اس طرح ان کا کھوج لگانا اُن بدویوں کی آب شناس مہارت کے لیے بھی دشوار ہو جاتا ہے جنھوں نے صحرا میں پرورش پائی ہو ۔ صحرا کے بعض کنووں کا پانی ضرورت سے زیادہ کھاری ہوتا ہے (ایسا کنواں خَور، جمع: خِیران) کہلاتا ہے، لیکن اونٹ اسے پی لیتے ہیں اور دودھ دیتے ہیں جس پر ان کے مالکوں کی گزر اوقات ہوتی ہے ۔

بیشتر بہتے ہوے چشموں (عَیْن، جمع: عُیُون) کے گرد و پیش نخلستانی بستیاں یا شہر وجود میں آ گئے ہیں ۔ دوسرے لوگ اپنا پانی صرف کھودے ہوے کنووں سے حاصل کرتے ہیں، بحالیکہ بعض اوقات بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے تالاب اور حوض بھی استعمال کیے جاتے ہیں ۔ زیادہ بڑے نخلستان شہر یا زائد گاووں یا شہروں پر مشتمل ہیں، جو ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ان کے اپنے اپنے کھجور کے باغوں کا منطقہ ہوتا ہے ۔ نخلستان کے نام کا اطلاق پورے مجموعے پر ہو سکتا ہے جو بیسیوں بلکہ سیکڑوں مربّع کیلومیٹر پر محتوی ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کی حدود کے اندر آباد کسی خاص قوم یا قبیلے پر، مثلاً الحَسَا، جس کے بڑے شہر الہُفُوف [= الہُفُوف] اور المُبَرَّز ہیں اور البِیشہ، جس میں اَلروشن اور نِمران ہیں ۔

جہاں کہیں پانی کافی مقدار میں مل سکتا ہے وہاں آبپاشی کے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ جنوب میں طبق بر طبق کھیت بنانے کا بہت رواج ہے اور پانی کو ایک احاطے سے دوسرے میں لے جایا جاتا ہے ۔ بعض علاقوں میں زیر زمین کاریزوں (فَلَج، جمع: اَفْلاج) کا ایک قدیم طریقہ بہت عام ہے جو ایران کی قناتوں سے مماثل ہوتی ہیں، لیکن دوسرے علاقوں میں یہ طریقہ غیر معروف ہے ۔ بڑے نخلستانوں، مثلاً الحَسَا اور تہامہ میں آبپاشی کے لیے پانی کی تقسیم کے قواعد واضح ہیں اور بربنائے رواج ان پر مستقل طور پر عمل درآمد ہو رہا ہے ۔ بند تعمیر کرنے میں عربوں کو کبھی برتری حاصل تھی، لیکن زمانۂ حال میں بہت غفلت برتی گئی ہے، اب جب کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بلند تر معیار زندگی اس بات کا متقاضی ہے کہ زراعت کو ترقی دی جائے، اس فن کا دوبارہ احیا کیا جا رہا ہے ۔

(۴) سیاسی تقسیم :

سیاسی تقسیم کے لیے دیکھیے مختلف مقالات مختلف ریاستوں کے ناموں کے تحت ۔

(۵) نباتات و حیوانات :

جزیرہ نما کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صحرا کے غیر مزروعہ علاقوں اور نخلستانوں کے سر سبز خطّوں میں نمایاں تفاوت ہے ۔ بعض جگہوں میں، بالخصوص جزیرہ نما کے کناروں پر جہاں بارش زیادہ کثرت سے ہوتی ہے، یا جہاں ندی نالے بالائی علاقوں سے پانی زیادہ مقدار میں لے آتے ہیں، زراعت زیادہ بڑے پیمانے پر ہوتی ہے ۔ بعض اوقات کھیت اوپر کی طرف طبقہ بہ طبقہ بلند ہوتے جاتے ہیں ۔ ان طبقات کو بہت ہنرمندی سے تیار کیا جاتا ہے ۔ یہ کھیت اُن تنگ میدانوں پر بھی ہوتے ہیں جو سمندر اور پہاڑوں کے درمیان ہیں ۔ عرب

میں نہ تو گھاس کے ایسے وسیع میدان پائے جاتے ہیں جنھیں زیر کاشت لایا جا سکتا ہو اور نہ اس میں جنگلوں ہی کا کوئی گھنا منطقہ ہے۔ البتہ بہترین چیز جو یہاں ہوتی ہے، عسیر عالیہ کی صنوبری جھاڑیوں کے جنگل ہیں۔

نخلستان کا بے مثال درخت کھجور ہے، جس کی منفرد حیثیت کی وجہ سے عرب اسے دوسرے سب درختوں سے ممتاز سمجھتے ہیں۔ کھجور نہ صرف سب سے اہم بنیادی خوراک ہے، بلکہ اس کے درخت کی شاخیں اور چھال جھونپڑیاں تعمیر کرنے، ٹوکریاں اور چٹائیاں بنانے اور دوسرے بے شمار کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ کھجور کا درخت بہت زیادہ بلندی پر نہیں اگ سکتا، اس لیے وہاں کے دیہاتی اناج کی مختلف قسموں پر انحصار کرتے ہیں۔ ظُفار اور بعض دوسرے مقامات میں کھجور کے درختوں کی جگہ یا اُن کے پہلو بہ پہلو ناریل کے درخت بھی اگتے ہیں، جن کی جگہ کبھی کبھی دَوم کے درخت (ginger bread trees) بھی پائے جاتے ہیں۔

گیہوں، جو، جوار اور باجرا اہم اناج ہیں۔ القَلْقَہ (لوسن، قَطْ یا قَضْب یا برسیم) ایک عام فصل ہے جو کھجور کے درختوں کے سائے میں اگائی جاتی ہے؛ روئی، چاول اور تمباکو کی کاشت بھی محدود پیمانے پر ہوتی ہے۔

یمن اور عسیر کے بلند طبقات میں وہ کافی (قہوہ) اگتی ہے جس نے اس وقت سے جب پرتگیزوں نے افریقہ کے ارد گرد سفر کر کے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا، المُخا (mocha) کو یورپی تاجروں کی منزل مقصود بنا دیا تھا۔ اگرچہ کافی عرب میں صرف پانچ سو برس پہلے لائی گئی تھی، تاہم یہ اپنے عربی نام (قہوہ) سے تمام دنیا میں مشہور ہوئی۔

اب دنیا کے لوگ اپنے قہوے کے روزمرہ استعمال کے لیے برازیل سے رجوع کرتے ہیں، کیونکہ یمن کا قہوہ ایک غیر ملکی سامان تعیّش بن گیا ہے۔ بعض طبقات میں قہوے کی جگہ زیادہ نفع بخش قات [رَکّ بان] نے لے لی ہے جس کے کسی قدر نشہ آور پتے یمن اور جنوب کے دیگر علاقوں کے لوگ چباتے ہیں۔

لوبان اور دیگر خوشبودار چیزیں، جو دو ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے ''شاہراہ بخورات'' (Incense Road) کے ذریعے جنوبی عرب سے بحیرۂ روم کے ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں، اب بھی جنوب میں اگتی ہیں، بالخصوص مَہْرہ کے علاقے میں، لیکن تجارتی اشیا کی حیثیت سے اب ان کی عملاً کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ آج کل زیادہ کارآمد پیداوار نیل ہے، جو جنوبی عرب میں بہت مقبول ہے (درخت کو حَوِیْر اور اس کے رنگ کو نیل کہتے ہیں)، دوسرے عام رنگ زردی مائل ''وَرْس'' اور سرخی مائل حنا ہیں۔

اونچے درخت املی کے ہیں، جنھیں بعض اوقات ہوا کے دباؤ کا زور توڑنے یا متحرک ریت کے بہاؤ کو روکنے کی غرض سے ایک قطار میں لگا دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کیکر یا ببول (acacias)، چھوٹی موٹی قسم کے mimosa اور خروب carob کے درخت ہیں۔ عنّاب (Zizyphus spina christi = سِدْر [بیر] شمال میں اور عِلب جنوب میں) کے درخت میں کھانے کے قابل ایک پھل لگتا ہے جسے بدوی ''دَوْم'' (کھجور کے درخت کا ہم نام) اور شہروں کے باشندے ''کُنار'' [بیر] کہتے ہیں۔ ایلوا (aloe) اور فربیون (آملے کی قسم) euphorbia کے درخت اکثر خاصے اونچے ہو جاتے ہیں اور مؤخّرالذکر کی بعض اقسام تھوہر (یا ناگ پھنی = cactus) سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

اگرچہ عرب ایک خشک ملک ہے تاہم یہ پھولوں اور پھلوں سے بالکل محروم نہیں۔ الطّائف اپنے گلابوں اور اناروں کے لیے مشہور ہے، الخَرْج تربوزوں (نجد میں جِحّ، الحجاز میں حَبحَب اور شمال میں دِبشی) کے لیے اور البُرَیمی آمون (آنبہ یا حَنب) کے لیے۔ انجیر، انگور، آڑو، کیلے اور بعض دوسرے پھل کبھی کبھی شہریوں کی غذا میں تنوع پیدا کر دیتے ہیں، لیکن بدویوں کو دودھ اور کھجور سے زیادہ کوئی غذا مرغوب نہیں۔

موسم سرما میں بعض دفعہ مہینوں پانی کے کنووں پر جائے بغیر بدوی دور دور تک نکل جاتے ہیں، کیونکہ اونٹوں کو چارہ مل جاتا ہے اور ان کے مالک ان کے دودھ پر گزراوقات کرتے ہیں۔ چارے کے لیے جن پودوں کی سب سے زیادہ تلاش رہتی ہے، وہ سال بسال اگنے والی گھاس (عُشب، جس کا تلفظ عِشب کیا جاتا ہے)، جنگلی پھول اور وہ جڑی بوٹیاں ہیں جو بارش کے بعد ہری ہو کر اگ آتی ہیں، خصوصاً موسم ربیع میں جو پہلی اور وافر بارشوں (وَسْمی) کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس قسم کے سالانہ پودوں کے لیے ریگزاروں کی مٹی سب سے اچھی ہوتی ہے اور اسی لیے خانہ بدوش انھیں صحرائی علاقوں کو سب سے زیادہ دلکش تصوّر کرتے ہیں۔ سدا بہار پودے اور جھاڑیاں (شَجَر) جنھیں اونٹ کھاتے ہیں، نَصِی، حاذّ اور سَبَط (تلفظ صَبَت) ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار جھاڑیاں ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ وقتاً فوقتاً اونٹوں کو حَمْض قسم کی جھاڑیوں کو کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے یہ اُس نمک کا، جو ان کے نظام بدنی کے لیے درکار ہوتا ہے، منبع ہیں۔ ان بہت سے پودوں میں جو اس ذیل میں آتے ہیں رَوْثہ، رِمْث، عَراد، اُجْرُم، سُوواد، شنان، غضا اور حاذّ (نہ کہ حاذ جیسا کہ کلاسیکی عربی میں ہے) ہیں۔ ایندھن کی غرض سے بدویوں کے لیے خشک جھاڑیاں بھی بہت ضروری ہیں اور ان میں سے بہترین عَبْل، غَضا اور رِمْث ہیں۔ یہ جھاڑیاں جلتے ہوئے بہت اچھی خوشبو دیتی ہیں اور اس لیے خیمے کے کھلے دروازے کے سامنے کسی مہمان کے لیے قہوہ جوش کرنے کا عمل باعثِ مسرت بن جاتا ہے۔ بدوی ترفاس (فَقْع truffles) کو پسند کرتے ہیں اور صحرا کے دوسرے پودے بھی کھا لیتے ہیں، اگرچہ از روی ترجیح و انداز فکر ان کے وجود میں سبزی خوروں کی سی کوئی بات نہیں۔ اراک [پیلو] (تلفظ راک) کی شاخیں مسواک کے طور پر عام استعمال میں آتی ہیں اور سَنا senna کی پتّیاں جلّاب کے لیے چبائی جاتی ہیں۔

صحرا میں نباتات کی مزید افراط ہوتی اگر وہاں ریت کے وہ ٹیلے نہ ہوتے جو اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض ایک سال میں ۲۰ میٹر تک حرکت کرتے ہیں۔ تاہم بہت سی جگہوں میں جھاڑیوں نے جڑ پکڑ لی ہے اور جمی ہوئی ریت کا ہر جھاڑی کے گرد ایک ٹیلا بن جاتا ہے۔ ایسے ٹیلوں کا رقبہ متعدّد کیلومیٹر تک پھیل جاتا ہے۔ اس طرح کی نہایت ناہموار زمین کو عَفْجہ کہتے ہیں۔ ریتلے علاقوں کے کمتر دشوار گزار نمونوں کو مَرْبَخ یا دِکاکہ (جمع دِکاک، قبَ کلاسیکی دَکّ، جمع دِکاک بمعنی چپٹی سطح کا ریتلا میدان) کہتے ہیں۔

جانوروں میں اونٹ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو درختوں میں کھجور کے درخت کو۔ عرب کے بیشتر بدویوں کی دولت کا دار و مدار اونٹ ہی پر ہے۔ وہ

قبائل جو اونٹوں کے بجائے بھیڑیں پالتے ہیں، عرب کے شمال میں واقع چٹیل میدانوں، یعنی عراق کے بڑے دریاؤں کے قرب و جوار میں بود و باش رکھتے ہیں۔ یہ قبائل جنوب کی سمت نقل وطن کرتے ہوئے کویت کی سر زمین سے آگے نہیں جاتے۔ اونٹوں سے حاصل ہونے والی سب سے زیادہ قیمتی چیز دودھ ہے، لیکن ان کا گوشت، کھال اور اون بھی بہت کار آمد ہے۔ ان کی مینگنیوں (دِمْن) کو ایندھن کی طرح جلانے کے لیے جمع کیا جاتا ہے اور مردہ اونٹوں کی دُموں کے بالوں سے مضبوط رسّا بنا لیتے ہیں۔ اونٹوں کو بعض اوقات ہل چلانے یا کنووں سے پانی نکالنے کی غرض سے جوتا بھی جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب کپڑوں اور دیگر ضروریات کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے کچھ اونٹ فروخت بھی کر دیتے ہیں۔ سخت پیاس کی حالت میں ممکن ہے کہ کوئی بدوی وہ پانی پینے کے لیے، جو اونٹ کے معدے (کَرْش) میں جمع رہتا ہے اپنے اونٹ کو ذبح کر دے۔

اونٹوں کا عام نام اِبِل [رك بآن] ہے (جسے اکثر بِل تلفّظ کرتے ہیں)، لیکن جنوب میں زیادہ عام اصطلاح بَوش ہے۔ سواری کے اونٹ کو ذَلُول کہتے ہیں (اسم جمع رِکاب) یہ لفظ سواری کے کام آنے والی یا نہ آنے والی دونوں قسموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اَصیل (جمع اصائل) وہ اونٹ ہوتے ہیں جن کا نسب نامہ کئی نسلوں سے منضبط اور محفوظ رہا ہو۔ ان میں سے بہت سے عُمان کی نسلوں (عُمّانیات) سے ہوتے ہیں جن میں الباطنہ کے بواطن خاص طور پر مشہور ہیں، اگرچہ ان میں یہ عیب ہے کہ وہ ہر روز پانی پینا چاہتے ہیں اور ناہموار علاقوں میں سفر کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ ریگستان کے اونٹ عموماً ان اونٹوں سے جن کی پرورش یمن کے پہاڑوں میں ہوئی ہو، قد میں چھوٹے اور زیادہ ہلکے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان بے شمار ناموں میں سے جو اونٹوں سے مخصوص لغات میں پائے جاتے ہیں، بعض ایسے ہیں جن سے مراد وہ اونٹ ہوتے ہیں جو خاص خاص پودوں کو کھاتے ہیں، مثلاً ھَوارم (واحد مؤنث : ھارم) ھَرْم نامی جھاڑی سے مشتق اور اَوارِک (واحد مؤنث آرکہ) اراک کے درخت سے مأخوذ۔ ساحلوں کے ساتھ ساتھ اونٹوں کو اکثر سارڈین مچھلی کھلائی جاتی ہے۔

اونٹوں کے ساتھ ساتھ بیشتر خانہ بدوش بھیڑ بکریاں (غَنَم) بھی پالتے ہیں، اگرچہ اتنے بڑے بڑے گلّوں میں نہیں جتنے کہ شمالی چٹیل میدانوں میں نظر آتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی قدر و قیمت ان کے دودھ، اون یا بالوں اور کھالوں کی وجہ سے ہے۔ بھیڑوں کی مانگ عربی دعوتوں میں اہم ترین کھانے کی حیثیت سے ہوتی ہے؛ چنانچہ بادشاہ بھی ایک بھیڑ کے بچے (طَلِی، جمع : طُلْیان) سے جسے دیگچے میں ڈال کر سمن [مکھن] میں بھونا گیا ہو اور ایک بڑی پلیٹ میں چاولوں کی تہ جما کر مہمانوں کے سامنے رکھا جائے، کوئی زیادہ لذیذ کھانا پیش نہیں کر سکتے۔ سَمَن، یعنی اُس مصفّا مکھن کو جو پکانے یا چکنا کرنے کے لیے بھیڑ (نَعْجہ) یا بکری (عَنْز) کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے، جَباب سے جو اونٹنی (ناقہ) کے دودھ سے بنتا ہے یا وَدَک سے جو اونٹوں، بھیڑوں یا گائے بھینسوں کی چربی سے بنتا ہے، برتر سمجھا جاتا ہے۔

عَربی گھوڑے کی نسل، جو یورپی اصیل گھوڑوں کا مورث اعلیٰ اور ایک زمانے میں جزیرہ نما

کے لیے وجہ افتخار تھا، اب ختم ہوتی جا رہی ہے ۔ آج کل بہت کم بدویوں کے پاس گھوڑے ہیں اور ان کی ہندوستان، مصر اور یورپ کو برآمد، جو ایک وقت عرب اقتصادیات کا ایک اہم عنصر تھا، اب کم ہو کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے ۔ کوئی کوئی صاحبِ جاہ شخص اب بھی گھوڑے پالتا ہے، لیکن اب اس کا امکان ہے کہ اس سے بھی تغافل برتا جائے گا ۔ موٹر کار کی تیز رفتاری نے عربوں کو فریفتہ کر لیا ہے، چنانچہ اب شکار کے لیے اور بعض عرب افواج میں رسالے کے طور پر کاریں ہی استعمال ہوتی ہیں ۔

بہت اچھی نسلوں کے گدھے پرورش کیے جاتے ہیں، بالخصوص بحرین اور الحسا کے سفید رنگ اور بڑے قد و قامت کے گدھوں کو سواری اور پانی کھینچنے اور پہاڑی علاقوں میں باربرداری کے جانوروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں ثابت قدمی کی بنا پر انہیں اونٹوں کی بہ نسبت زیادہ قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے ۔ گائیں بھینسیں، جو بیشتر مقامات پر زیادہ تعداد میں نہیں پائی جاتیں، چھوٹی اور کوہان دار قسم کی ہیں، سوا سقطرٰی کے جہاں بے کوہان قسم کی بھی ہوتی ہیں ۔

ہرن (ظبی) جو گزشتہ زمانے میں میدانوں میں ادھر اُدھر بڑے بڑے ریوڑوں مین دوڑتے پھرتے تھے، ان بندوقوں کی بدولت بہت کم ہوتے جا رہے ہیں جو شکاری ہاتھوں میں لے کر ان کے پاس سے ٹرکوں اور کاروں میں دوڑتے پھرتے ہیں ۔ تین عام اقسام رِئم (تلفّظ رِیم)، عِرفی (قب کلاسیکی یَعفور) اور اِدم ہیں؛ غزال کی اصطلاح صرف نو زائیدہ ہرن کے لیے استعمال ہوتی ہے ۔ بدویوں کا تیز رفتار شکاری کتّا (سَلُوقی) کبھی کبھی دوڑنے میں ہرن پر بھی سبقت لے جاتا ہے ۔ ایک زیادہ بڑی قسم کا ہرن (oryx، جسے جنوب میں وُضَیحی اور شمال میں بَقر وَحْش یعنی نیل گائے کہتے ہیں) تھوڑی تعداد میں الربع الخالی کے دور دراز حصّوں میں باقی رہ گیا ہے، لیکن اب النَّفود میں تقریباً کوئی نہیں رہا ۔ پہاڑی بکرا (ibex، وَعْل) بھی اب بلند تر چوٹیوں میں زیادہ دور افتادہ مقامات میں پناہ گزین ہو گیا ہے ۔ دیگر بڑے بڑے جنگلی جانوروں میں لگڑ بگھّا (ضَبُع)، گیدڑ (واوِی) [کلاسیکی ابن آوٰی]، بھیڑیا (ذِئب، تلفّظ ذِیب، جمع ذِیابہ) اور چیتا (نِمر) شامل ہیں ۔ شیر ببر [اسد] عرب میں عرصے سے معدوم ہو چکا ہے ۔ جنوب کے پہاڑوں میں بندر (baboons) بہت کثرت سے ہیں اور ٹولیوں میں ادھر اُدھر آوازیں نکالتے پھرتے ہیں؛ انہیں جوار باجرے کے کھیتوں پر ہلّہ بولنے کا بہت شوق ہے ۔ زیادہ چھوٹے حیوانات لومڑی (ثَعلب، یا ثَعل یا حُصَیْنی، ظَرِنبان (کلاسیکی ظَرِبان = بلی جیسا ایک جانور)، وَبر (= خرگوشک)، اور خرگوش (ارنب) ہیں ۔ جھاڑ چوہا (قُنفُذ) جس کے کانٹے چھوٹے ہوتے ہیں، لمبے کانٹوں والے سیہ (porcupine) کی بہ نسبت، جس سے اس کا کوئی تعلّق نہیں، بہت زیادہ عام ہے ۔ جَرْبُوع (کلاسیکی یَرْبُوع، jerboa) صحرا میں اپنی طبعی پچھلی ٹانگوں پر ادھر اُدھر کودتا پھرتا ہے اور بہت چھوٹے سے کینگرو سے ملتا جلتا لگتا ہے؛ اسی سے قریب نسل کا جِرْذِی (قب کلاسیکی جرذ) اس کے برعکس چاروں ٹانگوں پر دوڑتا ہے ۔

سانپ ریتلے میدانوں اور چٹانوں میں رہتے ہیں، اگرچہ اپنے شبانہ طور طریقوں کی وجہ سے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں ۔ ان میں سے کچھ زہریلے بھی ہوتے ہیں، جن میں سینگ دار افعٰی (viper)، نیز عربی ناگ (cobra) کی ایک قسم (= مصری asp) اور ایک بڑا سانپ جسے یَیم (قب کلاسیکی اَیم) شامل

ہیں ۔ اس آخرالذکر سانپ کے بارے میں بدوی کہتے ہیں کہ اس میں خاصے فاصلے تک اڑنے یا کودنے کی قوت ہوتی ہے ۔ عام روایت کی رو سے شاید سب سے زیادہ مہلک بَثْن ہے جو ایک چھوٹا سا معصوم شکل و صورت کا سانپ ہے اور ریگزاروں میں رہتا ہے ۔ خلیج فارس کے دھاریدار سمندری سانپ زہریلے ہوتے ہیں، لیکن وہ انسانوں کو شاذو نادر ہی کاٹتے ہیں ۔ چھپکلی کی قسم کے دو بڑے جانور ضَبّ اور وَرَل (گوہ کی قسم کا جانور) ہیں جن میں سے پہلے کو سب بدوی بہت شوق سے کھاتے ہیں بحالیکہ دوسرے سے بالعموم پرہیز کرتے ہیں ۔ ریگزاروں کے زیادہ چھوٹے گرگٹوں میں تند شکل کا طُحَیْحی اور پھسلوان ریت میں تیرنے والا دَمُّوسہ (skink) ہیں ۔

گزشتہ چند سال سے شتر مرغ عرب میں بظاہر ناپید ہوگیا ہے ۔ صحرا میں اس کے انڈوں کے ٹوٹے ہوے چھلکے اکثر پائے جاتے ہیں اور مقامات کے ناموں میں لفظ نَعام اور شتر مرغوں سے متعلق اصطلاحات اکثر ملتی ہیں ۔ سدھائے ہوے بازوں سے جنھیں اکثر محض طُیُور [= پرندے] کہا جاتا ہے شکار میں بہت کام لیا جاتا ہے اور دوسرے پرندوں کے علاوہ ان کا خاص شکار حُبارٰی [تیتر کی ایک قسم) ہوتے ہیں ۔ بھٹ تیتر کی اقسام کے پرندے، مثلاً قَطا اور غَطاط، اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے تربیت یافتہ بازوں کے قابو میں نہیں آتے، البتہ جنگلی باز انھیں پکڑ سکتے ہیں ۔ جنگلی بازوں کی موجودگی کی شہادت مَصْقَرہ [= باز (صَقْر) کے گھونسلے کی جگہ] نام کے متعدّد بلند مقامات سے ملتی ہے ۔ صحرا کے زیادہ بڑے پرندوں میں عقاب، گدھ (نَسْر) اور اُلّو شامل ہیں، بحالیکہ سرخ ٹانگوں کے لمڈھینگ، چھوٹے بگلے اور حواصل ساحلوں کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں ۔ چھوٹے پرندے مزروعہ علاقوں میں زیادہ عام ہیں، ان میں پیک (= کُوکو cuckoo)، ذُجّ یا طوطی (thrush)، ابابیل، ممولا شامی بلبل اور ھُدھُد شامل ہیں ۔ دُھوے طوق والا چنڈول (اُمّ سالم) صحرا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور زیادہ بھدّی قسم کے دَرَج کا بھی تقریباً یہی حال ہے ۔ مکّۂ معظّمہ کے حرم شریف کے کبوتر تمام دنیاے اسلام میں مشہور ہیں ۔

جزیرۃ العرب کے اردگرد کے سمندروں میں مچھلیاں بافراط پائی جاتی ہیں جن میں سے بہت سی، مثلاً خلیج فارس کی کَنْعَد (king mackerel) اور ھامُور (grouper)، لذیذ اور مقوی ہوتی ہیں، لیکن جنھیں عرب اس قدر نہیں کھاتے جتنی کہ توقع کی جا سکتی تھی ۔ بحرالہند سے کبھی کبھی وھیل (whale) مچھلیاں بھی خلیج فارس میں آ جاتی ہیں ۔ جنوبی ساحل سے پرے شارک (shark) اور سارڈین (sardine) مچھلیاں بڑی تعداد میں پکڑی جاتی ہیں اور خلیج فارس میں لذیذ شرمپ (shrimp) مچھلیاں پائی جاتی ہیں ۔

عرب میں زندہ جانوروں کی وجہ سے جو سب سے زیادہ تباہ کُن آفت آتی ہے وہ ٹڈّیوں (جَراد) کی ہے ۔ ٹڈّیوں کے حملے کا ایک تنہا پہلو جو اس کی شدّت کو کم کر دیتا ہے، یہ ہے کہ ان حملہ آوروں کی ایک بڑی تعداد کو وہی لوگ کھا لیتے ہیں، جنھیں یہ مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں ۔ مقابلۃً چھوٹی آفتیں مکھیوں، اونٹوں کی چچڑیوں اور اسی قسم کے اور کیڑوں مکوڑوں کی ہیں جو عرب میں اور بہت سے ملکوں کی بہ نسبت چنداں شدید نہیں، اگرچہ بدوی اپنی زندگی کو محض ''رَمْل و قَمْل'' (ریت اور جوئیں) کہہ سکتا ہے ۔ ایک زیادہ خوش آئند کیڑا، باوجود اپنے ڈنک کے، شہد کی مکھی [نَحل] ہے جسے شہد کے لیے پالا جاتا ہے ۔

مآخذ : (فصل ۱ تا ۷ کے لیے) - قدیم‌تر عربی مآخذ : (۱) عَرّام السُّلَمی : اسماء جبال تہامة، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۲) الہمدانی : صفة جزیرة العرب؛ (۳) وہی مصنّف : الاکلیل؛ (۴) *BGA*، بالخصوص ابن حَوقل اور المقدسی؛ (۵) المسعودی : مُرُوج الذّہب؛ (۶) البکری : معجم ما استعجم، قاہرہ ۱۹۴۵ تا ۱۹۵۱ء؛ (۷) الزَّمَخْشری : الامکنة و الجبال المیاہ، لائیڈن ۱۸۵۶ء؛ (۸) ابن جُبَیر : رحلة، بار دوم، لائیڈن ۱۹۰۷ء؛ (۹) یاقوت : معجم البُلدان؛ (۱۰) احمد بن عبداللہ الطّبری : القِرٰی لقاصد اُمّ القُرٰی، قاہرہ ۱۳۶۷ھ؛ (۱۱) ابن المُجاور : *Descriptio Arabiae meridionalis*، لائیڈن ۱۹۵۱ء؛ (۱۲) ابو الفداء : *Descriptio peninsulae Arabiae*، اُوکسفرڈ ۱۷۱۲ء؛ (۱۳) ابن بطّوطہ : *Voyages*؛ (۱۴) المَقْرِیزی : *De valle Hadhramout*، بون ۱۸۶۶ء؛ (۱۵) خلیل الظّاہری : زُبْدَة کشف المَمالک، پیرس ۱۸۹۴ء (فرانسیسی ترجمہ، دمشق ۱۹۵۰ء)؛ (۱۶) عبدالغنی النّابلوسی : الحقیقة والمجاز، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

وسیع تر مفہوم کی جدید عربی تصانیف :

(۱) امین الرّیحانی : ملوک العرب، بار دوم، بیروت ۱۹۲۹ء؛ (۲) حافظ وَہْبہ : جزیرة العرب، قاہرہ ۱۳۵۴ھ؛ (۳) عمر رضا کحّالہ : جغرافیة شبہ جزیرة العرب، دمشق ۱۳۶۴ھ؛ (۴) فؤاد حمزہ : قلب جزیرة العرب، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۵) وہی مصنف : البلاد العربیة السّعودیة، مکّہ ۱۳۵۵ھ؛ (۶) L. Cheikho، در المشرق، ۱۹۲۰ء (۷) محمّد بن عبدالدّین بلَیْہد : صحیح الاخبار، قاہرہ ۱۳۷۰ تا ۱۳۷۳ھ.

وہ تصانیف جو ابتداءً الحجاز سے متعلّق ہیں :

(۱) ابراہیم رفعت : مرآة الحرمین، قاہرہ ۱۳۴۴ھ؛ (۲) محمّد لبیب اَلْبَتُّونی: الرّحلة الحجازیة، بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۹ھ؛ (۳) خیرالدّین الزِّرِکلی : مارأیت، قاہرہ ۱۳۴۲ھ؛ (۴) شکیب ارسلان : الارتسامات اللّطاف، قاہرہ ۱۳۵۰ھ؛ (۵) عبدالقدّوس الانصاری : آثارالمدینة، دمشق ۱۳۵۳ھ؛ (۶) محمّد حسین ہیکل : فی منزل الوحی، قاہرہ ۱۳۵۶ھ.

عسیر سے متعلّق تصانیف :

(۱) شرف البرکاتی : الرّحلة الیمانیّة، قاہرہ ۱۳۳۰ھ؛ (۲) فؤادحمزہ : فی بلاد عسیر، قاہرہ ۱۹۵۱ء؛ (۳) محمّد عمر رفیع : فی رُبوع العسیر، قاہرہ ۱۳۷۳ھ.

یمن، حضرموت، کویت اور سعودی عرب کے بارے میں تصانیف :

(۱) نزیح العظم : رحلة فی بلاد العربیّة السّعیدة، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ (۲) صلاح البکری : فی جنوب الجزیرة العربیّة، قاہرہ ۱۳۶۸ھ؛ (۳) محمّد بن ہاشم : رحلة الی الثّغرین، قاہرہ؛ (۴) احمد الشُّرباصی : ایّام الکویت، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۵) فیصل العَظمة : فی بلاد اللّؤلؤ، دمشق ۱۹۴۵ء؛ (۶) حَمْد الجاسر، در *MM 'I 'A*، زمانۂ حال کے مقالات البلاد السعودیّة، وغیرہ؛ (۷) رُشدی مَلْحاس : بحث المدائن، مکّہ ۱۳۴۹ھ؛ (۸) وہی مصنّف: مسافات الطُّروق، بار پنجم، مکّہ ۱۳۶۸ھ؛ (۹) عیسٰی القُطامی : دلیل المحتار، باردوم، قاہرہ ۱۳۶۹ھ؛ (۱۰) حسین محمّد بدوی : کتاب الزراعة الحدیثة بالمملکة العربیّة السّعودیة، قاہرہ ۱۹۴۵ء.

عام نوعیت کی کتابیں جن میں عرب سے بحث کی گئی ہے:

(۱) E. F. Jomard : *Études géographiques at historiques sur l'Arabie*، پیرس ۱۸۳۹ء؛ (۲) C. Ritter : *Die Halbinsel Arabien*، بار دوم، برلن ۱۸۴۶-۱۸۴۷ء؛ (۳) N. Desvergers : *Arabie*، پیرس ۱۸۴۷ء؛ (۴) A. d'Avridl : *L' Arabie contemporaine*، پیرس ۱۸۶۸ء؛ (۵) S. M. Zwemer : *Arabia*، نیویارک ۱۹۰۰ء؛ (۶) B. Moritz : *Arabien*، ہانوور ۱۹۲۳ء؛ (۷) W. Lesch : *Arabien*، میونخ ۱۹۳۱ء؛ (۸) E. Nunè، در *OM*، ۱۹۴۱ء؛ (۹) R. Sanger : *The Arabian Peninsula*، Ithaca، نیویارک ۱۹۵۴ء؛ (۱۰) برطانوی وزارت بحریہ: *A handbook of Arabia*، لنڈن ۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ء؛ (۱۱) وہی مصنف : *Iraq and the Persian Gulf*، لنڈن ۱۹۴۴ء؛ (۱۲) وہی مصنف : *Western Aralia and the Red Sea*،

Gazetteer of the : J. G. Lorimer (۱۳) لندن ۱۹۴۶ء؛ *Persian Gulf, 'Omān and Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۵ء؛ (۱۴) *Routes* : India, General Staff *in Arabia*، شملہ ۱۹۱۶ء؛ (۱۵) *Selections from the records of the Bombay Government*، سلسلۂ جدید، ج ۲۴؛ بمبئی ۱۸۵۶ء؛ (۱۶) *Select-ions from the travels.....in the Bombay Secretariat* : G. W. Forrest *A memoir* : C. R. Markham (۱۷) بمبئی ۱۹۰۶ء؛ (۱۸) *on the Indian surveys*، بار دوم، لندن ۱۸۷۸ء؛ عدن اور بحرین کی حکومتوں کی سالانہ رپورٹیں وغیرہ؛ (۱۹) *Handbook* : Iraq Petroleum Company، لندن ۱۹۴۸ء؛ (۲۰) *Arabien u. die Araber* : A. Zehme *The penetrat-ion of Arabia*، Halle ۱۸۷۵ء؛ (۲۱) D. G. Hagarth *For-sehungs—reisen in Süd-Arabien*، لائپزگ ۱۹۰۷ء؛ (۲۲) O. Weber *The unveiling of Arabia* : R. H. Kiernan (۲۳) *Die v. Medina* : F. Wüstenfeld (۲۴) لندن ۱۹۳۷ء؛ *Die Strasse v. auslaufenden Hauptstrassen*؛ (۲۵) *Das Gebiet v. Medina*؛ (۲۶) *Baṣra nach Mekka Abh. d. k. Ges. d. Wiss. zu Gött*، سب در *Baḥrein u. Jemâma* (۲۷)، ۱۸۶۲—۱۸۷۴ء.

انیسویں صدی کے وسط تک کے سیّاح :

(۱) C. Niebuhr : *Beschreibung v. Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء؛ (۲) وہی مصنّف : *Voyage en Arabie*، ایمسٹرڈم ۱۷۷۶—۱۷۸۰ء؛ (۳) D. Badia y Leblich : *Voyages d'Ali Bey*، پیرس ۱۸۱۴ء؛ (۴) F. Kruse وغیرہ طابعین ——— *U. J. Seetzen's Reisen*، برلن ۱۸۵۴—۱۸۵۹ء؛ (۵) J. Burckhardt : *Travels in Arabia*، لندن ۱۸۲۹ء؛ (۶) G. Sadlier : [Sadleir] *Diary of a journey across Arabia*، بمبئی ۱۸۶۶ء؛ (۷) E. Ruppell : *Reisen in Nubien... u. dem peträischen Ar.*، فرینکفرٹ ۱۸۲۹ء؛ (۸) P. Aucher-Eloy : *Relations de voyages*، پیرس ۱۸۴۳ء؛ (۹) J. Wellsted : *Travels in Ar.*، لندن ۱۸۳۸ء؛ (۱۰) وہی مصنف : *Travels to the city of the Caliphs*، لندن ۱۸۴۰ء؛ (۱۱) P. Botta : *Relation d'un voyage dans l'Yèmen*، پیرس ۱۸۴۱ء؛ (۱۲) M. Tamisier : *Voyage en Ar.*، پیرس ۱۸۴۰ء؛ (۱۳) V. Fontanier : *Voyage dans le golfe persique*، پیرس ۱۸۴۴—۱۸۴۶ء؛ (۱۴) S. Elmgren : طبع *G. A. Wallins reseanteckningar*، Helsingfors ۱۸۶۴-۱۸۶۶ء؛ (۱۵) T. Arnaud، در *JA*، ۱۸۴۵ء؛ (۱۶) وہی مصنّف، در *Revue d'Égypte*، ۱۸۹۴ — ۱۸۹۵ء؛ (۱۷) H. v. Maltzan، طبع *A. v. Wrede's Reise in Ḥadhramaut*، Brunswick ۱۸۷۰ء.

انیسویں صدی کے نصف آخر کے سیّاح :

(۱) L. Pelly، در *JRGS*، ۱۸۶۵ء؛ (۲) C. Guarmani: *Northern Najd*، لندن ۱۹۳۸ء؛ (۳) J. Halévy، در *JA*، ۱۸۷۲ء؛ (۴) وہی مصنف، در *BSG*، ۱۸۷۳—۱۸۷۷ء؛ (۵) H. v. Maltzan : *Reise nach Südarabien*، Brunswick ۱۸۷۳ء؛ (۶) R. Burton : *Pers. narrative of a pilgr. to Al-Madinah and Meccah*، لندن ۱۸۹۳ء؛ (۷) وہی مصنف : *The gold-mines of Midian*، لندن ۱۸۷۸ء؛ (۸) وہی مصنف : *The Land of Midian*، لندن ۱۸۷۹ء؛ (۹) C. Huber : *Voyage dans l'Ar. centrale*، پیرس ۱۸۸۵ء؛ (۱۰) وہی مصنف : *Journal d'un voyage en Ar.*، پیرس ۱۸۹۱ء؛ (۱۱) R. Manzoni : *El Yèmen*، روم ۱۸۸۳ء؛ (۱۲) S. Miles : *The countries and tribes of the Persian Gulf*، لندن ۱۹۱۹ء؛ (۱۳) C. Doughty : *Travels in Ar. Deserta*، لندن ۱۹۳۶ء؛ (۱۴) D. Müller و N. Rhodokanakis : *E. Glasers Reise nach Mārib*، وی انا *E. Glasers Forschung-sreisen*، لائپزگ ۱۹۰۹ء؛ (۱۵) O. Weber : ۱۹۱۳ء؛ (۱۶) J. Werdecker، در

BSRGE، ۱۹۳۹ء؛ (۱۷) A. Deflers : *Voyage au Yemen*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۱۸) W. Harris : *A journey thr. the Yemen*، ایڈنبرگ ۱۸۹۳ء؛ (۱۹) J. Euting : *Taghbuch einer Reise in Inner-Arabien*، لائیڈن ۱۸۹۶—۱۹۱۴ء؛ (۲۰) L. Hirsch : *Reisen in Süd-Arabien*، لائیڈن ۱۸۹۷ء؛ (۲۱) J. و M. Bent : *Southern Arabia*، لندن ۱۹۰۰ء.

بیسویں صدی کے ربع اوّل کے سیّاح :

(۱) H. Burchardt، در *ZGEBer.*، ۱۹۰۶ء؛ (۲) E. Mittwoch، طبع *Aus dem Jemen*، لائپزگ؛ (۳) A. Jaussen و R. Savignac : *Mission archèologique en Ar.*، پیرس ۱۹۰۹ — ۱۹۲۲ء؛ (۴) A. Musil : *Ar. Deserta*، نیویارک ؛ (۵) وہی مصنف: *The narthern Hegâz*، نیویارک ۱۹۲۶ء؛ (۶) وہی مصنف: *Northern Nagd*، نیویارک ۱۹۲۸ء (۷) G. Bury : *The land of Uz*، لندن ۱۹۱۱ء؛ (۸) وہی مصنف : *Ar. infelix*، لندن ۱۹۱۵ء؛ (۹) B. Raunkiaer : *Gennem Wahhabiternes land*، کوپن ہیگن ۱۹۱۳ء؛ (۱۰) A. Wavell : *A modern pilgrim in Mecca*، لندن ۱۹۱۲ء؛ (۱۱) G. Leachman، در *GJ*، ۱۹۱۱—۱۹۱۴ء؛ (۱۲) H. Jacob : *Kings of Arabia*، لندن ۱۹۲۳ء؛ (۱۳) وہی مصنف *Perfumes of Araby*، لندن ۱۹۱۵ء؛ (۱۴) T. Lawrence : *Seven pillars of wisdom*، لندن ۱۹۳۵ء؛ (۱۵) وہی مصنف : *Secret despatches from Ar.*؛ (۱۶) H. Philby : *The heart of Arabia*، لندن ۱۹۲۲ء؛ (۱۷) وہی مصنف : *Ar. of the Wahhabis*، لندن ۱۹۲۸ء؛ (۱۸) وہی مصنف : *The empty quarter*، نیویارک ۱۹۳۳ء؛ (۱۹) وہی مصنف: *Sheba's daughters*، لندن ۱۹۳۹ء؛ (۲۰) وہی مصنف : *A pilgrim in Ar.*، لندن ۱۹۴۶ء؛ (۲۱) وہی مصنف : *Arabian Highlands*، Ithaca، نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۲۲) R. Cheesman : *In unknown Ar.*، لندن ۱۹۲۶ء؛ (۲۳) E. Rutter : *The holy cities of Arabia*، لندن ۱۹۲۸ء.

بیسویں صدی کے ربع ثانی کے سیّاح :

(۱) B. Thomas : *Alarms and excursions in Ar.*، Indianapolis ۱۹۳۱ء؛ (۲) وہی مصنف : *Arabie felix*، نیویارک ۱۹۳۲ء؛ (۳) C. Rathjens و H.v. Wissmann : *Südarabien-Reise*، Hamburg ۱۹۳۱—۱۹۳۴ء؛ (۴) وہی مصنف، در *Erdkunde*، ۱۹۴۷ء؛ (۵) وہی مصنف، در *ZGEBer*، ۱۹۲۹ء؛ (۶) C. Rathjens : *Sabaeica*، ج ۱، Hamburg ۱۹۵۳ء؛ (۷) A. Rihani : *Around the coasts of Ar.*، بوسٹن ۱۹۳۰ء؛ (۸) وہی مصنف : *Arabian peak and desert*، بوسٹن ۱۹۳۰ء؛ (۹) D. van der Meulen و H. v. Wissmann : *Ḥadramaut*، لائیڈن ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) D. v. d. M. : *Aden to the Hadhramaat*، لندن ۱۹۴۷ء؛ (۱۱) وہی مصنف : *Ontwakend Arabie*، ایمسٹرڈم ۱۹۵۳ء؛ (۱۲) D. Carruthers : *Arabian adventure*، لندن ۱۹۳۵ء؛ (۱۳) P. Harrison : *Doctor in Arabia*، نیویارک ۱۹۴۰ء؛ (۱۴) F. Stark : *The southern gates of Arabia*، نیویارک ۱۹۳۶ء؛ (۱۵) W. Ingrams : *Arabia and the isles*، بار دوم، لندن ۱۹۵۲ء؛ (۱۶) A. Hamilton : *The Kingdom of melchior*، لندن ۱۹۴۹ء؛ (۱۷) H. Scott : *In the high Yemen*، لندن ۱۹۴۷ء؛ (۱۸) G. de Gaury : *Arabia phoenix*، لندن ۱۹۴۶ء؛ (۱۹) وہی مصنف : *Arabian journey*، لندن ۱۹۵۰ء.

مخصوص علاقوں سے متعلق تصانیف :

(۱) E. Brémond : *Yèmen et Saoudia*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۲) C. Nallino : *L'Arabia Sa'ūdiana*، روم ۱۹۳۸ء؛ (۳) K. Twitchell : *Report of the U.S. agric. mission to Saudi Arabia*، قاہرہ ۱۹۴۳ء؛ (۴) وہی مصنف : *Saudi Arabia*، بار دوم، پرنسٹن ۱۹۵۳ء؛ (۵) R. Lebkicher، وغیرہ : *The Arabia of Ibn Saud*،

Das südwestliche : W. Schmidt (۶) نیویارک ۱۹۵۲ء؛ *Südara-* : A. Grohmann (۷) ۱۹۱۳ Halle ‹*Arabien bien als Wirtschaftsgebiet*› وی انا ۱۹۲۲—۱۹۳۳ء؛ N. Lambardi (۸)، در *OM*، ۱۹۴۷ء؛ E. Rossi (۹)، در *OM*، ۱۹۵۳ء؛ *An account of ...* : F. Hunter (۱۰) لنڈن ۱۸۷۷ء؛ *Aden* : F. Apelt (۱۱) ‹*Arabica* : C. de Landberg (۱۲) ۱۹۲۹ء؛ Grossenhaim L. van den (۱۳) لائیڈن ۱۸۸۶—۱۸۹۸ء؛ U. (۱۴) ۱۸۸۶ء؛ Batavia ‹*Le Hadhramout* : Berg (۱۵) روم ۱۹۱۲ء؛ *Il sultanato di Oman* : Omar G. Rentz، طبع *Oman*، قاہرہ ۱۹۵۲ء؛ (۱۶) A. Wilson : *The Persian Gulf*، آکسفرڈ ۱۹۲۸ء؛ (۱۷) S. Genthe : *Der Persicsche Meerbusen* ۱۸۹۶ء؛ (۱۸) Marburg *Geog. des Pers. Golfes* : G. Schott Hamburg *MGG* ‹*Le golfe persique* : R. Vadala (۱۹) پیرس ۱۹۱۸ء؛ Oslo ‹*Den Persiske bukt* : A. Mohr (۲۰) ۱۹۲۰ء؛ *Le golfe persique* : M. Esmaili (۲۱) پیرس ۱۹۲۹ء؛ (۲۲) برطانوی وزارت بحر : *Persian Gulf pilot*، بار نہم، لنڈن ۱۹۴۲ء؛ (۲۳) U. S. Hydrographic Office : *Sailing Directions for the Persian Gulf*، بار چہارم، واشنگٹن ۱۹۵۲ء؛ (۲۴) برطانوی وزارت بحر : *Red Sea and Gulf of Aden pilot*، بار نہم، لنڈن ۱۹۴۴ء؛ (۲۵) U. S. Hydrographic Office, : *Sailing Directions for the Red Sea and Gulf of Aden*، بار سوم، واشنگٹن ۱۹۴۳ء۔

متعلق بہ طبقات ارضی :

(۱) O. Little : *The geog. and geol. of makalla*، قاہرہ ۱۹۲۵ء؛ (۲) R. Richardson : *Die Geol. u. die Salzdome im südwest. Teile d. Pers. Golfes*، Heidelberg ۱۹۲۶ء؛ (۳) G. Lees : *The geol. and tectonics of Oman*، *Qly. Journal of the Geol. Soc.* ۱۹۲۸ء؛ (۴) وہی مصنف، در *GJ*، ۱۹۲۸ء؛ (۵) P. Lamare : *Structure géologique de l'Ar.*، پیرس ۱۹۳۶ء؛ (۶) H. v. Wissmann وغیرہ : *Beiträge zur Tektonik Arabiens*، *Geol. Rundsch.* ۱۹۴۲ء؛ (۷) C. Fox : *The geol.....of Dhufar*، کلکتہ ۱۹۴۷ء؛ (۸) R. Mikesell و H. Chenery : *Arabian Oil*، Chapel Hill ۱۹۴۹ء؛ (۹) W. Pratt : *World geog. of Petroleum*، طبع پرنسٹن ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) R. Lebikicher : *Aramco and world oil*، نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۱۱) V. Illing : *The world's oilfields*، طبع، لنڈن ۱۹۵۳ء۔

متعلق بہ نباتات و حیوانات :

(۱) E. Blatter : *Flora arabica*، کلکتہ ۱۹۱۹—۱۹۲۳ء؛ (۲) O. Schwartz : *Flora des tropischen Arabien*، Hamburg ۱۹۳۹ء؛ (۳) R. Meinertzhagen : *Birds of Arabia*، ایڈنبرگ ۱۹۵۴ء؛ (۴) W. Tweedie : *The Arabian horse*، ایڈنبرگ ۱۸۹۴ء؛ (۵) E. Rüppell : *Fische des Rothen Meeres*، فرینکفرٹ ۱۸۲۶—۱۸۳۱ء؛ (۶) K. Jessen وغیرہ : *Danish scientific investigations*، کوپن ہیگن ۱۹۳۹—۱۹۴۴ء؛ (۷) G. Bertram : *The fisheries of muscat*، ۱۹۴۹ء ؟؛ (۸) H. Forbes : *The natural hist. of Sokotra*، Liverpool ۱۹۰۳ء۔

(۶) نسلیات

جزیرہ‌نمائے عرب کے نسلیاتی مطالعے میں دشوار مسائل کی ایک بڑی تعداد حل طلب رہ جاتی ہے۔ یہاں کے سب سے پہلے باشندے کون تھے؟ وہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے یا کہیں باہر سے آئے تھے؟ اگر وہ باہر سے آئے تھے تو ان کا اصلی وطن کیا تھا؟ جس ماحول میں وہ رہتے تھے وہ کیسا تھا۔ کیا وہ آج کل کے عرب ماحول سے بہت مختلف تھا؟ وقت گزرنے پر قدیم‌ترین باشندوں میں باہر سے در آنے والے

کون سے عناصر شامل ہوتے گئے ؟ عرب کہلانے کے مستحق سب سے پہلے لوگ کون تھے اور وہ کہاں سے آئے تھے؟

ان اور ان کے مماثل سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش میں کسی حد تک ترقی ضرور ہوئی ہے، لیکن اس سے پہلے کہ زیادہ قرین قیاس مفروضات میں سے کسی کو تاریخی حقیقت کا مرتبہ دیا جا سکے ابھی بہت زیادہ کام کرنا ضروری ہے ۔ جزیرہ‌نما کے ارضی اور جغرافیائی کوائف کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے ۔ بہت سے سودمند قدیم آثار کے اکتشاف کی ضرورت ہے اور موجودہ باشندوں اور ان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مکمّل تحقیقات لازمی ہے ۔ علاوہ ازیں عرب کے مسائل کا حل بہت حد تک دوسرے علاقوں سے متعلّق کام کی کامیابی پر منحصر ہو سکتا ہے، مثلاً عربوں کی اصل و نسل کا مسئلہ سامیوں کی اصل و نسل کے وسیع‌تر مسئلے سے اس طرح وابستہ ہے کہ اسے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا، یعنی ان بہت سی اقوام کی اصل و نسل سے جو اس خاندان کی زبانیں بولتے ہیں جس سے عربی زبان کا تعلق ہے ۔

جزیرۃ العرب میں انسان کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں جو شہادت مل سکتی ہے اُس سے یہ پتا چلتا ہے کہ یمن کے بلند خطّوں کے باشندے شاید دنیا میں وہ بڑا گروہ ہیں جن میں سب سے کم آمیزش ہوئی ہے اور اب وہی اس نسل کے نمائندہ ہیں جسے ماہرین نسلیات قدیمہ بحر متوسط یا بحیرۂ روم کی نسل (Mediterranean race) کہتے ہیں ۔ ان پہاڑی لوگوں کے مشرق میں کہا جاتا ہے کہ ایک Veddoid [Veddas، یعنی سیلون کے اصلی باشندوں کی] نسل کی آمیزش بھی دیکھنے میں آتی ہے، بالخصوص مَہْرہ کے قبیلے اور جنوب کے دیگر قبائل میں جو اپنی ایسی سامی بولیاں بولتے ہیں جو عربی سے مختلف ہیں ۔ اس سیلونی نسل کی آمیزش اور بعض دیگر معلومات سے یہ ذہن میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا دور دراز کے مشرقی ممالک، شاید ہندوستان یا سیلون سے قدیم تعلّق رہا ہوگا۔ شمال کے بدوی بھی جو اکثر اہل یورپ کے نزدیک عرب کے قدیم‌ترین باشندے ہیں، بنیادی طور پر بحیرۂ روم کی نسل سے ہیں، اگرچہ بالکل ایسے مخصوص طریقے پر نہیں جیسے کہ یمن کے پہاڑی۔ ساحلوں کے ساتھ ساتھ سب جگہ اور ذرا کمتر کثرت سے اندرون ملک میں بعض اور نسلی آمیزشیں بھی پائی جاتی ہیں، بعض اوقات تو بآسانی قابل شناخت شکلوں میں اور بعض دفعہ سطح سے اتنے نیچے پڑے ہوے کہ ان کی پہچان ناممکن ہو جاتی ہے ۔

ان اسرار و غوامض کی نقاب کشائی آثار قدیمہ اور نسلیّات کے ماہرین کا کام ہے [نیز رک بہ بدوی] ۔ اسلام کا مطالعہ کرنے والے کے لیے زیادہ اہم وہ تصوّر ہے جو عرب—بالخصوص مسلم عرب— اپنے نسلیاتی ارتقا کے بارے میں رکھتے تھے اور بہت حد تک اب بھی رکھتے ہیں ۔ یہ تصوّر اس قدر عام ہے اور اس پر ان کا اعتقاد اتنا مضبوط ہے کہ وہ ماہرین نسلیات کی جانب سے بھی غور و فکر کا مستحق ہے ۔

عربوں کے اپنے تصوّر کے بیج بہت قدیم زمانے میں بوئے گئے تھے، لیکن یہ تعیین دشوار ہے کہ کتنے قدیم زمانے میں، اس لیے کہ جو مآخذ ملتے ہیں وہ نسبۃً متأخّر عہد کے ہیں، اگرچہ اس تصوّر کی بنیادی جزئیات کا ارتقا ظہور اسلام سے پہلے ہو چکا تھا، تاہم زمانۂ قبل اسلام کے متعلّق معلومات کا جائزہ لینے میں احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ مآخذ

نہ صرف ظہور اسلام کے بہت بعد ضبط تحریر میں آئے تھے، بلکہ آغاز اسلام کے بعد اس کے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اور اس طرح ان معلومات کی مکمل صحت بھی اکثر معرض شک و شبہہ میں ہوجاتی ہے ۔ مزید برآں عربوں کے تصوّر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے زمانے میں بھی مختلف طرح کی تحسین و تہذیب کا عمل جاری تھا اور بعد میں بھی جاری رہا ۔ آخر میں اسلام نے مسلمانوں کی مواخات اور عرب و غیر عرب کی مساوات کے عقیدے کی بنا پر ملّت کی زندگی کے نصب العین کی حیثیت سے عربوں کے تصوّر کے بالمقابل ایک نیا تصوّر پیش کر دیا ۔

مسلم ماہرین انساب نے عرب تصوّر کی توضیح اور اس کے عملی اطلاق کے لیے ایک مفصل اور عمدہ نظام مرتّب کیا ہے ۔ اگرچہ اس نظام میں کمزوریاں موجود ہیں—ابتدائی مراحل میں بعض مبہم باتیں، ظاہرہ خلائیں، غیر حل شدہ معمّے، غیر مربوط اور متضاد چیزیں— تاہم بحیثیت مجموعی یہ خاصا متوازن ہے ۔ سب سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ اس عرب تصوّر کے ابتدائی نظریات، جو اس کی جڑ ہیں محض علما کی ملکیت نہیں رہے ہیں، بلکہ ان کے مالک عوام ہیں اور عرب کی سیاست اور معاشرتی زندگی پر ان کا اثر گہرا اور عام رہا ہے ۔

عرب تصوّر کی رو سے عرب ایک نسل ہیں نہ کہ صرف ایسے لوگوں کی ایک جماعت جو ایک ہی زبان بولتے ہیں ۔ یہ نسل بےشمار مردوں اور عورتوں سے مل کر بنی ہے جن میں سے ہر ایک براہ راست دو اعلیٰ مورثوں میں سے کسی ایک کی اولاد ہے، جو خود غالباً قریبی رشتے دار نہ تھے (ان دونوں مورثوں کا باہمی تعلّق اس نظام کے اُن بڑے پہلوؤں میں سے ہے جو ابھی تک حل نہیں ہوئے) ۔ اگر سب عربوں کے ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد ہونے پر اصرار کیا جاتا تو صرف اسی طرح زیادہ ہم جنسیّت پیدا ہو سکتی تھی ۔ یہ حقیقت کہ عربوں نے اپنی واضح اور غیر متنازع روایت میں اپنی اصل کی دوئی کا اعتراف کیا، ایک بہت معنی خیز بات ہے اور عربوں اور اسلام کی تاریخ پر اس کا دوررس اثر ہوا ہے ۔

عرب نسّابوں کے نظام کی ابتدا اُن قوموں کے سرسری ذکر سے ہوتی ہے جنھیں عرب جزیرہ نما کے اصلی باشندے مانتے تھے، یعنی ایسے قبائل جیسے کہ عاد، ثَمُود، ارم، جُرہُم، طَسْم اور جدیس (رَکّ بآنہا) جن سب کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وہ آغاز اسلام سے پہلے معدوم ہو گئے تھے ۔ ان میں سے بعض، مثلاً عاد اور ارم ممکن ہے بالکل افسانوی ہوں ۔ بحالیکہ بعض مثلاً ثَمُود کی تاریخی حیثیت کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہے ۔ ان قبائل کی اصل و نسل سے متعلّق یقینی طور پر کوئی علم نہیں، اگرچہ انھیں بالعموم عرب سمجھا جاتا ہے، یعنی گم شدہ عرب (العرب الباعدہ) بعض اوقات انھیں حقیقی عرب (العرب العاربہ) بھی کہا جاتا ہے، جو زیادہ تر بے معنی ہے کیونکہ عرب تصوّر میں انھیں عموماً ایک انوکھی چیز اور ان لوگوں کی ایک مثال سمجھا جاتا ہے جنھوں نے اپنے انبیا کی بات نہیں سنی اور اس لیے ان کا انجام خوفناک ہوا ۔ اگرچہ متأخّر زمانے میں بعض ایسے لوگ تھے جو ان قدما کی اولاد ہونے کے مدّعی تھے، بلکہ ایسے قبائل بھی تھے جن کی بابت مشہور تھا کہ ان کی نسل سے ہیں، تاہم ماہر انساب ابن حَزْم (م ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء) اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ''روے زمین

پر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا ان کی اولاد سے ہونا مصدّق ہو'' (طبع Lévi-Provençal، ص ۸) .

قدیم اصل باشندوں سے اس طریقے پر بھگتنے کے بعد، عرب تصوّر دو بڑے مورثوں، قَحْطان اور عَدْنان (رکّ بآنہا) پر مرکوز ہوجاتا ہے، نیز عرب نسل کے اُن دو بڑے حصّوں پر جن کے وہ مورث اعلٰی تھے۔ چونکہ سب انسان حضرت آدمؑ کی نسل سے ہیں، لہٰذا ان دونوں کا کوئی نہ کوئی دور کا رشتہ ضرور ہوگا۔ زیادہ قریبی رشتے کے سوال کا انحصار اس پر ہے کہ آیا قَحْطان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تھا جنھیں عَدْنان کا مورث اعلٰی مانا جاتا ہے۔ ایک رائے جو بہت سے لوگ رکھتے ہیں اس کی مخالف ہے کہ قحطان حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھا کیونکہ اس کا نسب سام بن نوحؑ سے ایک جداگانہ حیثیت سے ملایا جاتا ہے۔ قحطان کی اولاد کو بالعموم ''حقیقی عرب'' (العرب العاربہ یا ارباع) کہا جاتا ہے اور عدنان کی اولاد کو معرّب عرب (العرب المتعربہ یا المُستعربہ)، اگرچہ اس بیان کا غیر یقینی ہونا بعض اور بیانات کی موجودگی سے عیاں ہے جن میں سے ایک گم شدہ عربوں اور قَحْطان کو حقیقی عربوں کی حیثیت سے ایک ہی ذیل میں رکھتا ہے، بحالیکہ ایک اور حقیقی عربوں کا نام گم شدہ عربوں کے لیے مخصوص کر دیتا ہے اور قَحْطانی عربوں کو متعرّبہ اور عدنانیوں کو مُستعربہ بتاتا ہے۔ بہرحال بنو قَحْطان بنو عدنان کے مقابلے میں حقیقی عربیت کے واضح طور پر زیادہ قریب ہیں .

قَحْطان کی اولاد جنوبی عرب، یعنی قبائل یمن ہیں جن کا اصلی وطن روایۃً جزیرہ‌نما کا جنوب مغربی گوشہ سمجھا جاتا ہے، بحالیکہ عدنان کی اولاد شمالی عرب ہیں جن کی بابت یہ خیال ہے کہ وہ سب سے پہلے جزیرہ نما کے شمالی نصف حصّے میں نمودار ہوئے تھے۔ آیا اس روایتی تقسیم کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہے؟ یہ ایک معرض بحث سوال ہے، مثلاً بعض معلومات سے یہ پتا چلتا ہے کہ سَباء یمن میں شمال سے آئے تھے، حالانکہ عرب نسّابوں کے نظام میں سَباء قَحْطان کے پرپوتے اور حِمْیَر اور کَہلان کے باپ کا نام ہے، جو جنوبی عربوں کی دو بڑی شاخوں کے مورث اعلٰی تھے .

جنوبی عرب کی قدیم ریاستوں کے لوگوں سبائی، مینائی [رکّ بآنہا] کو حمیر کی اولاد شمار کیا جاتا تھا، اور اس لیے عربی زبان میں لفظ حمیر ایک ایسی جامع اصطلاح بن گیا جس میں ان ریاستوں کی تہذیب و تمدن کا مفہوم شامل تھا جن لوگوں کو غیر مشروط طور پر حمیر کی اولاد سمجھا جاتا تھا، ان میں سے بہت کم نے اسلامی عہد میں کوئی اہم کردار ادا کیا، بلکہ اس وقت سب سے زیادہ نمایاں بنو کَہْلان تھے جن میں طَیّء، مَذْحِج، ہمدان اور الأَزْد شامل تھے۔ الأَزْد کی ذیلی شاخوں میں الأَوْس اور الخَزْرج تھے جو مدینے میں رہتے تھے اور جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے انصار کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں شہرت حاصل کی۔ لَخم، غسّان اور کَہْلان کے دیگر قبائل جزیرہ‌نما کے شمال وسط میں آغاز اسلام سے بہت پہلے آباد ہو چکے تھے، اور اسی لیے چھٹی اور ابتدائی ساتویں صدی کے نقشے میں ایک عجیب مرقّع‌کاری نظر آتی ہے جس میں جنوبی نسل کے بہت سے عربوں کے علاقے ان علاقوں کے شمال میں ہیں جو شمالی عربوں کے ہیں .

عَدْنان، یعنی شمالی عربوں کے معروف عام مورث اعلٰی کی شخصیت بظاہر قَحْطان سے بھی

زیادہ غیر واضح ہے، اور اسی لیے شمالی عربوں کا عام دستور یہ رہا ہے کہ وہ بسا اوقات اپنا نسب عدنان کے بیٹے مَعَدّ، بلکہ اس کے پوتے نزار سے آگے نہیں ملاتے - نزار کے بیٹے مُضَر اور ربیعہ شمالی عربوں کی دو بڑی شاخوں کے مورث اعلیٰ تھے، بحالیکہ ایک تیسرے بیٹے ایاد کی اولاد کے افراد اسلامی عہد تک زیادہ‌تر نظر سے اوجھل ہو گئے تھے - مُضر کی دو بڑی شاخوں میں سے ایک قیس عَیْلان اتنی اہم تھی کہ قیسی کی اصطلاح اکثر سب شمالی عربوں کے لیے استعمال ہوتی تھی - اس شاخ میں ھَوازِن اور سُلَیم شامل تھے اور خالی ہوازن میں ایسے قابل ذکر قبیلے شامل تھے جیسے کہ ثَقیف اور عامر بن صَعْصَعہ کا پورا گروہ (قُشَیر، عُقَیل، جَعدۃ، کلاب اور ہلال) - مضر کی دوسری بڑی شاخ خِنْدف ہیں - ھُذَیل، تمیم اور سب سے بڑھ کر تمام کِنانہ شامل تھے اور اس آخرالذکر قبیلے کی ایک ذیلی شاخ قریش تھے - اگرچہ شمالی عربوں کو اپنی اصل کے اعتبار سے ''عربیت'' میں وہ مقام حاصل نہ تھا جو ان کے جنوبی قرابت داروں کو نصیب تھا، لیکن اس واقعے کی بدولت کہ خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے شمالی قبیلے سے تھے اسلام میں ان کا وقار بہت حد تک بحال ہو گیا ہے .

ربیعہ سے عَنَزہ، عبدالقَیس، النَّمِر، تغلب نامی قبیلے اور بکر بن وائل کا زبردست گروہ نکلے جس کا ایک رکن حنیفہ تھا - ظہور اسلام سے خاصے پہلے مضر اور ربیعہ کے ابتدائی گروہ منتشر ہو گئے؛ مُضَر کے قدیم لوگ دریاے فرات کے اس علاقے میں چلے گئے جو ان کے نام پر دریاے مُضَر کہلاتا ہے اور ربیعہ کے قدیم لوگ دریاے دجلہ پر واقع اس خطّے میں جو ان کے نام پر دیار ربیعہ کہلانے لگا، لیکن اس کی بہت سی شاخیں پیچھے جزیرہ‌نما میں رہ گئیں، یعنی ھُذَیل طائف کے نواح میں، سُلَیم ان پہاڑوں میں جو مکّے اور مدینے کے درمیان ہیں؛ تمیم اور حنیفہ اور عامر بن صَعْصَعہ کے مختلف ارکان مرکز میں اور عبدالقیس مشرق میں .

قحطان اور عدنان کے مابین ایک گونہ عناد کا وہ رویّہ جو بہت قدیم زمانے سے چلا آیا تھا اس رقابت کی وجہ سے اور بڑھ گیا جو مدینے کے انصار اور مکّے کے قریش کے درمیان پیدا ہو گئی تھی اور جو شروع کے اسلامی حکمران خاندانوں کی تاریخ میں ایک غیر معمولی اہمیت کا عامل بن گئی اور جس کے اثرات دُور دراز کے ملک اندلس تک جا پہنچے . دنیاے اسلام میں عرب عنصر کے زوال کی بدولت آخر کار جنوب اور شمال کی یہ آویزش اور معرکہ آرائی روز بروز تنزل‌پذیر چیز بنتی گئی - جزیرہ‌نما کے صرف ایک حصّے، عمان، میں یہ قدیم بغض وعناد ایک زندہ قوت کی حیثیت سے آج تک قائم رہا ہے - صدیوں تک عمان میں شمالی عربوں کو نزاری اور جنوبی کو یمنی کہتے رہے - ایک خانہ جنگی کے نتیجے میں جو وہاں ابتدائی اٹھارھویں صدی میں رونما ہوئی، شمالی عرب غفّاری کہلانے لگے اور جنوبی ہناوی اور یہ امتیاز اب بھی اہمیت رکھتا ہے .

عربوں کے نظام انساب میں قُضاعہ کے معاملے میں ایک بڑی بے قاعدگی پائی جاتی ہے - کئی قبائل — بَحْراء، جُہَیْنَہ، بَلِی، تَنُوخ، کَلْب وغیرہ — ایک مشترک مورث اعلیٰ قُضاعہ نامی کو مانتے تھے، لیکن اس پر اتفاق راے نہ تھا کہ وہ جنوب کا تھا یا شمال کا - بعض کہتے تھے کہ وہ عدنان کا ایک بیٹا تھا، بحالیکہ بعض دوسرے یہ کہتے تھے

کہ وہ حِمیَر کا پوتا یا اس کے متأخّر اَخلاف میں سے تھا ۔ نسّابون نے بھی یہ اعلان کرنے کا حیلہ اختیار کیا کہ سب عرب تین اشخاص کی اولاد سے ہیں— قَحطان، عَدْنان اور قُضاعہ— لیکن اس کا کوئی اشارہ نہیں کیا کہ قضاعہ ایک تیسرے عنصر کی نمائندگی کرتا ہے جو نہ جنوبی تھا اور نہ شمالی ۔ اسلام کے ابتدائی عہد کے دوران جنوبی اور شمالی عربوں کی باہمی آویزشوں میں قضاعہ کا رجحان جنوبی عربوں کی حمایت کی جانب رہا؛ نسب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، عام طور پر قضاعہ کو حمیر کی وساطت سے قحطان کی نسل سے بتایا جانے لگا، امویوں کے زمانے میں قضاعہ کے بنو کلب جنوبی عربوں کے حامیوں کی حیثیت سے آگے بڑھے ۔

عبّاسی عہد سے لے کر اب تک عرب کی تاریخ کے مطالعے میں ایک ہزار سال پہلے کے اور آج کل کے قبائل کے درمیان روابط کی تعیین میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ Oppenhein ، Braunlich اور Cashel نے اپنی تصنیف *Dis Beduinen* میں شمالی اور وسطی عرب کے قبائل کے بارے میں اب تک سب سے زیادہ پُر حوصلہ کوشش کی ہے، لیکن باوجود اُس قابل ستائش کامیابی کے جو انھیں حاصل ہوئی ہے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ۔ اس عرصے کے دوران میں جب اسلامی حکومت کا مرکز خود عرب میں یا اس کے نزدیک تھا ۔ خاصی بہت سی معلومات حاصل ہیں اور یہی بات گزشتہ دو صدیوں پر بھی صادق آتی ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان سیکڑوں برس تک ان کی کہانی پردۂ خفا میں رہتی ہے ۔ بڑے پیمانے پر کئی ہجرتیں ہوئیں جن کے بارے میں محض سرسری بیانات دست یاب ہو سکے ہیں ۔ ایک قبیلے سے الگ ہو کر بعض عناصر کسی دوسرے قبیلے میں مل گئے یا پورے پورے قبیلوں نے اپنی حیثیت تبدیل کر کے نئی گروہبندیاں قائم کر لیں ۔ بدویوں کی عوامی روایت میں ان تبدیلیوں کی کچھ یاد محفوظ رہ گئی ہے، لیکن یہ روایت قابل اعتماد ہونے سے بہت بعید ہے ۔ چوتھی/ گیارھویں صدی میں الہمدانی نے کسی مخصوص نام کے قبائل کے اسی نام کے کسی زیادہ طاقتور یا زیادہ مشہور قبائل کے ملحق ہو جانے کے رجحان کا ذکر کیا ہے اور یہ رجحان اب بھی باقی ہے ۔ خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بنو حنیفہ کے درمیان نبیِ کذّاب مُسَیْلمہ کے ظہور کے باعث یہ قبیلہ بدنام ہوگیا؛ آج جو بنو حنیفہ نجد میں رہتے ہیں وہ ربیعہ کو اپنا مورث اعلٰی بنانے کو ترجیح دیتے ہیں جس کی اولاد سے حنیفہ تھا، لیکن اتنے بہت سے اور قبائل کا نام ربیعہ ہے اور روایتی نظام انساب سے عوام کی واقفیت اس قدر کم ہے کہ نتیجہ اکثر مکمّل التباس اور غلط فہمی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے ۔ الدَّواسِر کے موجودہ زمانے کے قبیلے کے ہاں یہ روایت ہے کہ ان کے مورث اعلٰی کا نام عمر تھا ۔ عام دَوْسَری اس عمر کو حضرت عمرؓ بن الخطّاب سمجھ لیتا ہے حالانکہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھے ۔ عمان کے علاقے الباطنہ میں بنی غافِر نام کا جو قبیلہ آج کل آباد ہے، اس سے قبائل کی اکثر غیر مستقل حیثیت کی ایک مثال ملتی ہے، چنانچہ بحالیکہ عمان کے شمالی عرب اب اس قبیلے کے نام پر غافِری کہلاتے ہیں یہ قبیلہ خود جس طرح شمالی اور جنوبی عربوں کے مابین اپنی وفاداری کو ادھر ادھر تبدیل کرتا رہا ہے اور اس کے باعث بدنام ہو گیا ہے ۔

آج کل کے بعض بڑے قبیلے جیسے کہ تمیم وسط میں اور بیدان جنوب مغرب میں، بظاہر عموماً وفاداری کے ساتھ ان بڑے قبائل کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان ناموں سے موسوم تھے اگرچہ مرور زمانہ سے ان کے بہت سے ارکان الگ ہو کر اپنی اصلی حیثیت کھو چکے ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو اس یا اُس قبیلے سے اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ اس میں بالکل ضم ہو کر رہ گئے ہیں ۔ ممکن ہے کہ قحطان کا موجودہ قبیلہ جنوبی عربوں کی اصلی قوم کے کسی ایک حصّے یا حصّوں کا بقیّہ ہو، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کا باہمی تعلّق اور بھی زیادہ نازک اور خفیف ہو، اس کے باوجود کہ عرب کے بدوی اب بھی اس قبیلے کو سب جنوبی عربوں کے باپ [قحطان] سے وابستہ کرتے ہیں ۔ اسلام کے آغاز سے قبیلۂ قریش کی قسمت کے اُتار چڑھاؤ کا سراغ لگانے کے لیے ۔ علاوہ اور چیزوں کے ہمیں ان ہزاروں لاکھوں سیّدوں اور شریفوں کی تاریخ اور موجودہ حیثیت کو تحقیق کرنا پڑے گا جو نہ صرف سارے عرب میں بلکہ اسلامی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوے ہیں ۔

زمانۂ حال کے کسی قبیلے کے ارکان ایک ہی مورث اعلٰی کی نسل سے ہونے پر شاید بضد مصر ہوں، بحالیکہ ایک اور قبیلے کے ارکان بلاتامل یہ اعتراف کر سکتے ہیں کہ وہ مختلف عناصر سے مل کر بنے ہیں ۔ العُجمان اور آل مُرّہ کے قبائل جو دو سو سال پہلے نجران کے قرب و نواح سے ہجرت کرکے مشرقی عرب میں آئے تھے، یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ وہ یام کے توسّط سے حمدان کی نسل سے ہونے میں جنوبی عربوں کے شریک ہیں ۔ ان کی جسمانی خصوصیات، ان کی بول چال اور ان کی زندگی اور تاریخ کے دوسرے پہلوؤں سے ان کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف بعض بڑے قبائل، مثلاً اندرون عرب کے عُتیبہ اور مُطَیر، رشتۂ اتحاد میں مربوط ایسے مخلوط قبیلے ہیں جن کے آباو اجداد غالباً پانچ یا چھے سو برس پیشتر مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وفاق عارضی ہوں، مثلاً نُعَیم کا وفاق جو عمان میں ہے ان دنوں بظاہر اپنے دو بڑے اجزاے ترکیبی، آل بوخُرَیبان اور آل بوشامس، میں منقرض ہو رہا ہے اور نُعَیم کا پرانا نام اب صرف اکثر آل بوخُرَیبان کے لیے استعمال ہونے لگا ہے بحالیکہ نُعَیم کے دیگر ارکان کا، جو تقریباً ۵۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر مغرب میں آباد ہیں، اب بڑے قبیلے سے کوئی قریبی تعلّق نہیں رہا ۔

ان تمام نسلی اختلافات اور غیر یقینی باتوں کے باوجود ہم اس سے متأثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بیشتر عرب نسل کی پاکیزگی کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں ۔ تمام انسان [ان کے نزدیک] دو قسم کے ہیں : ایک وہ جن کی نسل کو سب لوگ خالص عربی (اصیل) مانتے ہیں اور دوسری ادنٰی نوع کی مخلوط نسل ۔ بدوی جو اپنے نزدیکی آبا و اجداد سے صرف چھے یا آٹھ پیڑھیوں تک واقف ہے پھر بھی اپنی شرافت نسل کا یقین رکھتا ہے ۔ کسی مسلّمہ پاکیزہ نسل کے قبیلے سے اس کی وابستگی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ اس کا اس سے آگے کا نسب بھی بے عیب ہے ۔ خون کی پاکیزگی شادی بیاہ کے متعلّق سخت قواعد کے ذریعے محفوظ رکھی جاتی ہے جن کی کم از کم بدوی، کبھی خلاف ورزی نہیں کرتے ۔ خالص اور نا خالص کا یہ امتیاز جو بدویوں میں سب

سے زیادہ مضبوطی سے قائم ہے، بہت حد تک نخلستانوں اور شہروں میں بھی جا پہنچا ہے، بالخصوص ان میں جو ساحلوں سے دور ہیں، ان میں بہت سے شہری لوگ کسی ایک یا دوسرے قبیلے سے اپنی وابستگی کا احساس زندہ رکھتے ہیں ۔ تمام شہریوں کو نجد میں بنی خُضیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک عام اصطلاح ہے جن کی اصل و نسل کا سراغ کسی مخصوص قبیلے تک نہیں لگایا جا سکتا ۔

صحرا میں چند خانہ بدوش قبیلے عام اتّفاق رائے سے اس بنا پر مطعون ہیں کہ وہ غیر عربی نسل سے ہیں ۔ ان میں ایک قبیلۂ صُلَبہ [رَکّ بآن] ہے جو شمال میں آباد ہے اور جس کے ارکان کے جسمانی خواص، نیز ان سے متعلّق عوامی روایات کسی ایسی اصل پر دلالت کرتی ہیں جو غیر معمولی طور پر پردۂ خفا میں ہے، اگرچہ یہ کہانی جسے بارہا دہرایا گیا ہے، بے بنیاد ہے کہ وہ آوارہ گرد صلیبیوں کی اولاد ہیں ۔ شمال میں اسی قسم کے دیگر قبائل حُطیم اور شَرارات ہیں ۔ مشرق کا قبیلہ العوازم سعودی عرب کی افواج میں گزشتہ چالیس برس کے دوران میں اپنی بہادری اور جواں مردی کی بنا پر اپنے ادنٰی مرتبے سے کسی قدر بلند ہو جانے میں کامیاب ہو گیا ہے ۔

ساحلوں کے ساتھ ساتھ، بندرگاہوں اور ان شہروں میں جو زیادہ اندرون ملک میں نہیں ہیں، خارجی اور غیر معیّن نسلی عناصر کے سب سے بڑے امتزاجات پائے جاتے ہیں ۔ بعض سطحوں میں یہ باہر سے آنے والے ایسے لوگ ہیں جن کی اصل و نسل بخوبی معلوم ہو سکتی ہے، مثلاً جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ اور البحر الاحمر پر صومالی اور ہندوستانی ۔ مسقط کی سلطنت اور خلیج فارس کی بندرگاہوں میں بنیے یا ہندوستانی سوداگر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ دوسری صورتوں میں نامعلوم اصل و نسل کے لوگوں کی صف بندی زیادہ‌تر ان کے پیشے کی بنیاد پر کی جاتی ہے، جیسے کہ جنوبی عرب کے ملازم پیشہ لوگ جو صبیان اور اَخْدام کہلاتے ہیں ۔ چونکہ دور دور کے ملکوں کے بہت سے مسلمان ارض مقدّس میں رہنے اور مرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں لہٰذا مکّے میں ایک نمایاں طور پر مخلوط آبادی موجود ہے، جس میں نام نہاد جاوی اور بخاری نو آبادیاں (جو علی الترتیب انڈونیشیا اور وسطی ایشیا سے آنے والے آبادکاروں نے بنائی ہیں) سب سے بڑی بستیوں میں سے ہیں ۔ بعض خارجی عناصر، مثلاً مغرب سے آنے والے حبشیوں اور مشرق سے آنے والے ایرانیوں کی عرب میں تاریخ دو ہزار برس یا اس سے بھی زائد عرصے تک پیچھے جاتی ہے، لیکن وہ کبھی بڑی تعداد میں نہیں آئے اور ایسی جگہیں بہت کم ہیں جہاں کے بیشتر باشندوں نے، بالخصوص زبان اور مذہب کے اہم معاملوں میں، اپنا بنیادی کردار قائم رکھا ہے ۔ بعض دیگر غیر ملکی عناصر، مثلاً وہ بلوچی جو عمان کے اندرونی علاقے میں آباد ہیں، اتنے مکمّل طور پر معرّب ہو گئے ہیں کہ ان کے عرب ہمسائے اب انھیں اصیل سمجھنے لگے ہیں ۔

عرب میں نسلی معاملات اکثر مذہبی اغراض سے مخلوط کر دیے جاتے ہیں ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے اخلاف کو، جن کا لقب الحجاز میں بالعموم شریف اور یمن اور حضرموت میں سیّد ہوتا ہے، ملّت اسلامیہ میں بعض اوقات ایک مستحق مراعات ذات مانا جاتا

ہے، بحالیکہ بعض اور اوقات میں وہ صحرا میں سیدھے سادے خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ حضرموت کے کثیر التّعداد سیّد، جنھیں غیرمعمولی جاہ و مرتبہ حاصل ہے، سب کے سب خاندانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی نسل سے ہونے کے مدّعی ہیں، جو چوتھی/دسویں صدی کے نصف اوّل میں عراق سے ترک وطن کرکے حضرموت آیا تھا۔ عمان میں سیّد کا لقب عام طور پر مسقط کے سلطان کو دیا جاتا ہے جسے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی نسل سے ہونے کا کوئی دعوٰی نہیں ہے اور نجد میں شرفا کی تعداد قابل ذکر طور پر کم ہے۔ مشرقی عرب میں زیادہ تر سیّد شیعیوں میں ملتے ہیں۔ اس وجہ سے سنّی بدوی ان کی نسل کو مستند نہیں مانتے۔ یہودی جن کی عرب میں تاریخ زمانۂ جاہلیت میں خاصی دور تک جاتی ہے، ممکن ہے کہ شروع میں اسرائیلی ہوں جو جنوب کی طرف چلے آئے، یا عرب جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا اور یا ان دونوں کا مجموعہ۔ یہودی جو ایک زمانے میں جنوب مغرب میں خاصی بڑی تعداد میں تھے، تقریباً سب کے سب گزشتہ چند سالوں کے دوران میں اسرائیل چلے گئے ہیں۔

غلامی جس کو اسلام نے بحیثیت ایک ادارے کے [چند شرائط کے ساتھ] اجازت دی ہے، ابھی زمانۂ حال تک جزیرہ‌نما میں رائج تھی، اگرچہ اب یہ ختم ہو رہی ہے۔ غلاموں کی بہت بڑی اکثریت وسطی افریقیہ سے آتی تھی اور حبشی خون کی آمیزش عرب کے قلب میں واقع الأفلاج کے دیہات تک میں پائی جاتی ہے۔ دیگر اسلامی ممالک کی طرح عرب بھی گورے کالے کی تمیز کی لعنت سے مبرّا رہا ہے اور آزاد شدہ غلاموں نے بعض موقعوں پر معاشرے میں با رسوخ مراتب حاصل کیے ہیں۔ ایک اور حبشی عنصر ان نام نہاد تکارنہ میں موجود ہے، جو افریقیہ کی نصف مسافت، اکثر پیدل طے کرکے حج کے لیے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض ارض مقدّس میں روزی کمانے کی غرض سے وہیں رک جاتے ہیں، جہاں ان کی جھونپڑیاں جدّہ کی بیرونی بستیوں میں واقع ہیں۔

اگرچہ جزیرہ نما کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ اور جزیرہ‌نما سے زیادہ دور کے زرخیز شمالی علاقوں کی جانب ہجرتیں گزشتہ صدیوں میں بہت عام طور پر ہوتی رہی ہیں، تاہم عرب کے عربوں میں سے نسبۃً بہت کم کو یہ شوق ہوا کہ وہ سمندروں کو عبور کرکے خارجی ممالک میں اقامت گزیں ہو جائیں۔ ان میں سے زیادہ تر ایک تو عمان کے لوگ ہیں جو قدیم زمانے سے مشرقی افریقیہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت اور جنوبی جزائر، مثلاً زنجبار میں آباد ہو گئے ہیں اور دوسرے حضرموت کے باشندے جن میں سے بہت سوں نے ابھی زمانۂ حال میں انڈونیشیا کے مجمع الجزائر، جزیرہ‌نمائے مالیشیا اور ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان میں انھیں [سابق] نظام حیدر آباد کی مملکت میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ مشرقی عرب کے عربوں نے خلیج فارس کو عبور کرکے ایران کے ساحل کے ایک بڑے حصّے میں بود و باش اختیار کر لی ہے اور یمن کے جہازرانوں نے ایسے دور افتادہ مقامات، مثلاً wales کے شہر Cardiff میں چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں قائم کر لی ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن ھشام: التّیجان فی مُلوک حمیر، حیدرآباد ۱۳۴۷ھ؛ (۲) عَبید بن شَریہ: اخبارالیمن، حیدرآباد ۱۳۴۷ھ؛ (۳) مُصْعَب الزّبیری: نسب قریش،

قاهره ۱۹۵۳ء؛ (۴) المبرّد : نسب عدنان و قحطان، قاهره ۱۹۳۶ء ؛ (۵) ابن دُرَید : الاشتقاق ، گوتنگن ۱۸۵۴ء؛ (۶) ابن حزم : جمهرة انساب العرب ، قاهره ۱۹۴۸ء؛ (۷) ابن عبدالبرّ : القَصْدُ و الامَمّ اور الانباه ، قاهره ۱۳۵۰ھ ؛ (۸) عمر ابن رسول : طُرفة الاصحاب ، دمشق ۱۹۴۹ء ؛ (۹) ابن عنابه : عمدة الطّالب ، نجف ، بلا تاریخ؛ (۱۰) القلقشندی : نهایة الارب، بغداد ۱۳۳۲ھ؛ (۱۱) محمدبن احمدالحسینی:بحرالانساب، قاهره ۱۳۵۶ھ ؛ (۱۲) ابن لیبون : تاریخ، مکّه ۱۳۵۷ھ ؛ (۱۳) السُّوَیدی : سبائک الذهب، بغداد ۱۲۸۰ھ ؛ (۱۴) محمود الآلوسی : بلوغ الارب ، بغداد ۱۳۱۴ھ؛ (۱۵) جرجی زیدان : انساب العرب، طبع ثانی، قاهره ۱۹۲۱ء؛ (۱۶) عمر رضا کحّاله : مُعْجَم قبائل العرب ، دمشق ۱۹۴۹ء ؛ (۱۷) محمّد سعید الاَصْبَحی : سُلالَةُ قحطان، عدن ۱۹۴۱ء .

[یورپی مآخذ] (۱) E. Braunclich، در *Islamica*، ۱۹۳۴ء؛ (۲) E. Brauer : *Ethnol. der jemenit. Juden*، هائیدل برگ ۱۹۳۴ء؛ (۳) J. Burckhardt : *Notes on the Bedouins*، لندن ۱۸۳۱ء؛ (۴) C. Coon، در *Papers of the Peabody museum*، ۱۹۴۳ء؛ (۵) H. Dickson : *The arab of the desert*، طبع ثانی، لندن ۱۹۵۰ء؛ (۶) V. Dowson، در *IRCAS*، ۱۹۴۹ء؛ (۷) C. Feilberg : *La tente noire*، کوپن هاگن ۱۹۴۴ء؛ (۸) H Field، در *The Open Court*، ۱۹۳۲ء؛ (۹) E. Glaser، در *Ausland*، ۱۸۸۵ء ؛ (۱۰) E. Gräf : *Das Rechtswesen* Walldort ۱۹۵۲ء؛ (۱۱) R. Hamiton، در *JRCAS* ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۳ء؛ (۱۲) P. Harrison : *The Arab at home*، نیویارک ۱۹۲۴ء؛ (۱۳) وهی مصنف : *Doctor in Arabia* نیویارک ۱۹۴۰ء؛ (۱۴) W. Hein در *MGGW*، ۱۹۰۳ء ؛ (۱۵) J. Hanninger : *Die Familie bei den heutigen Beduinen Arabiens*، لائیڈن ۱۹۴۳ء؛ (۱۶) وهی مصنف، در *Festschrift St Gabrial*، وی‌انا ۱۹۳۹ء؛ (۱۷) J. Hess : *Von den Beduinen des innaern Arabiens*، زیورچ ۱۹۳۸ء؛ (۱۸) تقی الدین الهلالی، در *WI*، ۱۹۴۰ء؛ (۱۹) D. Ingrams : *A survey of soc. and econ. conditions in the Aden Protectorate*، اسره ۱۹۴۹ء؛ (۲۰) G. Jacob : *Altarab. Beduinenleben*، بار دوم، برلن ۱۸۹۷ء؛ (۲۱) A. Jaussen : *Coutumes des Arabes*، پیرس ۱۹۴۸ء؛ (۲۲) A. Kaselou: *Die freien Beduinen*، همبرگ ۱۹۲۷ء؛ (۲۳) H. Lammens : *Le berceau de l'Islam*، روم ۱۹۱۴ء؛ (۲۴) C. v. Landberg : *Etudes*، لائیڈن ۱۹۰۱ تا ۱۹۱۳ء؛ (۲۵) وهی مصنف : *Glossaire datinois*، لائیڈن ۱۹۲۰ تا ۱۹۴۲ء؛ (۲۶) وهی مصنف: *Langue des bédouins 'Anazah*، لائیڈن ۱۹۱۹ء؛ (۲۷) E. Littmann : *Arab. Beduinenser zählungen*، سٹراسبرگ ۱۹۰۸ء؛ (۲۸) R. Mantagne : *La civilisation du désert*، پیرس ۱۹۴۷ء؛ (۲۹) وهی مصنف، در *REI*، ۱۹۳۲ء؛ (۳۰) A. Musil : *The manners and customs of the Rwala Bedouins*، نیویارک ۱۹۲۸ء؛ (۳۱) S. Nyström : *Beduinentum u. Lund*، ۱۹۴۶ء؛ (۳۲) M. v. Oppenheim ، E. Brärinlich اور W. Caskel : *Die Beduinen*، لائپزگ و ویزباڈن، ۱۹۳۹ تا ۱۹۵۲ء؛ (۳۳) E. Rackow و W. Caskel، در *Baessler Archiv*، ۱۹۳۸ء؛ (۳۴) E. Rossi، در *RSO*، ۱۹۴۸ء ؛ (۳۵) H. Scott، در *JRCAS*، ۱۹۴۱ء ؛ (۳۶) A. Socin و H. Stumme : *Diwan aus Centralarabien*، لائپزگ ۱۹۰۰-۱۹۰۱ء؛ (۳۷) B. Thomas : *Four strange tongues*، لندن ۱۹۳۷ء؛ (۳۸) وهی مصنف : *The Kumzuri dialect*، لندن ۱۹۳۰ء؛ (۳۹) J. Wellhausen. : *Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit.*، گوتنگن ۱۹۰۰ء؛ (۴۰) وهی مصنف : *Reste arab. Heidentums*، بار دوم،

بران ۱۹۲۷ء؛ (۳۱) *Geneal.* : F. wüstenfeld، *Tabellen der arab. Stämme u. Familien*، گوٹنجن ۱۸۵۲ تا ۱۸۵۳ء؛ (۳۲) وہی مصنف، در *Abh. d. k. Ger. d. Wiss. zu Gött.*، ۱۸۶۹ء.

(ے) تاریخ

۱ - زمانۂ قبل از اسلام : عربستان ایک ہزار سال ق-م سے پیشتر - ابھی تک جزیرہ‌نمائے عرب کی ایک ہزار سال قبل از مسیح سے پہلے کی کوئی تاریخ نہیں ہے، اگرچہ آئندہ تحقیقات سے یقیناً بہت سے نئے حقائق بے‌نقاب ہو جائیں گے - اکتشافات کم اور محدود پیمانے پر ہوئے ہیں، بلکہ بہت سے خطّوں میں ابھی تک سطح ارضی کو بھی تربیت یافتہ کھوج لگانے والوں نے بنظر دقّت نہیں دیکھا .

جو چیزیں متفرق مقامات میں دریافت ہوئی ہیں ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس جزیرہ‌نما میں قدیم حجری (Palaeolithic) اور جدید حجری (Neolithic) دونوں زمانوں میں لوگ آباد تھے ، لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے - سامیوں کے اصل وطن کا مسئلہ بھی اب تک معرض بحث میں ہے - وہ سامی خانہ بدوش جنھوں نے چوتھے ہزار سال قبل مسیح میں زرخیز ہلال (Fertile Crescent) کے اندر آنا شروع کیا، زیادہ‌تر کدھے پر انحصار کرتے تھے، جو بے آب علاقوں میں دور دور تک گھومنے پھرنے کے لیے ایسا موزوں نہ تھا جیسا اونٹ - عراق کے مسماری (cuneiform) کتبوں میں مَگَن، مِلُخّہ اور دِلْمن کے متعدد حوالے ملتے ہیں جو ایسی جگہیں تھیں جن کے محل وقوع کا عرب میں امکان ہے اگرچہ اس زمانے کا زیادہ‌تر جغرافیہ ابھی مبہم وغیر واضح ہے - پُنْت (Punt) سے متعلّق مصری بیانات بھی ایسے ہی غیر معیّن ہیں - سینا اور بحیرۂ احمر سے مصر کے تعلّقات بہت قدیم ہیں اور لوبان کی جنوبی عرب میں موجودگی کے باعث شروع ہی کے زمانے میں بالواسطہ بلکہ بلاواسطہ روابط بھی قائم ہو گئے تھے .

عرب اور دنیائے اسلام کی متأخّر تاریخ میں ایک وسیع اہمیت کا حامل ارتقا غالباً دوسرے ہزار سال قبل مسیح میں رونما ہوا جب حروف تہجّی کی لکھائی ایجاد ہوئی جس سے بعد کے سامی حروف تہجّی، بشمول جنوبی عربی اور شمالی عربی کے حروف، اخذ کیے گئے - قبائل کی ہجرتیں جن کے بارے میں ابھی تک برائے نام معلومات ہیں، خود عرب کے اندر ہی عمل میں آتی رہیں اور ممکن ہے کہ ان ہزار سالوں میں بہت سے بنوقَحْطان جنوب کی سمت اپنے نئے وطنوں میں چلے گئے ہوں - ان ہزار سالوں کے آخری چند سو سال تغیّر و تبدل کا زمانہ تھے، کیونکہ مشرق قریب میں دورِ آہن (Iron Age) شروع ہوا اور آرامی بڑی تعداد میں زرخیز ہلال میں داخل ہو گئے - عرب میں اونٹ کو پالنے کی ابتدا بھی بظاہر اسی عہد میں ہوئی، جو بنی نوع انسان کی ترقی میں جزیرہ‌نما (عرب) کا پہلا عطیہ تھا .

عرب پہلے ایک ہزار سال قبل مسیح کے دوران : کتاب تکوین (Genesis)، جسے تقریباً دسویں صدی قبل مسیح کی تصنیف سمجھا جاتا ہے، کے دسویں باب میں Joktan اور Hazarmaveth کے نام آتے ہیں جنھیں قحطان اور حضرموت سے شناخت کیا جا سکتا ہے - اسی صدی میں حضرت سلیمانؑ نے Ezion-geber کی بندرگاہ سے بحیرۂ احمر میں جہاز بھیجے، بحالیکہ ان کے کارواں شمالی عرب سے تجارت میں مشغول تھے - اوفیر Ophir کی جائے وقوع، جہاں سے حضرت سلیمانؑ کے پاس سونا اور دیگر اشیا آتی تھیں، ابھی تک ایک معمّا

بنی ہوئی ہے - نویں صدی سے آشوری اور بابلی کتبوں میں Aribi کا، جو شمالی عرب کے اونٹوں کے مالک باشندے تھے اور عراق کے حکمرانوں کے باج گزار تھے، اکثر ذکر آتا ہے .

حال کے سالوں میں جنوبی عرب کی قدیم تہذیب سے متعلّق علم میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے - نئے کتبات اور دیگر آثار اتنی بڑی تعداد میں دریافت ہوے ہیں کہ اکثر حالات میں رائج الوقت نتائج کو محض آزمائشی سمجھنا ضروری ہے - ترتیب زمانی کا از سر نو غور و خوض سے جائزہ لیا جا رہا ہے اور عام رجحان تاریخوں کو نیچے کی طرف لے جانے کے حق میں ہے - جو معلومات حاصل ہیں ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ جنوبی عرب میں منظّم ریاستیں پہلے ایک ہزار سال قبل مسیح کے نصف آخر میں موجود تھیں .

چار بڑی بڑی ریاستوں — سبائیوں کی ریاست سبا، مینائیوں کی ریاست مَعین، قَتَبان اور حضرموت کی خوشحالی کا دار و مدار زراعت اور تجارت پر تھا - وہاں کی آبپاشی کے پر تکلّف نظام میں سبا میں واقع مأرِب کا بند [سدّ] سب سے زیادہ شاندار تعمیر تھی - صدیوں تک جنوبی عرب کے تاجروں کو لوبان کی تجارت کی اجارہ داری حاصل رہی اور وہ ہندوستان اور یورپی ممالک کے درمیان آمد و رفت کے ذرائع پر بھی متصرف رہے - یہ لوگ اپنا تجارتی سامان خشکی کے راستوں سے بھیجتے تھے جو عرب کو جنوب سے شمال تک قطع کرتے تھے - شمالی عرب میں نو آبادیاں قائم کر لی گئی تھیں اور مصر، بحیرۂ ایجین اور خلیج فارس کے علاقے میں تجارتی سرگرمی کی شہادت ملتی ہے - جنوبی عرب میں آثار قدیمہ کی دریافتوں سے وہاں کی ثقافت پر گہرے یونانی - رومی اثرات کی نشان‌دہی ہوتی ہے- جنوب کے عرب ہجرت کرکے حبشہ گئے جس کا نام (ابی سینیا) انھیں کے نام پر پڑ گیا اور ان کا اثر و رسوخ افریقیہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ پہنچ گیا .

جنوبی عرب کی بہت سی شاندار عمارتیں ان عبادت گاہوں کی شکل میں تھیں جو بت پرستوں کے دیوتاؤں سے منسوب تھیں سبأ کے قدیم‌تر حکمران جن کا لقب مُکَرِّب تھا، بادشاہ اور پروہت دونوں کے فرائض ادا کرتے تھے؛ بعد میں ان کی جگہ بادشاہوں کی زیادہ دنیوی حکومت نے لے لی (تفصیل کے لیے دیکھیے مادّۂ الیمن) .

شمال میں تَیْماء کے نخلستان میں، جو Nabonidus کے ماتحت (مدّت سلطنت ۵۵۶ تا ۵۳۹ ق م) ایک مختصر عرصے کے لیے نئی بابلی سلطنت کا مرکز حکومت رہا، آرامی اثر بہت نمایاں تھا - ددَن Dedan، زمانۂ موجودہ کے العُلاَ کے قریب، ایک ایسی ثقافت کا مرکز بن گیا جسے اب لحیانی کہتے ہیں اور وہاں ایسے حروف تہجّی مستعمل تھے جو جنوبی عرب سے مأخوذ تھے- ثَمود کے پاس جن کا ذکر آٹھویں صدی قبل مسیح کے ایک کتبے میں ایک قبیلے کی حیثیت سے آیا ہے، اگرا Egra (الحجر یا مدائن صالح) تھا جو ددَن کے شمال میں ذرا دور واقع ہے- جگہ جگہ منتشر ثمودی کتبوں کی حالیہ دریافت سے جنوبی عرب سے مأخوذ اس خط کی نشر و اشاعت اور اسے استعمال کرنے والوں کے بارے میں نئے سوالات پیدا ہوگئے ہیں .

۵۳۹ قبل مسیح میں بابل کے ایران پر قبضے کے بعد شمالی عرب میں اَرَبایا (Arabāyā) کے نام سے ایک قلیل المدّت ولایت (satrapy) قائم ہوگئی تھی- دارا اول (مدّت سلطنت ۵۲۱ تا ۴۸۵ ق م) نے، جو خلیج فارس کے راستے تجارت کو فروغ دینا چاہتا تھا، کریاندا Caryanda کے سکائی‌لیکس (Scylax) کو روانہ کیا اور اس نے ہندوستان سے لے

کر بحیرۂ احمر کے آخر تک سفر کیا ۔ اسکندر کی مہمّوں کی بدولت دنیا کو عرب کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں، نیز خلیج فارس کی اس دیکھ بھال کی بدولت بھی جو اقریطش (crete) کے نیارکس Nearchus نے انجام دی ۔ اسکندر ۳۲۳ء میں فوت ہو گیا، جبکہ وہ جزیرہ‌نمائے عرب کے گرد اگرد بحری سفر اور اس کے باشندوں کو زیر کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا ۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد یونانی ماہر طبیعیات تھیوفراسٹس (Theophrastus) نے جنوبی عرب اور وہاں کی پیداوار کا حال لکھا ۔

مصر کے بطلمیوسی حکمرانوں نے، جو بحیرۂ احمر میں اکثر پیش دستی کے طریق‌کار پر عامل رہے، اس اجارہ‌داری کو خطرے میں ڈال دیا جو عربوں کو حاصل رہی تھی اور دوسری طرف شام کے سلوقیوں (Seleucids) نے ہندوستان سے آنے والے شمالی راستوں کے استعمال کو ترقّی دی ۔ تیسری صدی ق-م کے وسط میں پارتھی سلطنت کی تاسیس سے سلوقی کمزور ہوگئے، لیکن Antiochus ثالث میں ابھی اتنا دم تھا کہ اس نے ۲۰۵-۲۰۴ ق-م میں خلیج فارس کے عربی ساحل پر واقع Gerrha کے خلاف ایک مہم روانہ کی ۔

ان ہزار سالوں میں آگے چل کر نبطیوں نے، جو عربی نسل کے لوگ تھے اور جن کا مرکز حکومت پٹرا Petra میں تھا، شام کے معاملات میں اچھا خاصا کردار ادا کرنا شروع کر دیا اور ہلال زرخیز کے مختلف حصّوں، مثلاً خلیج فارس کے سر پر واقع Charax Spasini، میں، عرب حکمران نظر آنے لگے ۔ پارتھی حکومت کے تحت عرب باجگزار حکمرانوں کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل رہی اور عراق میں عربوں کی مہاجرت مستقل طور پر جاری رہی ۔

دوسری صدی ق-م کے اواخر میں Cyzicus کے B. C. Eudoxus نے مصر سے ہندوستان تک بحری سفر کیا اور وقت گزرنے پر اہل یورپ نے جنوب مغربی اور شمال مشرقی موسمی ہواؤں سے کھلے سمندر میں جہاز رانی کے لیے کام لینے کا راز معلوم کر لیا ۔ یورپ کے روز افزون مقابلے سے جنوبی عربوں کی تجارتی برتری کو بڑا نقصان پہنچا اور اسی زمانے میں ان کے اپنے وطن میں بعض بنیادی تبدیلیاں ہو رہی تھیں ۔ دوسری صدی کے خاتمے کے قریب کا ایک اہم واقعہ جسے بعد ازآں سبائی دور کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا، بجا طور پر سباء میں ہمدان کے پہاڑی قبیلے کے برسر اقتدار آنے سے مربوط کر دیا گیا ہے ۔ مَعین اور قَتَبان کی دونوں ریاستیں پہلی صدی ق-م میں ختم ہوگئیں اور بَیْحان میں واقع قتبانی دارالحکومت تمْنَع کو تباہ کر دیا گیا ۔ روم کو بلاد العرب السعیدۃ (Arabia Felix) کی دولت کا لالچ پیدا ہوا، چنانچہ شہنشاہ آغستوس Augustus نے ۲۴ ق-م میں مصر کے حاکم Aelius Gallus (prefect) کو، جسے پٹرا کے نبطیوں کی مدد حاصل تھی، لوبان کے ملک کی جانب ایک طویل سفر پر روانہ کیا، لیکن یہ مہم صحراؤں کو ناخوشگوار اور اپنے عرب حلیفوں کو دغاباز پا کر سباء سے پرے نہ جا سکی (تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ الیمن) ۔

عرب پہلی چھے عیسوی صدیوں کے دوران :

۵۰ء کے قریب ایک غیر معروف مصنّف نے یونانی میں Erythraean Sea کی Periplus لکھی؛ جس میں بحیرۂ احمر اور عرب کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ تجارت کا ایک بیش قیمت بیان ہے ۔ حضرموت کا بادشاہ جس کا صدر مقام شَبْوہ میں تھا، مغرب میں بحرین سے لے کر مشرق میں ظُفار تک تمام علاقے پر متصرّف تھا، بحالیکہ ''سباء اور

زورَیْدان کا بادشاہ'' (حال میں اختیار کردہ لقب) یمن کے پہاڑوں میں ظُفار میں متمکّن تھا جہاں حِمْیَر کی قوت بڑھ رہی تھی۔

۱۰۵ یا ۱۰۶ء میں قدیم نبطی مملکت میں عرب کا رومی صوبہ قائم کیا گیا جو جنوب میں واقع اَیْلَہ (العَقَبہ) سے لے کر شمال مشرق میں النمارہ تک پھیلا ہوا تھا اور اس کا مرکز حکومت پہلے پیٹرا Petra اور بعد میں Bostra تھا۔ تاجروں کو اَیْلہ کے راستے بحیرۂ احمر میں سے گزر کر تجارت کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور صحرائی سرحدوں پر حفاظتی چوکیاں (limes) تعمیر کرکے بدوی حملوں کی روک تھام کر دی گئی۔ دوسری صدی کے وسط میں جزیرہ‌نما کے بارے میں رومیوں کے علم کا خلاصہ جغرافیہ نگار Clandius Ptolemy نے لکھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ارد شیر اوّل، پہلے ساسانی حکمران (م - ۲۴۱ء) نے ایک شہر کی بنا رکھی اور اَزْد کے قبیلے کو عمان میں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ شمالی عرب کے پہلو میں ساسانی اقتدار اور دوسری طرف رومی اقتدار کو تَدْمُر (Palmyria) کے حکمرانوں نے للکارا، لیکن رومی شہنشاہ Aurelian نے ملکۂ زبّاء (Zenobia) کو شکست دی اور ۲۷۲ء میں اس کے صحرائی مستحکم قلعے پر قبضہ کر لیا۔

سباء اور ذورَیْدان کی گذشتہ شان وشوکت کو کسی حد تک شَمَر (یا شامر) یُہَرعِش نے دوبارہ حاصل کر لیا جس نے تیسری صدی کے قریب اپنی کامیابیوں کی یادگار میں اپنے شاہی القاب میں حضرموت اور یمن کا اضافہ کر لیا۔ اس کے عہد حکومت کے بعد سلطنت میں پھر ضعف آگیا جس کے دوران میں شمالی سرحد پر واقع نجران کا لَخْمی مَرْء (= امرؤ) القَیس نے محاصرہ کر لیا، جسے قدیم ترین شمالی عرب کے ایک کتبے (النمارہ ۳۲۸ء) میں مبالغے سے ''سب عربوں کا بادشاہ'' بتایا گیا ہے۔ سباء کے متأخّر بادشاہوں نے اپنے لقب میں ''اور پہاڑوں اور میدانوں میں اپنے عربوں [کا بادشاہ]'' کے الفاظ بڑھا کر اسے مزید طول دے دیا۔

چوتھی اور پانچویں صدیوں کا زمانہ عرب کی تاریخ کا دور تھا۔ رومی سلطنت کے زوال اور افلاس کا اثر جزیرہ‌نما پر پڑا، جہاں شہری تمدن مضمحل ہو کر رہ گیا اور خانہ بدوشی کے سادہ تر طور طریقوں نے زیادہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ عیسائیت نے آخرت میں ایک بہتر زندگی کا وعدہ کر کے اور مقامات کی طرح عرب میں بھی ترقّی کی۔ عربوں نے نَسْطوری مذہب کے عقائد کو، جو عراق سے آئے تھے اور اسی طرح مسیح ؑ کی وحدت فطرت، یعنی جامع بشریت اور الوہیت (Monaphysitism) کے عقیدے کو، جو مصر اور حبشہ سے آیا تھا، آسانی سے قبول کر لیا۔ حبشیوں نے یمن پر چوتھی صدی میں ایک مختصر عرصے کے لیے قبضہ کر لیا اور اَکْسُم کے پہلے عیسائی بادشاہ عِیْزانہ نے حِمْیَر، رَیدان، سباء، وغیرہ کا حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ شاپور ثانی (عہد حکومت ۳۱۰ تا ۳۷۹ء) نے، جسے عرب ذُوالاَکتاف کہتے ہیں، مشرقی عرب کو مطیع ومنقاد کر لیا؛ ساسانی جُوا بعد میں اتار دیا گیا، لیکن طلوع اسلام سے ذرا پہلے دوبارہ پہن لیا گیا۔ یہودیت کی دعوت بھی عرب میں کامیاب رہی، چنانچہ ان لوگوں میں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا پانچویں صدی میں سباء کا ایک بادشاہ اب کَرِب اَسْعد، جسے عربی روایات میں تبع اسعد الکامل کہا گیا ہے، تھا اور اس مذہب

کے مرکز میں سے ایک یثرب (بعد ازآں مدینہ) کا نخلستان تھا۔

اس کے بعد سلطنت ساسانیوں اور بوزنطیوں کے قبضے میں آ گئی۔ اپنے مقبوضات کو عرب کے سرکش لوگوں سے بچانے کے لیے ان دونوں کو ایسی درمیانی (Buffer) ریاستوں پر اعتماد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے حکمران عرب تھے، یعنی بنولَخم [رک بآں] جو عراق کے کنارے پر پاسبانی کرتے تھے اور بنو غسّان (رک بآں) جو شام کے محافظ تھے۔ یہ دونوں متوسل ریاستیں، اپنے آقاؤں کی طرح، اکثر ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہتی تھیں۔ چھٹی صدی کے نصف اول میں بنو غسّان کا سب سے بڑا بادشاہ حارث بن جَبلَہ بنولخم کے مشہور ترین حکمران مُنذر بن ماء السّماء سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ پانچویں صدی کے اواخر میں جنوبی عرب کے قبیلۂ کندہ (رک بآں) کے سردار حُجْر آکِلُ المرار نے وسطی عرب کے قبائل کے ایک وفاق کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی، لیکن کندہ کی یہ غیر مربوط و نامنظم بادشاہت اس سے پہلے کہ اسے لخمی المُنذِر نے ختم کر دیا، صرف نصف صدی تک قائم رہی۔

چھٹی صدی میں جنوبی عرب، آکسُم کے عیسائی بادشاہوں اور ساسانی خسرو اوّل اَنُوشروان (عہد حکومت ۵۳ تا ۷۹ھ) کے حملوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ نجران کے عیسائیوں پر یہودیت پرست عرب ذُونُواس [رک بآں] کے ہاتھوں جور و تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبشیوں نے ۵۲ء کے قریب یمن پر از سرنو قبضہ کر لیا۔ حبشہ کے اَبْرَھہ [رک بآں] نے یمن کے حاکم کی حیثیت سے سدّ مارب کی (اس سے پہلے کہ اسے قطعی طور پر اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا) آخری بار مرمّت کی۔ وہ بنو مَعَدّ، جو بنولَخم کے متوسّلین تھے، کے خلاف ایک مہم میں قلب نجد تک گیا اور اسلامی روایت کے مطابق عام الفیل (تقریباً ۵۷۰ء) میں مکّے کے خلاف ایک ناکام مہم کی رہنمائی کی۔ خسرو کے عہد میں ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال دیا۔ ظہور اسلام کے وقت یمن ایرانی مقبوضات ہی کا ایک حصہ تھا۔

چھٹی صدی کے اواخر میں مکّے نے، جو خاصا قدیم شہر اور بحیرۂ احمر کے متوازی شاہراہ پر واقع تھا، پہلے سے زیادہ شہرت اور خوشحالی حاصل کر لی۔ یمن پر غیر ملکی حکومت قائم ہو جانے سے اور ان ابتر حالات کی وجہ سے جو ایران اور بوزنطہ میں طولانی جنگ کے نتیجے میں شمالی راستوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہو گئے تھے، مکے کی خوشحالی میں اور مدد ملی۔ مکّے کے قریشی تاجروں نے بین الاقوامی تجارت میں شرکت سے فائدہ اٹھانے میں ہوشیاری اور دانائی سے کام کیا۔

اس عہد کی آخری صدیوں میں عربی زبان کی وہ شکل ظہور میں آئی، جسے فصیح یا کلاسیکی کہتے ہیں اور جس کے عوامی بولیوں کے سرچشمے اور ارتقا کا صحیح عمل ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ زبان جسے جاہلیت کے شاعروں نے، جن میں بہت سے بدوی تھے اور کچھ عیسائی یا یہودی تھے، استعمال کیا ہے۔ یہی زبان اسلام کے بہترین شاہکار قرآن مجید اور آئندہ نسلوں کے عربی ادب کی عظیم تصانیف کا وسیلۂ اظہار بن گئی (دیکھیے مادّۂ عربیہ)۔

۲۔ اسلامی قرون وسطٰی (تقریباً ۵۷۰ تا ۶۳۲ء)۔ ۵۷۰ء کے قریب حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم [رک بآں] مکّے میں تولّد ہوئے جو اس زمانے میں

بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔ آپؐ کی ابتدائی عمر کے حالات کتب تاریخ وسیر میں محفوظ ھیں ۔ آپؐ شہری اور خانہ بدوش زندگی کے قبائلی نظام سے بخوبی آشنا تھے اور شام کو جانے والے تجارتی قافلوں کے ساتھ جاکر بیرونی دنیا سے کچھ نہ کچھ آگاھی حاصل کر چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس برس کی عمر میں پہلی وحی کا نزول ھوا؛ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین شروع کر دی ۔ پھر آھستہ آھستہ وقتاً فوقتاً وحی نازل ھوتی رھی تا آنکہ دین اسلام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ۔

سرداران قریش مکہ نے آپؐ کی سخت مخالفت کی اور دشمنی پر اتر آئے ۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ھجرت کرکے حبشہ چلی گئی ۔ بعد ازاں مسلمانوں کی پوری جمعیت نے مکے سے شمال کی جانب یثرب [مدینے] کو ھجرت کی اور اسلامی سنہ کی ابتدا اسی واقعے سے ھوئی (۱ھ/۶۲۲ء) ۔ ان دس برسوں کے دوران میں جب آپؐ کا صدر مقام مدینے میں رھا آپؐ نے ایک ریاست تشکیل کی جو اپنے تمام امور میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا تھی ۔ اس زمانے میں دو ایسے انقلابی تصور پیدا ھوے جنھوں نے عرب کی ھیئت تبدیل کر دی ۔ قرآن مجید میں بالتاکید کہا گیا ھے کہ یہ فصیح عربی زبان میں ھے ۔ یہ ایک ایسا پرچم تھا جس کے نیچے سب عرب متحد ھو سکتے تھے ۔ اس سے پہلے عربوں نے ان نسبۃً چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے یا آزاد قبائل اور قبائلی وفاقوں سے (جن کے مابین اگر کھلی جنگ نہیں تو اکثر چپقلش موجود رھتی تھی) زیادہ بڑی کوئی سلطنت نہیں دیکھی تھی ۔ اس کے ساتھ ھی قرآن مجید اور اسلام کے مخاطب صرف عرب نہ تھے ، بلکہ تمام عالم تھا ۔ قرآن ایک ایسی الھامی کتاب ھے جو سب انسانوں کے لیے ھے اور اسلام میں سب سے بزرگ آدمی وہ ھے جوخدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ھو [اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ]، نہ کہ وہ جس کا خاندان سب سے اعلی ھو ۔ اس عالمگیر دعوت نے اسلام کے لیے عرب کی حدود سے بہت دور آگے نکلنے کا راستہ کھول دیا ۔

ھجرت مدینہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ اسلام کے وسیع مواقع میسر آئے ۔ فتح بدر کے بعد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور اسلام بتدریج پھیلنے لگا ۔ غزوۂ احزاب میں ناکامی کے بعد قریش کے تمام عزائم باطل ھوگئے اور قبائل پر ان کا اثر و رسوخ کم ھونے لگا ۔ اب وہ قبائل جو قریش کے ڈر سے اظہار اسلام کی ھمت نہیں پاتے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجنے شروع کیے ۔ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصر روم، خسرو ایران، عزیز مصر، نجاشی حبشہ اور رؤساے عرب وشام کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے ۔ فتح مکہ کے بعد تقریباً سارے حجاز نے اسلام قبول کرلیا ۔ ۹ ۔ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے پہلے اسلام کا اثر یمن، بحرین اور عمان اور دوسری طرف عراق اور شام کی حدود تک وسیع ھوچکا تھا ۔

پہلے تین خلفا (۱۱ تا ۳۵ھ/۶۳۲ تا ۶۵۶ء) ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی ریاست کی

باگ ڈور سنبھالی تو کئی قبائل اسلام سے منحرف ہوگئے اور بعض صورتوں میں ایسے مدّعیان نبوت بھی پیدا ہوے جو منافی اسلام عقائد کی تعلیم دیتے تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بہت مستعدّی سے جوابی کارروائی کی اور مسلم افواج کو وسطی عرب، بَحْرین، عُمان اور یمن روانہ کر دیا ۔ جب حضرموت کو، جو آخر تک مقابلے پر ڈٹا رہا، زیر کر لیا گیا تو جزیرۃ العرب تاریخ میں پہلی اور آخری بار اپنے تمام طول و عرض میں متحد ہوگیا ۔

حضرت ابوبکرؓ کے مختصر دور حکومت کا ایک اور عظیم کارنامہ عرب کے باہر اسلامی فتوحات کے شاندار لائحۂ عمل کا افتتاح تھا ۔ عراق پر حملہ آور ہونے کے بعد حضرت خالدؓ بن الولید نے ۱۳ھ/۶۳۴ء میں شامی صحرا کو عبور کر کے بوزنطیوں پر فتح میں حصّہ لیا ۔

جن فتوحات کا حضرت ابوبکرؓ نے آغاز کیا تھا، انھیں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت ۱۳ تا ۲۳ھ/۶۳۴ تا ۶۴۴ء) میں بہت سرگرمی سے جاری رکھا گیا ۔ ساسانیوں سے عراق لے لیا گیا اور شمالی اور جنوبی عربوں کے قبائل البصرہ اور الکوفہ کی نوبنا کردہ فوجی بستیوں میں آباد ہو گئے ۔ الیَرْموک کے مقام پر بوزنطیوں پر ایک فیصلہ کن فتح اور یروشلم پر قبضے کے بعد، حضرت عمرؓ اس مقدّس شہر کی زیارت کو آئے جو کسی خلیفہ کا عرب کی حدود کے باہر پہلا سفر تھا ۔ اس کے بعد اسلام نے مصر میں پیش قدمی کی جس پر قبضے سے مغربی عرب سے اس کے زیادہ مضبوط معاشی اور ثقافتی تعلقات استوار ہو گئے ۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سارے جزیرہ‌نما سے عیسائیوں اور یہودیوں کے اخراج کا حکم دے دیا تھا، تاہم ان کی ایک بڑی تعداد اس کے بعد بھی وہاں دیر تک موجود رہی ۔

حضرت عثمان (مدّت خلافت ۲۳ تا ۳۵ھ/ ۶۴۴ تا ۶۵۶ء) کے عہد میں ایشیاے کوچک، ترکستان، کابل اور سندھ میں فتوحات حاصل ہوئیں، جزیرۂ قبرص پر قبضہ ہوا، اسپین پر حملہ ہوا اور اسلامی حکومت کے حدود سندھ اور کابل سے لیکر یورپ کی سرحد تک وسیع ہوگئے ۔ دور عثمانی کے ابتدائی پانچ چھے سال امن و سکون سے گذرے، لیکن آخری دور اختلافات کی نذر ہوا ۔ عرب اور اسلام کے مستقبل کے لیے زیادہ خطرناک وہ اختلاف تھا جو ریاست کی طاقتور شخصیتوں میں پیدا ہو رہا تھا اور جو مدینے میں حضرت عثمانؓ کے قتل کا باعث بن گیا ۔

خلافت کے لیے جدّ و جہد (۳۵ تا ۷۳ھ/ ۶۵۶ تا ۶۹۲ء) ۔ اعلیٰ حلقوں کے اس اختلاف نے اُس وقت پھیل کر ایک گہری خلیج کی شکل اختیار کر لی جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے داماد اور چچا زاد بھائی حضرت علیؓ منصب خلافت پر فائز ہوے اور جنگ جمل [رکّ بان] کا واقعہ پیش آیا ۔ دو صحابیوں حضرت الزّبیر اور طلحۃؓ نے حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کی اور ۳۶ھ/۶۵۶ء میں مدینے سے اُن کے مقابلے کے لیے روانہ ہوے ۔ جنگ جَمَل میں حضرت علیؓ نے اپنے حریفوں کو شکست دی، لیکن اب انھیں صفین [رکّ بان] کا معرکہ پیش آیا اور حضرت عثمانؓ کے قرابت دار امیر معاویہؓ کا سامنا کرنا پڑا جو شام کے حاکم تھے ۔ جب [حضرت] علیؓ نے [امیر] معاویہؓ کے خلاف قوت بہم پہنچانے کے خیال سے اپنا مرکز حکومت کوفے میں قائم کر لیا تو مدینے کی وہ فوقیت نہ

رہی، جو اسے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے زمانے سے حاصل رہی تھی۔

امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی خانہ جنگی میں حضرت علیؓ کے اپنے انتہا پسند ساتھی اتنے برافروختہ ہوے کہ وہ خوارج کی حیثیت سے ان کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ باوجود اس ہمت شکن فتح کے جو حضرت علیؓ نے ۳۸ھ/ ۶۵۹ء میں ان خوارج کے خلاف النّہروان میں حاصل کی، ان کی جماعت باقی رہی اور عرصے تک عرب ان کے وسیع پروپیگنڈے کا میدان بنا رہا۔ امیر معاویہؓ کا حریف خلیفہ کی حیثیت سے بیت المقدس میں اعلان کر دیا گیا اور مغربی عرب میں ان کی اور حضرت علیؓ کی افواج مدینے سے لے کر نَجْران اور یمن تک ایک دوسری سے متصادم ہوگئیں۔ جب ۴۰ھ/۶۶۱ء میں ایک خارجی ابن مُلْجم نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا تو علویوں نے ان کے بیٹے حسنؓ کو کوفے میں خلیفہ بنا دیا، لیکن وہ امیر معاویہؓ کے حق میں جلد ہی اپنے دعووں سے دست بردار ہوگئے، جنھوں نے اس طرح پھر عارضی طور پر ملّت اسلامیہ کو مجتمع کر دیا۔

امیر معاویہؓ کی باقی ماندہ زندگی میں ان کے خلاف کوئی سنگین بغاوت رونما نہیں ہوئی، لیکن ان کی اس تجویز سے کہ منصب خلافت کو موروثی بنا دیا جائے، ناراضی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ یزید بن معاویہ کی تخت نشینی (مدّت حکومت ۶۰ھ/۶۸۰ء تا ۶۴ھ/۶۸۳ء) کے بعد حضرت علیؓ کے دوسرے بیٹے امام حسینؓ عراق میں تائید و حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مکّے سے روانہ ہوے، لیکن وہ ۶۱ھ/۶۸۰ء میں میدان کربلا میں شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت سے ایک زیادہ طاقتور امیدوار، یعنی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ایک ممتاز صحابی کے بیٹے عبداللہ بن الزّبیرؓ کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ یزید کی فوج نے حریت پسند اہل مدینہ کو حرّۃ واقم کی جنگ میں شکست دی اور مکّے کا محاصرہ کر لیا، جو ابن الزّبیر کا سرچشمۂ طاقت تھا۔ وہاں کعبے میں آگ لگ گئی، بہر حال یزید کے فوت ہو جانے پر لڑائی رک گئی۔ ابن الزّبیر کو تقریباً ہر اسلامی خطّے میں خلیفہ تسلیم کر لیا گیا؛ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ فوراً شام چلے جاتے تو عین ممکن تھا کہ وہ اموی اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے، جب کہ ابن الزّبیر مکّے ہی میں توقّف کیے رہے۔ بنوامیّہ کی مروانی شاخ کے عبدالملک (مدّت حکومت ۶۵ھ/۶۸۵ء تا ۸۶ھ/ ۷۰۵ء) نے بتدریج عرب کے باہر دوبارہ قدم جما لیے۔ خوارج، جو شروع میں ابن الزّبیر کے ساتھ ہوگئے تھے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے اور بنوحنیفہ کے خارجی نَجْدَہ بن عامر نے عرب کے ایک بڑے حصّے پر اپنا تسلط قائم کر لیا، لیکن پھر ایک اور خارجی ابوفُدَیک نے اسے شکست دی۔ عبدالملک نے حجّاج بن یوسف کو ایک فوج کا سالار مامور کیا جس نے ۷۳ھ/۶۹۲ء میں ایک طویل محاصرے کے بعد مکّے پر قبضہ کر لیا۔ ابن الزّبیر اس معرکے میں شہید ہوگئے اور اس طرح اسلام کی یہ ارض مقدّس بھی امویوں کے ہاتھ آگئی۔ ایک اور اموی فوج نے مشرقی عرب کی سمت یلغار کی اور ابوفُدَیک کا خاتمہ کر دیا۔

عرب امویوں کے تحت (۷۳ھ/۶۹۲ء تا ۱۳۲ھ/۷۵۰ء)، — شام کے اموی حکمران باقاعدہ طور پر مکّے اور مدینے میں اور عرب کے دیگر حصّوں میں بھی حاکم مامور کرتے رہے، اگرچہ ان کا اقتدار برائے نام تھا۔ زبردست اموی حاکموں، مثلاً الحجّاج اور یزید بن المُہلّب کے

احکام کو خلیج فارس میں اور ساحل عرب کے ساتھ ساتھ قانونی حیثیت حاصل تھی ۔

اموی خلفا حرمین شریفین کا احترام کرتے تھے اور وہاں کے مقامات مقدسہ پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے تھے، بیت المقدس کی خدمت کی سعادت بھی انھیں حاصل رہی ۔ ان کے عہد میں اکثر مغربی عرب میں امن و امان قائم رہا، اور اسے ایسی خوشحالی نصیب ہوئی، جو بعد کے زمانے کے مناقشات میں حاصل نہ ہو سکی ۔ امویوں نے نظام آبپاشی کو ترقی دی اور بہت سی مقتدر ہستیاں ملازمت کے بعد مکّے، مدینے اور الطّائف میں اپنی جاگیروں پر زندگی بسر کرتی رہیں ۔ حرمین نہ صرف اسلامی علوم کے لیے بلکہ سکون و آسائش، شعر و شاعری اور موسیقی کے لیے بھی مشہور ہوگئے ۔

اموی سیاست میں شمالی عربوں اور جنوبی عربوں کی شدید رقابت کی صدائے باز گشت عرب میں بھی سنائی دیتی تھی، جہاں جنوبی عربوں کا سب سے بڑا قبیلہ کَلب مدینے کے قریب وادی القُرٰی میں زمین کا مالک تھا ۔

اموی عہد کے خاتمے کے قریب عبداللہ بن یحییٰ طالب الحقّ الکندی اور ابوحمزہ الاَزْدی کی قیادت میں خوارج کا ایک اتّحاد قائم ہو گیا ۔ ابو حمزہ نے مکّے پر قبضہ کر لیا، ۱۳۰ھ/۷۴۷ء میں قُدَیْد میں کامیابی حاصل کی اور پھر مدینے میں داخل ہو گیا بحالیکہ طالب الحقّ حضرموت اور یمن کے خارجی مرکز سے اس کی مدد کرتا رہا ۔ امویوں کی زوال پذیر قوت کے باوجود مروان ثانی نے ان خارجی سرداروں کو زیر کرنے کے لیے کافی فوج جمع کر لی، لیکن اس وقت وہ اس کی آخری تباہی کا سامان مہیّا کر چکے تھے ۔ بنو عبّاس کی سازش کا مرکز مکہ ہی رہا جس کا مقصد شاہی خلفا کی سرکوبی تھا ۔

جزیرۃ العرب ابتدائی عبّاسی خلفا کے تحت (۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۲۶۶ھ/۸۷۹ء) : بنو عبّاس نے مرکز خلافت کو عراق میں منتقل کیا تو اس تجارت کی بدولت جو چین اور مشرقی افریقہ تک سے ہوتی تھی خلیج فارس کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ۔ عبّاسی دارالخلافہ سے، جو سامان تجارت آتا تھا یا وہاں جاتا تھا وہ البصرہ سے ہو کر جاتا تھا، بحالیکہ خود اس خلیج میں ایران کے ساحل پر واقع سِیْراف کی بندرگاہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں مصروف ترین بندرگاہ بن گئی تھی ۔

عرب میں عبّاسی حکومت کی طاقت ایک صدی سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہی، جس کے دوران میں مقدّس شہروں اور یمن میں اور بعض اوقات وسطی اور مشرقی علاقوں میں بھی، حاکم بھیجے جاتے رہے ۔ شروع کے خلفا، بالخصوص المہدی اور ہارون اور ان کی بیویوں، قابل ذکر طور پر زبیدہ، نے حجّ بیت اللہ کا التزام رکھا اور ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنا کر اور راستے کی آسائشیں فراہم کرکے اپنی رعایا کو بھی فریضۂ حج کی ترغیب دی ۔

خوارج کے ایک فرقے نے جو اباضیہ [رک بآں] کہلاتا تھا، الجُلَنْدٰی بن مسعود الاَزْدی کی قیادت میں عمان میں اپنی ایک علٰحدہ امامت قائم کر لی، لیکن ایک عبّاسی مہم نے خازم بن خُزَیمہ کی سرکردگی میں ۱۳۴ھ/۷۵۲ء میں الجُلَنْدٰی کو شکست دی اور قتل کر دیا ۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد یہ امامت دوبارہ قائم ہوگئی اور چند وقفوں کے ساتھ آئندہ چار صدیوں تک قائم رہی ۔ عمان ایک دور افتادہ خطّہ تھا اور بحیثیت مجموعی خوارج نے بنو عبّاس کو بہت کم تنگ کیا [رک بہ عمان] ۔

عبّاسی خلفا کے پہلو میں خوارج کی جگہ اب علوی [رک بآں] کانٹا بن کر کھٹکنے لگے - ان میں حسنی اور حسینی دونوں ھی شامل تھے - اپنے ھنر مندانہ پراپیگنڈے سے جو وہ امویوں کے خلاف معرکہ آرائی کے دوران میں کرتے رھے، بنو عبّاس نے پیش دستی کر کے علویوں سے وہ قیادت چھین لی جسے علوی اپنا حق سمجھتے تھے - اس کے لیے علویوں نے انھیں کبھی معاف نہیں کیا اور یکے بعد دیگرے وہ ان کی حکومت کے برحق ھونے کی مخالفت کرتے رھے - اگرچہ بنو عبّاس خود بھی حضرت عباسؓ کی نسل سے تھے - جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قریبی عزیز تھے، تاھم علویوں کو تقریباً ھمیشہ ھی عرب میں ایسے لوگ مل جاتے تھے، جو بخوشی ان کا ساتھ دینے کو تیار ھو جاتے تھے - مکّہ و مدینہ کے مقدّس شہروں میں ان کے نعرۂ جنگ سے یہ امید پیدا ھو جاتی تھی کہ وہ جگہ جو دمشق اور بغداد نے غصب کر لی تھی، انھیں دوبارہ حاصل ھو جائے گی .

عرب میں پہلے علوی مدّعی خلافت محمّد النّفس الزکیۃ تھے، جنھوں نے مدینے میں المہدی کی حیثیت سے ظہور کیا اور جن کے دعوائے خلافت کی تصدیق امام مالک بن انس [رک بآں] جیسے عالم دین نے کر دی تھی، لیکن یہ سب بے سود ثابت ھوا، کیونکہ ۱۴۵ھ/۷۶۲ء میں وہ المنصور کی افواج سے لڑتے ھوئے شہید ھو گئے .

چھٹے امام جعفر الصّادقؒ کی وفات (تقریباً ۱۴۸ھ/۷۶۵ء) کے بعد علویوں میں ایک بڑا افتراق رونما ھوگیا - بڑی جماعت، جو حضرت جعفرؒ کے بیٹے موسیٰ الکاظم اور ان کے پانچ اخلاف کی وفادار رھی، اثنا عشری کہلانے لگی - دوسرے لوگ، سبعیۃ، حضرت جعفرؒ کے بیٹے اسمٰعیل اور ان کے بیٹے محمّد کے حامی تھے اور اس غرض سے وہ اکثر خفیہ طور پر اسمٰعیلی تحریک میں کام کرتے رھے - وقت گزرنے پر یہ اسمٰعیلی اپنی صفوں میں بالخصوص معاشرے کے ان غیر مطمئن اور ستم رسیدہ عناصر کو، جو حکمران طبقوں کے دشمن تھے، شامل کرنے میں کامیاب ھوتے گئے .

ایک اور حسنی مدّعی خلافت، الحسین بن علی ۱۶۹ھ/۷۸۶ء میں ایک عبّاسی فوج کے خلاف جنگ میں لڑتے ھوئے مکّے کے قریب فخّ کے مقام پر شہید ھوئے، تاھم علویوں کے موقف کو یمن میں آگے بڑھنے کا موقع مل گیا جہاں اسے امام الشّافعی [رک بآں] ایسے جلیل القدر عالم دین کی حمایت حاصل ھوگئی - انھیں قید کر کے ھارون کے حضور میں پیش کیا گیا، لیکن آخر کار معافی مل گئی .

دوسری صدی ھجری کے آخر میں مغربی عرب میں علوی اقتدار کو از سر نو فروغ حاصل ھوا - مکّے میں الحسین الأفطس حسینی نے امام جعفر الصّادقؒ کے ایک بیٹے محمّد الدّیباج کو کھڑا کیا اور محمّد بن سلیمان حسنی نے اپنے قدم مدینے میں جما لیے - ان مدعیوں نے عبّاسیوں کے خلاف زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کیا، لیکن یمن میں امام جعفر الصّادقؒ کے ایک پوتے ابراھیم الجزّار کو زیادہ کامیابی حاصل ھوئی - علویوں کی حمایت کی لہر سے مغلوب ھو کر المأمون نے اثنا عشریّہ کے آٹھویں امام علی الرّضاؒ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا اور بجائے سیاہ کے علویوں کے سبز رنگ کو شاھی رنگ قرار دیا، لیکن ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں علی الرضاؒ کی وفات پر یہ تبدیلی کالعدم ھوگئی .

یمن میں علوی خطرے سے نمٹنے کے لیے المأمون نے وھاں ایک شخص محمّد نامی کو، جسے

امیر معاویہؓ کے معاون خصوصی زیاد بن ابیہ کی نسل سے ہونے کا دعوٰی تھا، اپنا حاکم بنا کر بھیج دیا ۔ اس نے ۲۰۴ھ/۸۲۰ء میں زَبِید [رک بآں] کے شہر کو دوبارہ تعمیر کر کے اور اپنے لیے ایک ریاست بنا کر زیادی [رک بآں] خاندان کی بنا رکھی جو، اگرچہ برائے نام عبّاسیوں کا وفادار رہا ۔ تاہم در حقیقت ان متعدّد خود مختار حکمران خاندانوں میں سے ایک تھا، جو خلافت عبّاسیّہ کے انقراض کے زمانے میں قائم ہوتے گئے ۔

اگرچہ وہ کوئی طاقتور حکمران نہ تھا، تاہم الواثق (مدّت خلافت ۲۲۷ھ/۸۴۲ء تا ۲۳۲ھ/۸۴۷ء) نے عرب میں پر زور حکمت عملی اختیار کی ۔ جب بنو سُلَیم کے بدویوں نے اپنی تاخت و تاراج سے حرمین کے گرد و پیش کے علاقے کو غیر محفوظ بنا دیا تو الواثق نے مجرموں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اپنے ترک سپہ سالار بغا الکبیر [رک بآں] کو روانہ کیا ۔ آئندہ دو سال کے دوران میں بُغا دیگر قبائل کے خلاف معرکہ آرا رہا اور اس نے اپنی جنگی کارروائیوں کا خاتمہ ۲۳۲ھ/۸۴۷ء میں بطن السِرّ کے مقام پر، جو عرب میں بہت اندر جا کر واقع تھا، ایک سخت لڑائی کے بعد بنو نُمَیر پر فتح حاصل کرنے سے کیا، جس کے بعد نجد میں واقع اُضاخ کے ایک شخص کو یمامہ، مشرقی عرب اور مکّے کو جانے والے حاجیوں کے راستے کا حاکم بنا دیا گیا ۔

۲۴۷ھ/۸۶۱ء میں المتوکّل کی وفات کے بعد بنو عبّاس کی حالت اپنے وطن مالوف [عراق] اور عرب دونوں جگہوں میں دگرگوں ہو گئی ۔ بنو یَعْفُر (رک بہ یعفر) جنھیں قدیم حمیَری تبابعہ کی نسل سے ہونے کا دعوٰی تھا، یمن کے پہاڑی علاقوں میں اٹھ کھڑے ہوے اور انھوں نے صَنْعاء کو اپنا دارالحکومت بنا لیا ۔ حضرموت نے خود مختاری حاصل کر لی اور مقامی حکمرانوں نے مشرق میں قدم جما لیے جہاں علی بن محمّد نے — جو یا تو واقعی امام حسینؑ کی نسل سے تھا جیسا کہ وہ دعوٰی کرتا تھا یا قبیلۂ عبدالقیس کا ایک رکن تھا — خانہ بدوش قبائل میں بے چینی پیدا کر دی ۔ مکّے میں ایک اور حسنی بغاوت کے نتیجے میں، جس کا آغاز اسمٰعیل ابن یوسف الأَخْیَضر نے کیا تھا، اسمٰعیل کے بھائی محمّد کے زیر قیادت یمامہ میں ایک نئی ریاست قائم ہو گئی، جہاں یہ اُخَیْضری جمے رہے یہاں تک کہ قرامطہ کی رو انھیں بہا لے گئی ۔

عبّاسی خلافت کو ایک اور دھچکا مصر کے سرکش والی احمد بن طُولُون کے ہاتھوں لگا، جس نے شام پر قبضہ کر کے اُس اقتدار کو درہم برہم کر دیا جو ایک زمانے میں حکومت کو بادیۃ الشام میں حاصل تھا ۔ تاہم خلافت کو سب سے زیادہ براہ راست خطرہ مشرقی عرب کے فتنہ پرداز علی بن محمّد کی جانب سے لاحق ہوا، جس نے اپنی سرگرمیوں کو جنوبی عراق میں منتقل کر دیا اور وہاں زنج کو، یعنی ان حبشی غلاموں کو، جو نمک کی دلدلوں میں کام کرتے تھے، بھڑکا کر ایک بڑے پیمانے کی بغاوت برپا کر دی (۲۵۵ھ/۸۶۳ء تا ۲۷۰ھ/۸۸۳ء) جو مقدّس شہروں تک جا پہنچی ۔

عرب میں اسمٰعیلی اور قرامطہ (۲۶۶ھ/۸۷۹ء تا ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء): ان حالات میں عبّاسی خلافت کے اندر اسمٰعیلی تحریک [رک بہ اسمٰعیلیۃ] نے، جو تیزی سے پھیل رہی تھی، ان مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ اسمٰعیلی مبلّغوں نے اثر و نفوذ حاصل

کرنے کے ایک خوب سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کردیا اور عرب میں اپنی سرگرمی کے خاص مرکز خلیج فارس کے ساحل اور یمن میں قائم کر لیے - چونکہ عرب کے یہ دونوں حصّے ایک دوسرے سے ایک حد تک منقطع رہے، لہٰذا ان میں بعد ازاں رونما ہونے والے واقعات کا باہمی تعلّق بہت کم تھا .

یمن میں اسمٰعیلیت کی ابتدا ۲۶۶ھ/۸۷۹-۸۸۰ء میں ابن حَوشَب (منصورالیمن) اور علی بن فضل کے ہاتوں ہوئی - ایک دوسرے سے گہرے اشتراک عمل کی بدولت ان دونوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ کر لیا اور علی صَنْعاء اور زَبید دونوں پر تھوڑے تھوڑے عرصے تک قابض رہا - زیادیوں اور یَعفُریوں نے اسمٰعیلیوں سے جنگ کی اور ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں ان کا ایک نیا مدّ مقابل پیدا ہوگیا - یہ القاسم حسنی الرّسّی کا پوتا پہلا زیدی امام الہادی یحییٰ تھا جو یمن آیا - اس نے ایک زیدی حکومت کی قانونی بنا ڈالی جو اسمٰعیلیوں کی غالی شیعیت کے مقابلے میں سنّی مذہب سے قریب تر تھی - دونوں اسمٰعیلی رہنما کچھ عرصے کے بعد آپس میں جھگڑ پڑے اور ۳۰۳ھ/۹۱۵ء تک دونوں فوت ہوگئے، لیکن ان کے عقائد اُن کے ساتھ نہیں مرے .

۲۸۶ھ/۸۹۹ء کے قریب اسمٰعیلیوں کا مشرقی عرب میں ظہور ہوا، جہاں ابو سعید الحسن الجنّابی اور اس کے بیٹے ابوطاہر سلیمان کی قیادت میں ایک طاقتور ریاست کی تنظیم عمل میں آئی - قرمطی کا نام، جس کی ابتدا اور مفہوم کے بارے میں ابھی تک شبہہ ہے، اسمٰعیلیت کے اسی مخصوص مظہر کا مقبول عام عرف چلا آتا ہے، اگرچہ اس کا اطلاق اس خطّے تک محدود نہیں ہے - بنو عباس اتنے کمزور ہوچکے تھے کہ وہ قرمطیوں کو البصرہ اور الکوفہ کو تاراج کرنے سے نہ روک سکے اور ۳۱۷ھ/۹۳۰ء میں وہ مکّے میں داخل ہوئے اور حجر اسود کو اپنے نئے دارالحکومت الاَحْساء (الحَسا) میں اٹھا کر لے گئے - اس کے کچھ ہی عرصے بعد عمان کو فتح کر کے قرامطہ عرب کے بیشتر حصّے پر متصرّف ہو گئے - اس فتنہ و فساد سے تنگ آ کر جنوبی عرب کے سیدوں کے مشہور تربن مورثِ اعلیٰ احمد بن عیسٰی الحسینی نے البصرہ سے ہجرت کی اور حضرموت چلے گئے جہاں اس زمانے میں عمان کے اباضیوں کا پلّہ بھاری تھا .

عبّاسیوں کو ایران کے بویوں [بُوَیْہیوں] اور مصر کے اخْشیدیوں کی وجہ سے نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑا جو بعض اوقات مکّے تک بڑھتے چلے آئے تھے، اگرچہ ان میں سے کوئی بھی وہاں اپنے قدم نہ جما سکا - بنوبویہ نے، جنھوں نے ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں بغداد پر قبضہ کر کے عبّاسی سلطنت کی حکمرانی عملی طور پر سنبھال لی تھی، عمان کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں شامل کر لیا .

ابو طاہر کا ۳۳۲ھ/۹۴۴ء میں انتقال ہوگیا اور قرامطہ نے شمالی افریقہ کے اسمٰعیلی فاطمیوں کے حکم سے ۳۳۹ھ/۹۵۰-۹۵۱ء میں حجر اسود کو مکے میں لوٹا دیا - ابو طاہر کے ایک بھتیجے الحسن الاَعْصَم کی قیادت میں قرامطہ شام اور مصر پر ایک دوطرفہ یورش میں فاطمیوں کے شریک کار ہو گئے، اس طرح کہ مقدّم الذّکر نے مشرق سے دباؤ ڈالنا شروع کیا اور مؤخر الذکر مغرب سے آگے بڑھے - جب فاطمیوں نے ۳۵۸ھ/۹۶۹ء میں مصر پر قبضہ کر لیا تو قرامطہ نے ان کا ساتھ چھوڑ کر شام میں ان کے منصوبوں کی مزاحمت کرنے میں بنوبویہ سے اتحاد کر لیا - ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں الحسن نے دمشق پر قبضہ کر لیا، لیکن قاہرہ کے نوبنا شدہ فاطمی

شہر تک پہنچنے سے پہلے اسے مصر کے خلاف دو مہمّوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا ۔

الحسن کی وفات پر قرمطی حکومت کو چھے سیدوں کی ایک مجلس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ فاطمیوں نے قرامطہ کے خلاف ایک فوجی فتح حاصل کی، لیکن انھیں الاحْساء واپس چلے جانے کی ترغیب دینے کے لیے ایک بڑی رقم دینا پڑی ۔ قرامطہ کے ہاتھ سے عمان ۳۷۵ھ/۹۸۵ - ۹۸۶ء میں نکل گیا، بنوبویہ نے عراق میں ان کی پیش قدمی روک دی اور المُنْتَفِق کے ایک سردار نے انھیں خود ان کے علاقے میں شکست دی اور القَطِیف کو لوٹ لیا (قب نیز قرامطہ) ۔

چوتھی/دسویں صدی کے وسط کے قریب حسنیوں کے ایک خاندان نے جو موسوی کہلاتا تھا، مکے کی شریفی امارت (جس کے لیے دیکھیے مادّہ مکّہ) قائم کی جس کی قسمت میں ایک ہزار سال تک باقی رہنا لکھا تھا ۔ اس خاندان کا سب سے زیادہ سر برآوردہ رکن ابو الفُتُوح الحسن تھا، جس نے ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ - ۱۰۱۲ء میں خلیفہ بننے کی کوشش کی، لیکن فاطمیوں نے جو اشراف (واحد شریف) پر حق سیادت رکھتے تھے، ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی ۔ قدیم موسویوں کے معاصر حسینی تھے جو پانچویں شیعی امام [الباقر] کے ایک چھوٹے بھائی حسین الاصغر کی اولاد سے تھے ۔ انھوں نے مدینے میں اپنی امارت قائم کر لی ۔ یہ خاندان چودہویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی تک باقی رہا بعد ازاں خاندان مُہَنّا کے نام سے معروف ہوا ۔

اسمٰعیلیت کی ایک شاخ دروزی تحریک تھی جس کی ابتدا فاطمی خلیفہ الحاکم کے عہد میں ہوئی ۔ المُقْتَنٰی دروزی نے مشرقی عرب کے قرمطی سیّدوں کو ایک خط اس مضمون کا بھیجا کہ وہ عقیدے کی بنا پر ایک دوسرے کے شریک کار بن جائیں ، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔

پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں بنومَعْن [رک بآن] عدن اور حضر موت میں برسر اقتدار ہوگئے اور یمن کے زیادیوں [= بنوزیاد] کو بنونجاح [رک بآن] کے آگے جھکنا پڑا، جو دراصل انھیں کے حبشی غلام تھے ۔ صلیحیوں [رک بہ صُلَیْحی] کے عہد میں یمن میں اسمٰعیلیت کا احیا ہوا ۔ یہ حکمران یام کے قبیلے سے تھے اور ان کے قبضے میں فاطمیوں کے برائے نام باجگذاروں کی حیثیت سے صَنْعاء کا شہر تھا بحالیکہ زیدی اماموں کا صدر مقام صَعْدَہ میں تھا ۔

۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں ناصر خسرو نے الاحساء کی سیاحت کی جہاں اس نے چھے سیدوں کی مجلس کو اس وقت تک حکمران پایا ۔ قرمطی ریاست کے متأخر ایام کے چشم‌دید بیان کی جزئیات کی بدقسمتی سے کسی مصدّقہ شہادت کے ذریعے تائید نہیں ہوتی ۔

بنوبویہ، قرامطہ اور فاطمیوں کی شیعیت سے اہل السنت میں ایک ردّعمل پیدا ہوا ۔ ان کے حامی و مددگار سلجوق ترک تھے جن کے قائد طُغرل نے ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں بغداد پر قبضہ کرلیا ۔ کرمان کے ایک سلجوق، قاوُرد قَرَہ ارسلان نے عمان میں اپنی حکومت قائم کرلی ۔ اسی زمانے کے قریب سیراف خلیج فارس کی سب سے بڑی بندرگاہ کی حیثیت سے اپنی جگہ جزیرۂ قیس کو دے رہا تھا، جس کے حکمرانوں نے عمان کی سیادت بھی حاصل کر لی، جہاں پانچویں صدی ہجری/ گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں اباضی اماموں کا سلسلہ منقرض ہو گیا ۔ آئندہ ساڑھے تین صدیوں کے احوال میں سے صرف ایک امام ہی کے حالات دستیاب ہیں ۔

یمن کے صُلیحیوں نے بنو مَعْن سے عدن چھین لیا اور شمال کی سمت بھی اپنی مملکت کو وسعت دی، کیونکہ مکے سے موسوی اشراف کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء میں علی بن محمد صلیحی نے اشراف کی ایک ہم جد شاخ یعنی ہاشمیوں کو مکے میں متمکن کر دیا۔ ملک شاہ کے عہد میں بغداد کے سلجوق اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئے اور اسی کی بدولت اس کے زمانے کے برائے نام عباسی خلیفہ کو خلیفۂ اسلام کی حیثیت سے مقدس شہروں میں زبانی طور پر مانا جاتا رہا۔ ملک شاہ اور اس کے وزیر نظام الملک نے حج کے معاملات کی جانب توجہ کی اور انھیں درست کرنے کے لیے فراخدلی سے روپیہ صرف کیا۔

۴۷۰ھ/۱۰۷۷-۱۰۷۸ء کے قریب الاحساء کے قرامطہ کو ایک مقامی خاندان عُیُونیوں کے ہاتوں، جو بنو عبدالقیس کے قبیلے سے تھے، اپنی آخری اور قطعی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عرب کے باشندوں میں اب قرامطہ کا کوئی نام و نشان باقی نہیں ہے۔ القَطیف اور آج کل کے الحَسا کے شیعی، جنھیں بعض اوقات قرامطہ کے بقایا بتایا جاتا ہے، درحقیقت اثنا عشری فرقے کے جعفری یا شیخی ہیں۔

۴۶۱ھ/۱۰۶۸-۱۰۶۹ء میں صُلیحی خاندان کی ایک ممتاز خاتون سیّدہ بنت احمد کو اس کی المکرّم احمد بن علی الصلیحیؒ سے شادی کے موقع پر عدن کا شہر جہیز میں دے دیا گیا اور اس کے بعد جلد ہی شہر کی حکومت بنو مَعْن سے زُرَیْعیون میں منتقل ہو گئی جو صلیحیون کی طرح یَام کی نسل کے اسمٰعیلی تھے۔ زُرَیْعی عدن پر ایک صدی تک حکمران رہے اور رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرتے گئے۔ [ملکہ] سیّدہ کے عہد میں، جسے المکرّم نے ملک کی حکومت سونپ دی تھی اور جسے فاطمی امام یمن کا فرمانروائے اعلیٰ تسلیم کرتا تھا، صلیحیوں نے اپنی حقیقی حکمرانی کے آخری ایّام دیکھے۔ ۵۳۲ھ/۱۱۳۷-۱۱۳۸ء میں اس کی وفات سے اس خاندان کا عملی طور پر خاتمہ ہوگیا، چنانچہ اس کے آئندہ آنے والے نمائندے سب کے سب ناکارہ و بے بس ثابت ہوئے۔

۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء میں مصر کے فاطمی خلیفہ المستنصر کی وفات پر اسمٰعیلیوں میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں جو آج بھی باقی ہیں۔ اس جماعت کی نسل سے جو المُستنصر کے سب سے بڑے بیٹے نزار کی حامی تھی، اَلمَوت کے اسمٰعیلی حشیشین (Assassins) اور خوجے ہیں، جن میں سے بہت سوں کے سرگروہ اب آغا خان ہیں۔ وہ جماعت جو المستنصر کے سب سے چھوٹے بیٹے المُستَعْلی احمد کے حق میں تھی، جس کا ملکہ سیّدہ کی وساطت سے صلیحیوں سے اتّحاد تھا، یمن میں برسر اقتدار تھی۔

ابتدائی دور کے عظیم ترین زیدی اماموں میں سے ایک احمد بن سلیمان کا عہد حکومت ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء تا ۵۶۶ھ/۱۱۷۱ء جاری رہا اور اس دوران میں اس کا صَعْدہ، نجران اور الجَوف پر قبضہ رہا۔ وہ صَنْعاء اور زَبِیْد پر بھی قابض ہوگیا اور اس نے دور شمال میں خَیْبر اور یَنْبُوع تک بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔

صُلَیحیوں کی طرح نَجاحیوں کے ہاں بھی اس خاندان کے زوال پذیر دور میں ایک ملکہ عَلَم نامی پیدا ہوئی جو در اصل ایک کنیز تھی۔ ۵۴۵ھ/۱۱۵۰-۱۱۵۱ء میں اس کے انتقال کے تقریباً دس سال بعد مہدیوں [رکّ بان] کی سریع الزّوال حکومت قائم ہو گئی جو اپنے آپ کو حِمیَری کہتے تھے، لیکن جن پر خوارج ہونے کا

الزام لگایا جاتا تھا .

مصر کے فاطمی ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں ایّوبیوں کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہوگئے اور انھیں دوبارہ برسر حکومت لانے کی ایک سازش کو صلاح الدّین نے ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں ناکام بنا دیا ۔ اس نے یمن کے شاعر اور مؤرخ عُمارہ بن علی الحکمی کو قتل کروا دیا ۔ مُستعلی جماعت کا مرکز مصر سے یمن میں منتقل ہو گیا جہاں یہ دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی تک قائم رہا اور بعد ازآں ہندوستان میں منتقل ہو گیا جس کے بعد ایک افتراق رونما ہو جانے پر یہ جماعت ہندوستان کے داؤدیوں اور جنوبی عرب کے سلیمانیوں [رک بہ بوہرہ] میں منقسم ہو گئی ۔ عرب میں وسیع پیمانے پر حکومت اسمٰعیلیوں کی گرفت سے باہر رہی یہاں تک کہ بارھویں صدی ہجری/ اٹھارھویں صدی عیسوی میں نجران کے سلیمانی مُکرَمی کا عہد حکومت آیا .

جزیرة العرب متأخر قرون وسطٰی میں (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء تا آخر نویں صدی ہجری / آخر پندرھویں صدی عیسوی) :

سلطان صلاح الدین ایوبی کے ظہور کا یہ نتیجہ ہوا کہ عرب اور مصر دونوں ملکوں میں فاطمیوں اور اسمٰعیلیوں کا اقتدار ختم ہوگیا ۔ صلاح الدین نے، جسے مکے میں بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا، ۵۶۹ھ/۱۱۷۳-۱۱۷۴ء میں اپنے بھائی توران شاہ کو اس غرض سے بھیجا کہ وہ تیسرے اور آخری مہدوی حکمران کو معزول کرکے یمن پر قبضہ کر لے ۔ ایّوبی دور حکومت کی کم و بیش نصف صدی میں اس جنوبی تخت پر اس خاندان کی تین ہم جدّ شاخوں کے تین ارکان بیٹھے ۔ حضر موت کو فتح کر لیا گیا، لیکن وہ ایّوبی سلطنت کا پورے طور پر حصّہ نہ بنا ۔ اپنے وطن مألوف کے زیادہ قریب ایّوبیوں کی بیشتر توجہ یورپ سے آنے والے صلیبیوں کی طرف مبذول رہی، جن میں سے ایک دلیر ترین صلیبی Renaud de Châtillon نے تَیْماء پر حملہ کیا، بحیرۂ احمر میں مسلمانوں کے خلاف اپنے آدمیوں کو جہازوں میں روانہ کیا، بلکہ مدینۂ منوّرہ پر حملہ آور ہونے کا بھی ارادہ کیا .

۵۹۸ھ/۱۲۰۰ء کے قریب قتادہ بن ادریس حسنی یَنْبُوع سے مکّے آیا، جہاں اس نے متأخر شریف خاندان کی بنا ڈالی ۔ جب اس نے الحجاز میں ایک مضبوط خود مختار خاندان کی تشکیل کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس زمانے کی باہمی رقابتیں اتنی بڑی ہیں کہ ان پر غلبہ پانا ممکن نہیں ۔ قتادہ نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰-۱۲۲۱ء میں وفات پائی اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یمن کے آخری ایّوبی حکمران الملک المسعود یوسف نے مکّہ فتح کر لیا اور رسُولی خاندان کے بانی کو جسے غسّانی نسل سے ہونے کا دعوٰی تھا، وہاں اپنا عامل مقرر کر دیا .

جزیرہ نما کے دوسری طرف شاعر سعدی شیرازی کے مربّی، فارس کے سَلْغَری اتابک ابوبکر بن سَعْد نے خلیج فارس کے بعض جزائر پر قبضہ کر لیا اور القَطیف اور الحَسا کے مقام پر سر زمین عرب پر بھی قدم رکھا ۔ بنوعیون کے مقامی خاندان کو سَلْغَری اور بنو عامر بن عُقَیل کے دباؤ کے آگے جھکنا پڑا جس نے بنو عُصْفور (رک بآن) کے نام سے ایک نئے خاندان کو جنم دیا .

ایوبی خاندان کے بعد رسولی خاندان [(رک بہ الرّسولیہ] ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء تا ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء، قرون وسطٰی کے یمن کے ایک نامور خاندان کی حیثیت سے تَعِز اور زَبِیْد پر حکومت کرتا رہا ۔ اسلامی فن تعمیر میں نمایاں ترقی ہوئی اور علما

کے لیے شاہی سرپرستی باعث ترغیب رہی، بلکہ بعض رسولی سلاطین خود بھی قابل ذکر مصنف تھے، ان کے دربار میں چین اور دیگر ممالک کے سفیر آتے رہے - عمر بن علی مکّے سے لے کر حضر موت تک حکومت کرتا رہا، ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء تا ۶۴۷ھ/۱۲۵۰ء) اور جب ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں ہُولاگو نے آخری عبّاسی خلیفہ [المستعصم] کو شہید کر دیا تو عمر کے بیٹے یوسف نے خلیفۃ المسلمین کا لقب اختیار کر لیا، لیکن اس منصب کا مکمل حصول رسولی سلطنت کی استعداد سے باہر تھا .

مصر کے پہلے عظیم مملوک سلطان بیبَرس [رکّ بآں] نے بلاد مقدس کی برائے نام سیادت اختیار کر لی اور مکّے کے معاملات شریف ابو نُمَیّ اول محمّد (مدّت حکومت ۶۵۲/۱۲۵۴ تا ۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء) کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جس نے بنو قتادہ کی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کیا - آل مِرا کے بدوی اور بعض دوسرے قبائل صحرائے شام میں پڑے پھرتے تھے اور حاجیوں کے قافلوں سے بڑی بڑی رقمیں جبرًا وصول کر لیتے تھے، بلکہ اپنے حملوں کے دوران میں نجد کے اندر تک پہنچ جاتے تھے - بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں معرض وجود میں آنے والی وہّابی تحریک کا فکری سرچشمہ امام ابن تیمیہ [رکّ بآں] (م ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) ہی تھا .

تقریباً آٹھویں/چودھویں صدی کے آغاز میں ہُرمُز کی بندرگاہ جو سر زمین ایران میں خلیج فارس کے دہانے پر واقع تھی ایک پاس کے جزیرے میں منتقل کر دی گئی، جس کے بعد اس نے بہت تیزی سے ترقی کی اور کچھ عرصے بعد مشرق کے تجارتی سامان کو اپنے گوداموں میں کھینچ لانے میں جزیرۂ قَیس کی بندرگاہ سے بازی لے گئی .

شریف عَجْلان بن رُمَیْثہ کے دور حکومت (۷۴۶تا۷۷۷ھ/۱۳۴۵ تا ۱۳۷۵ء) میں مکۂ مکرمہ میں جو سیاسی فسادات برپا ہوے ان کی وجہ سے ممالیک مصر کو مداخلت کا بہانہ مل گیا اور انھوں نے ۷۵۱ھ/۱۳۵۱ء میں عَرَفہ کے مقام پر ایک جنگ میں یمن کے رسولی سلطان کو قید کر لیا - احمد بن اسمٰعیل (مدّت حکومت ۸۰۳/۱۴۰۰ تا ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء) نے عارضی طور پر رسولیوں کی قسمت کا پانسا پھر پلٹ دیا، چنانچہ اس کے قبضے میں بحیرۂ احمر کا ساحل شمال میں حَلْی تک تھا، لیکن اس کی وفات کے بعد یہ سلطنت جلد ہی منقرض ہوگئی - متأخر رسولی بحیرۂ احمر میں سے گزرنے والی ہندوستانی تجارت کے سلسلے میں مصری تاجروں کا سرگرمی سے مقابلہ کرتے رہے .

نویں/پندرھویں صدی کے آغاز میں عمان کے اباضیوں نے اپنے اماموں کے انتخاب کا پرانا دستور پھر اختیار کر لیا جو ایک سو پچاس سال سے زائد عرصے تک مسلسل ایک دوسرے کے جانشین ہوتے رہے - تقریباً اسی زمانے میں علی بن عمر کی قیادت میں خاندان کَثیر نے حضر موت اور ظُفار کی پر آشوب سیاست میں اپنے طویل کردار کا آغاز کیا اور حضرمی مبلّغین نے سُمالی لینڈ [صُومالیہ (رکّ بآں)] میں اسلامی عقائد کی نشر و اشاعت کی .

نویں/پندرھویں صدی کے وسط میں مانع بن ربیعہ المُرَیدی، آل سعود کا مورث اعلیٰ، القطیف کے نواح سے ہجرت کرکے نجد آیا جہاں وہ وادی حَنیفَہ میں مقیم ہو گیا - اس صدی کے نصف آخر میں عُصْفُوریوں کی جَبْری شاخ کا اَجْوَد آل زامل القطیف اور بحرین پر حکمران تھا اور مشرقی عرب میں اس کا نام داد و دہش کے لیے مشہور و معروف تھا - شریف محمد بن برکات اور

مملوک سلطان قایت بای کے تحت مکّے کو بڑی خوشحالی حاصل رہی، اور قایت بای نے وہاں کئی عمارتیں بنوائیں، بحالیکہ زَبید اور عدن میں طاہریوں (رکّ بآن) نے جنوب کے رسولیوں کی جگہ لے لی۔

۳ - زمانۂ حال کے عرب کی تشکیل (دسویں/سولھویں صدی سے لے کر اب تک)۔

نویں/پندرھویں صدی کے آخر میں پرتگیزوں نے بحیرۂ روم سے بحیرۂ احمر میں راستہ نکال لیا، اور ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی، راس اُمید (Cape of Good Hope) کا چکّر کاٹنے کے بعد، ایک عرب جہازران، غالباً نجدی احمد بن ماجد نے ہندوستان تک رہنمائی کی - پرتگیزی جہاز جلد ہی بحیرۂ احمر میں نظر آنے لگے، اور الفانسو ڈی البوکرک کی قیادت میں ان حملہ آوروں نے خلیج عمان کی بندرگاہوں اور ہُرمُز کی بڑی منڈی پر قبضہ کر لیا - الفانسو کے بھتیجے پیڈرو (Pedro) نے ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں خلیج فارس کا دورہ کیا، لیکن اس سے اگلے سال الفانسو فوت ہو گیا اس طرح عدن کو سر کرنے اور مکّے پر چڑھائی کرنے کے باطل عزائم شرمندۂ تکمیل نہ ہونے پائے۔

۹۱۲ھ/۱۵۰۶-۱۵۰۷ء کے قریب شرف الدّین یحییٰ سے زیدی اماموں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا اور اس وقت سے بعد تک زیدی اپنا مرکز حکومت حتی الامکان صنعاء ہی میں قائم کرنے کی جانب مائل رہے - معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں حبشہ سے یمن میں قہوہ لایا گیا اور لوگوں میں قات اور تمباکو کا استعمال رائج ہوا۔

آل کثیر کے بدر ابو طُوَیْرِق (مدّت حکومت ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء تا ۹۷۶ھ/۱۵۶۸ء) نے جس کا حلقۂ اقتدار اس کے عروج کے زمانے میں عَوَالق کے علاقے سے لے کر حضرموت میں سے گزر کر سیحوت تک پھیلا ہوا تھا، عثمانی سلطان کو اپنی اطاعت پیش کرنے میں تأمل نہ کیا؛ بدر کے تمام مقبوضات اس کی موت سے پہلے اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور اسے اپنے حضرمی دشمنوں کے ہاتھوں طویل اسیری کے مصائب برداشت کرنا پڑے۔

سلطان سلیم اول عثمانی نے جس نے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں مصر کو فتح کر لیا، خادم الحرمین کا معزز لقب اختیار کیا اور [اس کے بیٹے] سلیمان قانونی کے عہد حکومت (۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء تا ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء) میں کئی اور علاقے سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے - پرتگیزوں نے ہُرمُز کے حکمران سے اتحاد کرکے بحرین پر حملہ کیا، جہاں اَجْود الجَبْری کے چچا اور جانشین مُقْرِن کو اس جزیرے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے - پرتگیزوں کی اس جارحانہ حکمت عملی کا ترکوں میں ردّ عمل ہوا اور انھوں نے بھی خلیج فارس اور بحیرۂ احمر میں مستعدی دکھانا شروع کی - ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں سلطان سلیمان نے بغداد میں القطیف اور بحرین کے امیروں سے حلف وفاداری لیا - بعد ازاں اس کی فوجوں نے یمن کی پہاڑیوں میں زور شور سے کارروائی شروع کر دی - کچھ عرصے کے لیے عدن اور مسقط پر قبضہ کر لیا گیا اور الحساء میں ایک ترک حاکم مقرر کر دیا گیا۔

تقریباً ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء کے بعد سے کم و بیش ساٹھ سال کے عرصے میں عمان میں کوئی اباضی امام نہیں ہوا، جہاں غیر مذہبی نُبْہانی امرا اپنے مستحکم پہاڑی مرکزوں میں اپنی قوت کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے۔

سلطان سلیمان کے عہد میں حاصل کردہ

عروج کے بعد عثمانی سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور اس کے آثار دیگر مقامات کی طرح عرب میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ خشکی کے راستوں سے تجارت کے رخ کا افریقہ کے گرد سے ہو کر جانے والے سمندری راستے کی طرف مڑ جانا اس سنگین اقتصادی انحطاط کا باعث بن گیا جو مشرقِ قریب پر عہد جدید کے شروع میں طاری ہو گیا۔ آسٹرویوں اور دیگر یورپی دشمنوں کے علاوہ ترکوں کو صفویوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جن میں سے سب سے طاقتور عبّاس اوّل نے خلیج فارس میں ایک توسیع پسندانہ حکمت عملی اختیار کی اور ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں بحرین پر قبضہ کر لیا۔ یمن میں زیدی اماموں نے ترکوں کی مزاحمت جاری رکھی اور المؤید محمّد ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں انھیں ملک سے مکمّل طور پر نکال دینے میں کامیاب ہو گیا۔

۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام بحیرۂ احمر اور خلیج فارس میں انگریز تاجروں کی بڑے پیمانے پر سرگرمی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ایرانیوں سے اتّحاد کرکے ان نوواردوں نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں پرتگیزوں کو ہرمز سے نکال دیا۔ جب پرتگیزی اجارہ داری ختم ہوگئی تو انگریزوں کو ولندیزیوں سے مقابلہ کرنا پڑا جنھوں نے گیارھویں/سترھویں صدی کے نصف آخر میں تجارتی فوقیت حاصل کر لی تھی۔

تقریباً ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں ناصر بن مرشد الأزدی الیَعْرُبی کے اباضی امام منتخب ہو جانے کے بعد امامت ایک صدی سے زائد عرصے تک اسی کے خاندان میں رہی۔ اپنے ابتدائی ایّام میں بنو یَعْرُب نے پرتگیزوں کو مسقط اور ان دوسری جگہوں سے جہاں انھوں نے اپنے قدم جما رکھے تھے نکال باہر کیا اور آگے چل کر انھوں نے اپنا حلقۂ اقتدار سمندر پار مشرقی افریقہ میں واقع ممباسہ، پمبہ اور کِلْوَہ تک وسیع کر لیا۔

خاندان افراسیاب کے تیسرے اور آخری پاشا حسین بن علی نے، جس کے عہد میں گیارھویں/سترھویں صدی کے دوران البصرہ عملی طور پر عثمانی حکومت سے آزاد ہو گیا تھا، قبیلۂ بنو خالد کے آل حُمَید کو ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳-۱۶۶۴ء میں الحَسا کے عثمانی حاکم سے گلو خلاصی حاصل کرنے پر اکسایا۔ ان بدوی سرداروں نے مشرقی عرب کے نخلستانوں اور چراگاہوں کو اپنی مرضی کے تحت رکھا یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں وھّابیوں نے خلیج فارس کی طرف پیش قدمی کی۔

حضرموت میں یمن کے زیدیوں نے شافعی مذہب کے مقابلے پر اپنے عقائد کی ترویج و اشاعت کی سعی کی۔ ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کے قریب حکمران زیدی امام کے ایک بھتیجے احمد بن الحسن نے حضرموت میں ایک خوفناک لشکر کی قیادت کی جو رات کے سیلاب (سیل اللّیل) کے نام سے مشہور ہے اور جس نے خاندان کثیر کی حیثیت کو کم کر دیا، لیکن زیدیّت اس خطّے میں شافعیت پر مستقل فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

بارھویں/اٹھارھویں صدی میں اس اصلاحی تحریک کے فروغ سے جس کا بانی نجد کا محمّد بن عبدالوھّاب [رَکّ بآں] تھا، عرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک اعتبار سے اس سے سارے مشرق قریب کی جدید تاریخ کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ توحید باری تعالی پر سب سے زیادہ زور دیتے ہوئے اور یہ مطالبہ کرتے ہوئے کہ دین کو تمام بدعتوں سے پاک و صاف کیا جائے، ابن عبدالوھّاب کی دعوت کی بازگشت مغربی افریقہ سے لے کر جزائر

شرق الہند تک تمام عالم اسلام میں سنائی دی [ایک طرف تو سلفی عقائد رکھنے والوں نے تحریک وھّابیت کا خیر مقدم کیا، دوسری طرف یہ تحریک عربوں کے اندر ملی اور سیاسی استحکام پیدا کرنے کا باعث بنی۔ اسی تحریک کی بدولت] جزیرة العرب کے اندر سیاسی وحدت نے چھوٹے موٹے [قبائلی] تعصبات کی جگہ لے لی اور ایک منظّم اور مثالی اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔

عوام الناس میں تبلیغ کرنے کے کچھ ہی عرصے بعد محمّد بن عبدالوھّاب نے محمّد بن سَعود سے جو درْعیّہ کے غیر اہم شہر کا حاکم تھا، ایک معاہدہ کرلیا۔ جب محمّد بن سعود کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے عبد العزیز نے یہ کام جاری رکھا، اور ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء تک پورے نجد نے ان مصلحین کے عقائد اور اقتدار کو قبول کر لیا، جنھوں نے نجران کے اسمٰعیلی مُکرّمیوں کی جو اس وقت عرب کے اس حصے میں قوت و اقتدار کے مالک تھے، تین مہموں کا کامیابی سے مقابلہ کیا [نیز رکّ بہ ابن سعود]۔

۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں یَعرُبی اماموں کے خاندان کا عمان میں خاتمہ ہو گیا، یعنی اسی زمانے میں جب ایرانی وہاں متمکن ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آل بو سعید کے احمد بن سعید نے حملہ آوروں کو باطنہ کے ساحل سے مار بھگایا اور امام کی حیثیت سے منتخب ہوگیا۔ احمد بن سعید کی وفات کے بعد منتخبین نے اس کے بیٹے کو منتخب کر لیا، مگر وہ ایسی گمنام شخصیت کا آدمی ثابت ہوا کہ اس کی تاریخ وفات تک معلوم نہیں۔ آل بو سعید [رکّ بہ بو سعید] کے متاخّر حکمرانوں نے مسقط کو اپنا دارالحکومت بنایا اور امام کا لقب ترک کر دیا، پہلے تو وہ اپنے آپ کو محض سیّد کہنے لگے (حالانکہ انھیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی نسل سے ہونے کا کوئی دعوٰی نہ تھا) اور بعد ازاں سلطان۔ ایرانیوں نے بھی بحرین پر اپنی سیادت تقریباً تیس سال تک قائم رکھی، یہاں تک کہ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں آل خلیفہ نے ان جزیروں پر قبضہ کر لیا اور اس تاریخ کے بعد سے عرب کا کوئی حصّہ ایرانی حکومت میں نہیں رہا۔

نجد کی تیزی سے وسعت پذیر وھّابی ریاست کی مکّے کے شریفوں سے آویزش ہو گئی اور دونوں میں پندرہ سال تک جنگ جاری رہی (۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء تا ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۶ء)۔ آخر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں سعودیوں نے پہلی بار مکّے پر قبضہ کر لیا۔ ابن عبدالوھاب کی وفات (۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) کے تھوڑے ہی عرصے بعد سعودی اقتدار مشرق کی سمت خلیج فارس تک جا پہنچا جس کے ساحل پر وہ عمان تک پھیل گیا۔ جنوب میں یہ مصلحین یمن اور حضر موت تک پہنچ گئے، حتّٰی کہ شمال میں ان کی افواج شام ارو عراق کو پامال کرنے کی دھمکی دینے لگیں۔ عثمانی حکومت نے جو از خود اس سیلاب کو روکنے کے ناقابل تھی، مایوسی کے عالم میں مصر کے نئے حاکم محمد علی سے رجوع کیا۔

تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں عرب میں مسلم اور یورپی ممالک کی مداخلت پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر اور وسیع تر ہوگئی۔ محمد علی نے پہلی سعودی حکومت کا اس وقت قلع قمع کر دیا جب اس کی فوج نے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں الدّرعیہ پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی حکومت نے پہلے تو مصریوں کی آمد کا خیر مقدم کیا لیکن بعد ازآں اس سے خوف زدہ ہوگئے، چنانچہ انھوں نے خلیج فارس کے عربوں کے خلاف اور

اندرون عمان میں فوجی کارروائیاں شروع کر دیں اور ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۹ء میں عدن پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد ان کا اثر و رسوخ بتدریج جنوبی اور مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا اور عقبی علاقوں میں بھی جا پہنچا۔

آل بو سعید کے مشہور ترین حکمران سعید بن سلطان (مدّت حکومت ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) کو اندرون عمان میں محض برائے نام اقتدار حاصل تھا جہاں اس پر سعودیوں نے بہت سخت دباؤ ڈال رکھا تھا جنھیں اسے اکثر خراج بھی دینا پڑتا تھا۔ اپنے عہد کے متأخر حصے میں اس نے اپنی زیادہ تر توجہ اپنے مشرقی افریقہ کے مقبوضات کی جانب مبذول رکھی، لیکن اس کی وفات کے پانچ سال بعد انگریزوں نے زنجبار کی ایک الگ سلطنت قائم کر دی جو مسقط سے بالکل آزاد تھی۔ اس صدی میں منتخب شدہ اس تنہا اباضی امام کو جس کا نام عَزّان بن قیس تھا، انگریزوں نے تسلیم نہیں کیا اور دو سال کی حکومت کے بعد اسے ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء میں برطرف کر دیا گیا۔ جو سلطان اس کے بعد آئے وہ اندرون ملک کے مخالف اباضی قبائل کے مقابلے میں مسقط میں اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے برطانوی تائید و حمایت پر بھروسا کرتے رہے۔

اس صدی کے دوران میں حضرموت میں خانہ جنگی عام ہوتی رہی، جہاں بہت سی طاقت ان پیشہ ور سپاہیوں کے ہاتھ میں تھی جنھیں عدن کے پیچھے کے پہاڑوں سے لایا گیا تھا بالخصوص قبیلۂ یافع کے لوگ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں اس قبیلے کے بنو قُعَیْطی نے الشّحر پر قبضہ کر لیا اور چودہ سال بعد المُکَلّا پر بھی پوری طرح مسلطّ ہوگئے۔

محمد علی کی افواج کی تباہ کن ضربوں سے سعودی ریاست سخت جان ثابت ہوئی اور ترکی بن عبداللہ کے، جس نے اپنا دارالحکومت الریّاض مقرر کیا، اور بعد ازآں اس کے بیٹے فیصل کے عہد میں اس نے اپنی قوت کو دوبارہ بحال کر لیا، اگرچہ الحجاز پر پھر قبضہ نہیں کیا گیا۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں فیصل کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں جو خانہ جنگی ہوئی اس سے سعودیوں کی قسمت پھر روبزوال ہو گئی اور اس سے مشرقی عرب کے ایک حصے پر عثمانی اقتدار کے دوبارہ قیام اور حائل کے آلِ رشید [رَکّ بآن] کی نجد میں حکومت کے لیے راستہ صاف ہوگیا، خود الریاض پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔ ترکوں نے یمن کے پہاڑی علاقوں میں بھی دوبارہ قدم جما لیے اور صنعاء کو اپنا صدر مقام بنایا، لیکن وہ زیدی اماموں کی مزاحمت کو نہ کچل سکے۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں نہر سویز کھل جانے سے، جس کے ذریعے استانبول اور جدّے کے مابین سفر زیادہ آسان اور مختصر ہوگیا، ترکوں کو الحجاز میں زیادہ اچھی طرح نظم وضبط قائم رکھنے کا موقع مل گیا۔

تین بار سخت ہزیمت اٹھانے کے باوجود آل سعود، فیصل کے پوتے عبدالعزیز کی قیادت میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے جس نے ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں وہاں کے رشیدی حاکم سے الرّیاض چھین لیا۔ شمال میں بالآخر آل رشید کو مغلوب کرنے سے پہلے عبدالعزیز کو بیس سال تک لڑنا پڑا۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں اس نے ترکوں کو الحَسا سے نکال دیا۔ اگرچہ دمشق سے مدینے تک حجاز ریلوے کا افتتاح ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں ہو چکا تھا، ترکوں کو اس وقت مکے سے دست بردار ہونا پڑا جب ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں شریف الحسین بن علی نے برطانیہ کی

شہ سے عرب بغاوت کا اعلان کر دیا ۔ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی عرب میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور زیدی امام المتوکل یحییٰ بن محمد یمن میں کلی طور پر خود مختار ہو گیا ۔

۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں سلطان مسقط کے مقابلے میں عمان میں ایک نیا اباضی امام منتخب ہوا ۔ دو سال بعد اس امام کی فوج کے ہاتھوں مسقط پر قبضے کو روکنے کے لیے برطانیہ کو مداخلت کرنا پڑی ۔ برطانیہ کی ثالثی سے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں السیب کے مقام پر ایک معاہدہ عمل میں آیا جس میں یہ طے ہوا کہ عمان کے لوگ اور سلطان [مسقط] کی حکومت ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہ دیں گے، لیکن ۱۳۷۳-۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴-۱۹۵۵ء میں سلطان کی فوجوں نے، جن کی تربیت اور قیادت برطانوی افسروں نے کی، بعض ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا جو پہلے مسقط کے پاس نہ تھے اور اس طرح امامت عمان کو چاروں طرف سے محصور کر لیا ۔

اگرچہ شریف الحسین کو لوگوں نے عرب کا بادشاہ تسلیم کرلیا، لیکن جب سلطان عبدالعزیز بن سعود اور شریف حسین کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو سلطان عبدالعزیز نے اسے شکست دی ۔ الحجاز کی فتح کے بعد سلطان عبدالعزیز نے آل عائض اور ادریسیوں کی چھوٹی ریاستوں کے ان علاقوں کا بھی الحاق کر لیا جو عسیر اور تہامہ میں تھے ۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں سلطان عبدالعزیز المملکة العربیة السعودیه کا بادشاہ کہلانے لگا اور اس نے ایک مختصر سی جنگ کے بعد ۱۳۵۳-۱۳۵۴ھ/۱۹۳۴ء میں یمن کے امام یحییٰ کو ہزیمت دی جس کے نتیجے میں نجران کو سعودی عرب میں شامل کرلیا گیا ۔

۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء میں ایک ناکام بغاوت کے دوران میں امام یحییٰ مارا گیا اور اس کا بیٹا احمد اس کا جانشین ہوا ۔ ادھر جب ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں عبدالعزیز کا انتقال ہوا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا سعود ہوا ۔ اس طرح منظر عام سے ایسے دو بڑے بادشاہ غائب ہوگئے جنھوں نے ان مملکتوں کو جن کی تشکیل اور رہنمائی وہ پچاس سال تک کرتے رہے تھے اپنا نام دینے کے علاوہ اور بہت کچھ کیا تھا ۔

مآخذ : عربی مآخذ، زمانۂ قبل از اسلام اور عہد اسلامی تا بیسویں صدی عیسوی (مختصر نام) : (۱) ابن الکلبی : الاصنام، (۲) ابن سعید : نشوة الطرب؛ (۳) جواد علی : تاریخ العرب قبل الاسلام (بغداد ۱۹۵۱ء)؛ (۴) الواقدی : المغازی؛ (۵) ابن ہشام : سیرة؛ (۶) ابن سعد : طبقات؛ (۷) الازرقی : اخبار مکة؛ (۸) ابن قتیبه : عیون؛ (۹) الفاکہی : تاریخ مکة؛ (۱۰) البلاذری : فتوح؛ (۱۱) الدینوری : الاخبار الطوال؛ (۱۲) الیعقوبی : تاریخ؛ (۱۳) المبرد : الکامل؛ (۱۴) النوبختی : الفرق؛ (۱۵) الطبری : تاریخ، مع عریب : صله؛ (۱۶) ابن عبدربه : العقد؛ (۱۷) مسکویه : تجارب؛ (۱۸) البغدادی : الفرق؛ (۱۹) الحمادی : کشف اسرار الباطنیة؛ (۲۰) العماره، طبع Kay و طبع Derenbourg؛ (۲۱) ابن المقرب : دیوان مع شرح؛ (۲۲) ابن الاثیر : الکامل؛ (۲۳) ابن خلکان : وفیات؛ (۲۴) ابن المجاور : تاریخ؛ (۲۵) الجندی : السلوک؛ (۲۶) ابو الفداء : مختصر؛ (۲۷) الذہبی : تاریخ؛ (۲۸) الصفدی : الوافی؛ (۲۹) ابن کثیر : البدایة؛ (۳۰) ابن خلدون : العبر؛ (۳۱) الخزرجی : العقود؛ (۳۲) الفاسی : شفاء الغرام اور العقد الثمین؛ (۳۳) المقریزی : الاتعاظ؛ (۳۴) ابن تغری بردی : النجوم؛ (۳۵) الشرجی : طبقات؛ (۳۶) السمہودی : الوفاء؛ (۳۷) ابن ایاس : بدائع؛ (۳۸) ابن الدیبع، طبع Kay؛ (۳۹) ابو مخرمه : تاریخ؛ (۴۰) ابن

الظُّهيْرَه : الجامع اللطيف؛ (۴۱) النَّهرَوالى : الإعْلام اور المَبْرَق اليمانى (۴۲) الرُّعامى : روض؛ (۴۳) ابن العَيْدَرُوس : النُّور؛ (۴۴) ابن المؤيّد : أنْباء؛ (۴۵) المحبّى : خلاصة؛ (۴۶) (نامعلوم) : كشف الغُمّة؛ (۴۷) المرادى : سلك الدرر؛ (۴۸) ابن غنّام : روضة؛ (۴۹) الشّوكانى : البدْر؛ (۵۰) ابن بِشْر : تاريخ؛ (۵۱) ابن رُزيق: فتح؛ (۵۲) ابن زَيْنى دَحْلان : خلاصة.

يسوبى صدى: (عمومى): (۱) امين محمد سعودى : الثّورة العربيّة، قاهره، تاريخ ندارد؛ (۲) وهى مصنّف : ملوك المسلمين، قاهره ۱۳۵۲ھ؛ (۳) سعيد عوض باوزير : معالم تاريخ الجزيرة، قاهره ۱۳۷۳ھ؛ الحجاز (۴) : حسين بن محمّد نصيف : ماضى الحجاز و حاضره، ۱۳۴۹ھ؛ (۵) احمد السّباعى : تاريخ مكّة؛ مكّه ۱۳۷۲ھ؛ يمن : (۶) محمّد زُباره : نَيْل الوطر، قاهره ۱۳۴۸ تا ۱۳۵۰ھ؛ (۷) احمد فضل العَبْدلى : هدية الزّمن، قاهره ۱۳۵۱ھ؛ (۸) عبدالواسع الواسعى : فُرجة الهموم، بار دوم، قاهره ۱۳۶۶ھ؛ (۹) حسين العرشى : بُلوغ المرام، قاهره ۱۹۳۹ء؛ حضرموت : (۱۰) محمّد بن هاشم : تاريخ الدّولة الكثيريّة، قاهره ۱۳۶۴ھ؛ (۱۱) عبدالله بن محمّد السقّاف : تاريخ الشّعراء الحَضْرَميين، قاهره ۱۳۵۳ - ۱۳۶۰ھ؛ (۱۲) صلاح البكرى: تاريخ حضرموت السّياسى، قاهره ۱۳۵۴ - ۱۳۵۵ھ؛ نجد : (۱۳) محمود شُكرى الآلوسى : تاريخ نجد، قاهره ۱۳۴۷ھ؛ (۱۴) امين الرّيحانى: تاريخ نجد الحديث، بيروت ۱۹۲۸ء؛ عمان : (۱۵) عبدالله السّالمى : تحفة الأعيان، قاهره ۱۳۳۲ تا ۱۳۴۷ھ؛ خليج فارس : (۱۶) محمّد النّبْهانى : التّحفة النّبهانية، قاهره ۱۳۴۲ھ؛ (۱۷) عبدالعزيز الرّشيد : تاريخ الكويت، بغداد ۱۳۴۴ھ.

قديم مآخذ : (۱) عهد نامهٔ عتيق؛ (۲) D. Lucken-bill : *Ancient records of Assyria and Babylonia*، شكاگو ۱۹۲۶ - ۱۹۲۷ء؛ (۳) *CIS*، ج ۴، پيرس ۱۸۸۹ تا ۱۹۳۲ء؛ (۴) *RES*، پيرس ۱۸۹۰ء؛ (۵) خ - نامى : نشر نُقوش سامّيه، قاهره ۱۹۴۳ء؛ (۶) *Hist. dos martyres de Nagran*، (طبع F. Pereira)، لزبن ۱۸۹۹ء؛ (۷) Simeon of Beth Arsham؛ (۸) *The book of the Himyarites*، (طبع A. Moberg)، Lund ۱۹۲۴ء؛ (۹) Herodotus؛ (۱۰) Xenophon : *Cyrop*؛ (۱۱) وهى مصنّف: *Anab.*؛ (۱۲) Theophrastus: *Hist. plant.*؛ (۱۳) Polybius؛ (۱۴) Diodorus Siculus؛ (۱۵) Strabo؛ (۱۶) Pomponius Mela؛ (۱۷) *Periplus maris Erythraei*؛ (۱۸) Pliny : *Natural hist.*؛ (۱۹) Josephus : *Bell. jud.*؛ (۲۰) وهى مصنّف : *Antiq.*، (۲۱) Plutarch؛ (۲۲) Ptolemy؛ (۲۳) Arrian: *Anab.*؛ (۲۴) وهى مصنّف: *Ind.*؛ (۲۵) Appian؛ (۲۶) Agathemerus؛ (۲۷) Dio Cassius؛ (۲۸) Eusebius : *Hist. eccl.*؛ (۲۹) وهى مصنّف : *Praep. evang.*؛ (۳۰) Dionysius : *Perieg.*؛ (۳۱) *Historia Augusta*؛ (۳۲) Ammianus Marcell؛ (۳۳) Eutropius؛ (۳۴) Marcian : *Per. Maris ext.*؛ (۳۵) Stephanus of Byz. : *Ethnica*؛ (۳۶) Nilus of Sinai : *Narrat.*؛ (۳۷) Philostorgius؛ (۳۸) Socrates؛ (۳۹) Sozomen؛ (۴۰) Theodoret؛ (۴۱) Scholasticus : *Euthym. vita*؛ (۴۲) Cyril of Scythopolis : *Martyrium Arethae*؛ (۴۳) Cosmas Indicopleustes؛ (۴۴) Procopius : *Bell. pers.*؛ (۴۵) Ioan. Malalas : *Chron.*؛ (۴۶) John of Ephesus؛ (۴۷) Evagrius : *Bibl.*؛ (۴۸) Photius : *Chron.*؛ (۴۹) Theophanes : *Chron.*؛ (۵۰) Ioan. Tzetzes.

جديد مآخذ : زمانهٔ قبل اسلام : (۱) N. Abbott : *The rise of the North Arabic script*، شكاگو ۱۹۳۹ء؛ (۲) ا - فخرى : *An archaeological journey to Yemen*، قاهره ۱۹۵۱ - ۱۹۵۲ء؛ (۳) R. Aigrain در *Dict. d'hist. et de géog. ecclés.*؛ (۴) W. Albright در *Gesch. u. Altes Testament*، Tubingen ۱۹۵۳ء؛ (۵) وهى مصنّف، در *BASOR*، ۱۹۵۰ء ببعد؛ (۶) D. Attema : *Het oudste Christendom in Zuid-Arabië*، ايمسترڈم

(۸) ۱۹۳۸ء؛ در *Le Muséon*، A. Beeston (۷) ۱۹۴۹ء؛ وهی مصنف، در *BSOAS*، ۱۹۵۴ء؛ (۹) O. Blau، در *ZDMG*، ۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء؛ (۱۰) H. Bossert: *Alteyrien*، Tübingen ۱۹۵۱ء؛ (۱۱) A. van den Branden: *Les inscriptions thamoudéennes*، Louvain ۱۹۵۰ء؛ (۱۲) R. Brünnow و A. v. Domaszewski: *Die provincia Arabia*، Strassburg ۱۹۰۴ - ۱۹۰۵ء؛ (۱۳) W. Caskel: *Das Altarabische Königreich*، Krefeld؛ (۱۴) وهی مصنف: *Lihyan u. Lihjan*، کولون ۱۹۵۴ء؛ (۱۵) وهی مصنّف، در *Islamica*، ۱۹۲۷ - ۱۹۳۱ء؛ (۱۶) وهی مصنّف، در *ZDMG*، ۱۹۵۳ء؛ (۱۷) وهی مصنف، در *The American Anthropologist*، ۱۹۵۴ء؛ (۱۸) G. Caton: *The tombs and moon temple of Hureidha*، آوکسفرڈ ۱۹۴۴ء؛ (۱۹) H. Charles: *Le christianisme des Arabes nomades*، پیرس ۱۹۳۶ء؛ (۲۰) C. Conti Rossini، در *JA*، ۱۹۲۱ء؛ (۲۱) P. Cornwall، در *GJ*، ۱۹۴۶ء؛ (۲۲) R. Dougherty: *Nebonidus and Belshazzar*، نیوهیون ۱۹۲۹ء؛ (۲۳) E. Glaser: *Skizze der Gesch. u. Geog. Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء؛ (۲۴) وهی مصنّف: *Die Abessinier in Arabien*، میونخ ۱۸۹۵ء؛ (۲۵) وهی مصنّف، در *MVAG*، ۱۸۹۷ء؛ (۲۶) J. Guidi: *Raccolta di scritti*، ج ۱، روم ۱۹۴۵ء؛ (۲۷) M. Guidi: *Storia e cultura degli arabi*، فلورنس ۱۹۵۱ء؛ (۲۸) J. Halèvys، در *JA*، ۱۸۷۲ء؛ (۲۹) وهی مصنّف، در *BSG*، ۱۸۷۳ - ۱۸۷۷ء؛ (۳۰) M. Hartmann: *Die arabische Frage*، لائپزگ ۱۹۰۹ء؛ (۳۱) G. Hill: *Greek coins*، لندن ۱۹۲۲ء؛ (۳۲) J. Hirschberg: *Israel be'Arab*، تل ابیب ۱۹۴۶ء؛ (۳۳) M. Höfner، در *WZKM*، ۱۹۳۸ء؛ (۳۴) وهی مصنّف، در *ZDMG*، ۱۹۴۵ تا ۱۹۴۹ء؛ (۳۵) F. Hommel: *Ethnol. u. Geog. des alten Orients sud-semitiques*، لووین ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء؛ (۳۶) G. Hourani: *Arab seafaring*، میونخ ۱۹۲۶ء؛ (۳۷) S. Huzayyin: *Arabia and the Far East*، قاهره ۱۹۴۲ء؛ (۳۸) A. Jamme: *Pièces épigraphiques de Ḥeid bin 'Aqīl*، لوون ۱۹۵۲ء؛ (۳۹) A. Jeffery، در *MW*، ۱۹۴۶ء؛ (۴۰) I. Kawar، در *Arabica*، ۱۹۵۶ء؛ (۴۱) وهی مصنّف، در *JAOS*، ۱۹۵۵ء؛ (۴۲) S. Kramer، در *BASOR*، ۱۹۴۴ء؛ (۴۳) H. Lammens: *L'Arabie occidentale avant l' hégira*، بیروت ۱۹۲۸ء؛ (۴۴) E. Littmann: *Thamud u. Safa*، لائپزگ ۱۹۴۰ء؛ (۴۵) E. Mittwoch و H. Schlobies، در *Orientalia*، ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء؛ (۴۶) K. Mlaker: *Die Hierodulenlisten v. Ma'in*، لائپزگ ۱۹۴۳ء؛ (۴۷) وهی مصنّف، در *WZKM*، ۱۹۲۷ء؛ (۴۸) وهی مصنّف، در *ZS*، ۱۹۲۹ء؛ (۴۹) J. Montgomery: *Arabia and the Bible*، فلاڈلفیا ۱۹۳۴ء؛ (۵۰) J. Mordtmann؛ در *ZDMG*، ۱۸۸۱ء؛ (۵۱) D. Muller، در *Pauly-Wissowa*، بذیل مادّه Arabia؛ (۵۲) سلیمان ندوی، در *IC*، ۱۹۳۷ء؛ (۵۳) C. Nallino: *Raccolta di scritti*، ج ۳، روم ۱۹۴۱ء؛ (۵۴) وهی مصنّف، در *BIFAO*، ۱۹۳۰ء؛ (۵۵) D. Nielson: *Handbuch der alterabischen Altertumskunde*، کوپن هیگن ۱۹۳۷ء؛ (۵۶) T. Nöldeke: *Die ghassanischen Fürsten*، برلن ۱۸۸۷ء؛ (۵۷) G. Olinder: *The Kings of Kinda*، Lund ۱۹۲۷ء؛ (۵۸) وهی مصنّف، در *MO*، ۱۹۳۱ء؛ (۵۹) H. Philby: *The background of Islam*، اسکندریه ۱۹۳۷ء؛ (۶۰) C. Rabin: *Ancient West Arabian*، لندن ۱۹۵۱ء؛ (۶۱) N. Rhodokanakis، در *SBAWW*، ۱۹۱۵ تا ۱۹۳۱ء؛ (۶۲) وهی مصنّف، در *WZKM*، ۱۹۳۲ء؛ (۶۳) G. Rothstein: *Die Dynastie der Lahmiden*، برلن ۱۸۹۹ء؛ (۶۴) G. Ryckmans: *Les noms propres sud-semitiques*، لووین ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء؛ (۶۵)

وهی مصنف : *Les religions arabes per-islamiques* لووین ۱۹۵۱ء؛ (۶۶) وهی مصنف، در *Le Muséon*، ۱۹۲۷ء ببعد؛ (۶۷) J. Ryckmans : *L' institution monarchique en Arabie meridionale*، لووین ۱۹۵۱ء؛ (۶۸) وهی مصنف، در *Le Musēon*، ۱۹۵۱ء ببعد؛ (۶۹) وهی مصنف، در *BO*، ۱۹۵۳ء؛ (۷۰) W. Smeaton : *The beginnings of Ghassan*، شکاگو ۱۹۴۳ء؛ (۷۱) S. Smith، در *RSOAS*، ۱۹۵۴ء؛ (۷۲) W. R. Smith : *Kinship and marriage in early Arabia*، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۷ء؛ (۷۳) A. Sprenger : *Die alte Geog. Ara-biens*، برن ۱۸۷۵ء؛ (۷۴) وهی مصنف: *Die post-u Reise-routen des Orients*، لائپزگ ۱۸۶۴ء؛ (۷۵) J. Tkač، در *Pauly. Wissowa*، بذیل مادّهٔ Saba؛ (۷۶) R. Walz، در *ZDMG*، ۱۹۵۱ء؛ (۷۷) E. Warmington : *The commerce between the Roman Empire and India*، کیمبرج ۱۹۲۸ء؛ (۷۸) F. Winnett : *A study of the Lihyanite and Thamudic inscriptions*، ٹورونٹو ۱۹۳۷ء؛ (۷۹) H. v. Wissmann، در *Saeculum*، ۱۹۵۲ء؛ (۸۰) H. v. Wissmann و M. Höfner : *Beiträge zur historischen Geog. der vorislamischen Sudarabien*، Mainf ۱۹۵۲ء.

عهد اسلامی : (۱) C. Aitchison، طابع *A collec-tion of treaties*، بار پنجم، ج ۱۱، کلکته ۱۹۳۳ء؛ (۲) G. Antonius : *The Arab awakening*، فلاڈلفیا ۱۹۳۹ء؛ (۳) C. van Arendonk : *De opkomst van het Zaidietische Imamaat*، لائیڈن ۱۹۱۹ء؛ (۴) H. Armstrong : *Lord of Arabia*، بیروت ۱۹۵۴ء؛ (۵) J. Aubin، در *JA*، ۱۹۵۳ء؛ (۶) A. Auzoux، در *Rev. d' Hist. Diplomatique*، ۱۹۰۹ - ۱۹۱۰ء؛ (۷) G. Bell : *The Arab War*، لنڈن، ۱۹۴۰ء؛ (۸) C. Boxer، طابع *Commentaries of Ruy Freyre*، لنڈن ۱۹۳۰ء؛ (۹) R. Brunnow : *Die Charidschiten*، لائیڈن ۱۸۸۴ء؛ (۱۰) H. Brydges : *A brief hist. of the Wahauby*، لنڈن ۱۸۳۴ء؛ (۱۱) F. Buhl : *Das Leben Muham-meds*، ہائیڈلبرگ ۱۹۵۵ء؛ (۱۲) L. Caetani : *Annali*؛ (۱۳) وهی مصنف : *Chronographia islamica*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۱۴) وهی مصنف : *Studi di storia orientale*، میلان ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۴ء؛ (۱۵) W. Caskel، در *Oriens* ۱۹۴۱ء؛ (۱۶) L. Cordeiro، طابع *Batalhas da India. Como se perdeu Ormuz*، لزبن ۱۸۹۶ء؛ (۱۷) L. A. (Corancez) : *Hist. des wahabis*، پیرس ۱۸۱۰ء؛ (۱۸) A. Cortesao و H. Thomas : *Carta das novas*، لزبن ۱۹۳۸ء؛ (۱۹) M. de Faria e Soura : *Asia portuguesa*، oporto ۱۹۴۵ تا ۱۹۴۷ء؛ (۲۰) A. Faroughy : *Hist. du royaume de Hormuz*، برساز ۱۹۴۹ء؛ (۲۱) M. de Goeje : *Mémoire sur les Carmathes du Bahrain*، بار دوم، لائیڈن ۱۸۸۶ء؛ (۲۲) وهی مصنف، در *JA*، ۱۸۹۵ء؛ (۲۳) S. Goitein، در *BSOAS*، ۱۹۵۴ء؛ (۲۴) P. Graves : *The Life of Sir Percy Cox*، لنڈن ۱۹۴۱ء؛ (۲۵) M. Guidi، در *RSO*، ۱۹۴۶ء؛ (۲۶) Ch. Guillain : *Documents sur l'hist... de l' Afrique orientale*، پیرس ۱۸۵۶ء؛ (۲۷) حسین الهمدانی، در *BSOS*، ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۵ء؛ (۲۸) وهی مصنف، در *JCAS*، ۱۹۳۱ء؛ (۲۹) D. Hogarth : *Arabia*، اوکسفرڈ ۱۹۲۲ء؛ (۳۰) M. Hoskins : *British routes to India*، نیویارک ۱۹۲۸ء؛ (۳۱) وهی مصنف، در *MEJ*، ۱۹۴۷ء؛ (۳۲) W. Iavnow : *The alleged founder of Ismailism*، بمبئی ۱۹۴۶ء؛ (۳۳) F. Kajare : *Le Sultanat d' Oman*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۳۴) A. Kammerer : *La mer Rouge*، قاهره ۱۹۲۹ء تا ۱۹۵۱ء؛ (۳۵) G. Kirk : *The middle East in the war*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۳۶) وهی مصنف : *The Middle East, 1945-1950*، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۳۷) H.

Lammens : *E'tudes sur le siècle des Omayyades*، بیروت ۱۹۳۰ء؛ (۳۸) وہی مصنف، در *JA*، ۱۹۱۱ء؛ (۳۹) وہی مصنف، در *Mélanges de l'univ. St. Joseph*، ۱۹۲۷ء؛ (۴۰) L. Lockhart : *Nadir Shah*، لندن ۱۹۳۸ء؛ (۴۱) B. Lewis : *The origins of Ismailism*، کیمبرج ۱۹۴۰ء؛ (۴۲) L. Lockhart، در *JRCAS*، ۱۹۴۷ء؛ (۴۳) S. Longrigg : *Four centuries of modern Iraq*، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۴۴) وہی مصنف : *Oil in the middle East*، لندن ۱۹۵۴ء؛ (۴۵) D. Lopes : *Extractos da historia da conquista do yaman pelos Othmanos*، لزبن ۱۸۹۲ء؛ (۴۶) C. Low : *Hist. of the Indian Navy*، لندن ۱۸۷۷ء؛ (۴۷) F. mengin : *Hist. de l'Egypte*، پیرس ۱۸۲۳ تا ۱۸۵۸ء؛ (۴۸) A. Mez : *Die Renaissance des Islams*، ہائڈل برگ ۱۹۲۷ء؛ (۴۹) C. Murphy : *Soldiers of the Prophet*، لندن ۱۹۲۱ء؛ (۵۰) A. Musil : *Zur Zeitgeschichte von Arabien*، لائپزگ ۱۹۱۸ء؛ (۵۱) H. Philby : *Arabia*، لوبارگ ۱۹۳۰ء؛ (۵۲) وہی مصنف : *Arabian jubilee*، لندن ۱۹۵۲ء؛ (۵۳) وہی مصنف : *Sa'udi Arabia*، لندن ۱۹۵۵ء؛ (۵۴) A. Rihani : *Maker of modern Arabia*، بوسٹن ۱۹۲۸ء؛ (۵۵) R. Said Ruete : *Said bin Sultan*، لندن ۱۹۲۹ء؛ (۵۶) وہی مصنف، در *JCAS*، ۱۹۳۱ء؛ (۵۷) وہی مصنف، در *Der Islam*، ۱۹۳۲ء؛ (۵۸) E. Sanceau : *D. Joao de Castro*، Oporto ۱۹۴۶ء؛ (۵۹) وہی مصنف : *Indies La adventure*، لندن ۱۹۴۶ء؛ (۶۰) J. Sauvaget : *mosquée omeyyade de Médine*، پیرس ۱۹۴۷ء؛ (۶۱) G. Schurhammer : *Die zeitgenossischen Quellen zur Gesch. Portugiesisch-Asiene u siener Nachbarlander*، لائپزگ ۱۹۳۲ء؛ (۶۲) R. Serjeant : در *ASOAS*، ۱۹۵۰ء؛ (۶۳) C. Snouck Hurgronje : *Mekka*، ہیگ ۱۸۸۸ - ۱۸۸۱ء؛ (۶۴) J. Sperber، در *MS OS*، برلن ۱۹۱۶ء؛ (۶۵) S. M. Stern، در *Oriens*، ۱۹۵۱ء؛ (۶۶) B. Thomas : *Arab rule under the Al Bu Sa'id dynasty*، لندن ۱۹۳۸ء؛ (۶۷) W. Thompson، در *The Macdonald Presentation Vol.*، برلسٹن ۱۹۳۳ء؛ (۶۸) A. Toynbee : *Survey of international affairs 1925*، لندن ۱۹۲۷ء؛ (۶۹) A. S. Tritton : *The rise of the Imams of Sanaa*، لندن ۱۹۲۵ء؛ (۷۰) وہی مصنف، در *BSOAS*، ۱۹۴۸ء؛ (۷۱) L. Veccia Vaglieri، در *RSO*، ۱۹۴۹ء؛ (۷۲) وہی مصنف، در *Annali*، لیڈن ۱۹۴۹ء؛ (۷۳) W. Watt : *Muhammad at Mecca*، آکسفرڈ ۱۹۵۳ء؛ (۷۴) وہی مصنف : *Muhammad at Medina*، آکسفرڈ ۱۹۵۶ء؛ (۷۵) J. Wellhausen : *Das arabische Reich u. sein Sturz*، برلن ۱۹۰۲ء (انگریزی ترجمہ، کلکتہ ۱۹۲۱ء) (۷۶) وہی مصنف : *Die religios-politischen Oppositionsparteien*، برلن ۱۹۰۱ء؛ (۷۷) H. v. Wissmann، در *Lebensraumfragen eüropaischer Völker*، لائپزگ ۱۹۴۱ء؛ (۷۸) F. Wüstenfeld : *Gesch. der Stadt Mekka*، لائپزگ ۱۸۶۱ء؛ (۷۹) وہی مصنف، در "*Abh. d. k. Ges. d. Wiss. zu Gött.*" ۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۵ء؛ (۸۰) E. de Zambaur : *Manuel de généalogie et de chronologie* Hanover ۱۹۲۷ء.

(G. Rentz)

* اَلْعَرَب : (ج : اَعْراب)؛ اس میں مندرجہ ذیل موضوعات زیر بحث آئیں گے [ملک عرب کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کے لیے رک بہ (جزیرۃ) العرب.]

(۱) عربوں کی قدیم تاریخ؛ (۲) عربوں کی آمد و رفت : عام اور زرخیز ہلال میں؛ (۳) عربوں کی آمد و رفت : ایران اسلام کے ابتدائی عہد

میں؛ ضمیمہ : عرب وسطی ایشیا میں؛ (۴) عرب کا پھیلاؤ، مصر میں؛ (۵) عرب شمالی افریقیۃ (المغرب) میں .

(نیز جزیرۃ العرب اور العربیہ کے علاوہ دوسرے عرب ممالک پر مقالات اپنی اپنی جگہ ملاحظہ ہوں) .

(۱) عربوں کی قدیم تاریخ : (عربوں کی نسلی ابتدا کے لیے دیکھیے (جزیرۃ) العرب : علم الاقوام و مندرجۂ ذیل پیرا دوم .

عربوں کی ابتدائی تاریخ ہنوز مبہم سی ہے - ان کی ابتدا اور آغاز کے واقعات سے بھی ہم بے خبر ہیں - اگر Uranius کی کتب خمسہ، جس میں عربوں کے متعلق ایک خصوصی کتابچہ بھی شامل تھا، محفوظ رہ جاتیں تو ہمارے علم میں معتدبہ اضافہ ہوتا - ان کے متعلق ہماری معلومات اشوری دستاویزات اور قدیم مؤرخین کی کتب سے مأخوذ ہیں - جہاں تک قبل از اسلام کی آخری تین صدیوں کے تاریخی واقعات کا تعلق ہے، وہ تمام مسلم روایات اور زمانۂ جاہلیت کے نبطی اور عربی کتبات کے مطالعے پر مبنی ہیں .

گمان غالب یہ ہے کہ ''آرامی بدوی'' جنھوں نے ۸۸۰ قبل از مسیح میں بالائی فرات میں بیت زمانی کے معاملات میں مداخلت کر کے اشوری بادشاہ نصرپل کے مقامی نائب کو اقتدار سے محروم کر دیا تھا، عربوں کے مورثِ اعلیٰ تھے - یہ عرب بھی آرامی بدویوں کی طرح اشوریوں کے درپے آزار رہتے تھے - تاریخ میں ان عربوں کا ذکر سب سے پہلے ۸۵۴ قبل از مسیح میں ملتا ہے - گندیبو (ایک عرب سردار تھا) نے جنگ فرقر میں ایک ہزار شتر سواروں سے برعیدری دمشقی کی سلم نصر ثالث کے خلاف مدد کی تھی، جس میں کہا جاتا ہے کہ اشوری بادشاہ کو فتح نصیب ہوئی تھی - شاید گندیبو کی لشکرگاہ دمشق کے جنوب مشرق میں واقع تھی - یہ یقینی ہے کہ جزیرۃ العرب کے بدوی عناصر، جو ارم، عبر اور خبیرو کے نام سے موسوم تھے، اس علاقے میں بود و باش رکھتے تھے، جو عراق اور شام کے درمیان ہے اور یہ علاقہ بشمول شام سامیوں کا قدیم ترین مسکن رہا ہے .

اگر F. Hommel کے پیش کردہ مفروضے (*Ethnologie*، ص ۵۵۰) کو صحیح مان لیا جائے کہ Magan کی سرزمین ارض معان ہی ہے اور وہ جنوبی عرب کی سلطنت معینیہ کی تاسیس کا نقطۂ آغاز ہے، اگرچہ اس کا ثبوت بہم پہنچانا نہایت مشکل ہے، تو جنوبی عرب کے بنو معین ان بدویوں سے الگ ہو گئے ہوں گے جنھوں نے ملک میں سکونت اختیار کر لی تھی، جسے نرم سن (۲۳۲۰ تا ۲۲۸۴ قبل از مسیح) نے بابل کی سلطنت میں شامل کر لیا تھا - اہل عرب کے قدیم زمانے سے بابل والوں سے سیاسی اور ثقافتی روابط تھے اس لیے وہ اہل بابل کے ہوا خواہ تھے .

جزیرۃ العرب شام اور عراق کے درمیان واقع ہے - اس کی جغرافیائی پوزیشن اور خلیج فارس سے شام، شام سے مصر و جنوبی عرب اور نجد کی سطح مرتفع کے راستے وادی دوامر سے معین جانے والی تجارتی شاہراہوں پر عربوں کی تجارتی سرگرمیوں نے مشرقِ عرب کے تاریخی واقعات پر اثر ڈالا ہے - حضرت مسیحؑ سے دو ہزار سال قبل اور رومی عہد میں ان اہم شاہراہوں پر قبضے کے لیے کشمکش تاریخی واقعات کا عنوان بنی رہی ہے .

Tiglat-Pilesar ثالث (۷۴۵ تا ۷۲۶ ق م) نے

غزہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ شاہراہ بخورات کی، جو جنوبی عرب سے بحیرۂ روم کو جاتی تھی، آخری چوکی تھی۔ اس کے عہد یعنی ۷۳۸ ق۔م میں عرب کی ملکہ الزبّا اشوری بادشاہ کو خراج بھیجا کرتی تھی۔ یہ ملکہ جو دومۃ الجندل کے نخلستان پر حکمران تھی، بنو قیدر کی پجارن بھی تھی جسے اہل نخلستان نذر و نیاز پیش کیا کرتے تھے۔ ۷۳۴ ق۔م میں Tiglat نے اَدَبْئیل عربی کو ارض مصری (مدین اور شمالی حجاز) میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ شاہراہ بخورات اسی علاقے سے گزرتی تھی۔ ۷۳۲ ق۔م میں اس نے عربوں کی ایک دوسری ملکہ شمسہ کو مغلوب کر لیا جس نے شاہ دمشق اور دوسرے عرب قبائل سے اتحاد کر لیا تھا۔ ان میں مسا (الزبور، کتاب پیدائش، ۲۵ س ۱۳)، تیما، خیاپا، بدنہ (الایلا دیدان کے نخلستان کے جنوب مشرق) اور سبا نے ملکۂ شمسہ کے دو شہروں کو فتح کر کے اس کے کیمپ کا محاصرہ کر لیا تھا اس لیے اس نے سفید اونٹ بطور خراج بھیجے تھے۔ سابق الذکر عرب قبائل بھی خراج کی ادائی پر مجبور ہوے اور اَدَبْئیل نے جس کا مستقر غزہ تھا، مجبور ہو کر اشوریوں کی سیادت مان لی۔ ملکۂ شمسہ کے ملک کو مطیع رکھنے کے لیے Tiglat-Pilesar سوم نے ملکہ کے دربار میں اپنا نمائندہ بھی رکھا۔ چونکہ اشوریوں کے مفتوحہ شہر جنوبی حَوران اور شمالی حجاز میں اس شاہراہ پر واقع تھے جس پر کاروان گزرتے تھے، اس لیے یہ امر بدیہی ہے کہ اس کشمکش کا مقصد مآرب سے غزہ تک شاہراہ کے شمالی حصے پر قبضہ کرنا تھا۔ بہر حال یہ کامیابی ادھوری اور عارضی تھی کیونکہ ۷۱۵ ق۔م میں شاہ سرگون دوم نے (۷۲۲ تا ۷۰۵ ق۔م) پھر خیاپا، ثمود اور مرسیمنی کو شکست دی اور کہا جاتا ہے کہ ملکۂ شمسہ کو دوبارہ خراج دینا پڑا۔ ۷۰۳ ق۔م میں عربوں نے اشوریوں کے بادشاہ Sennacherib (۷۰۵ تا ۶۸۱ ق۔م) کے خلاف بابلیوں کے حکمران Marduk-Appal-Iddina کی مدد کی، لیکن عربوں کے لشکر کو اشوریوں نے قید کر لیا، جس سے اشوریوں کا عربوں میں عمل دخل بڑھ گیا کیونکہ ہیرودتس (۲ : ۱۴۱) نے اسے ''عربوں اور اشوریوں کا بادشاہ'' لکھا ہے (F. Hommel : *Ethnalogie*، ۵۷۴)۔ اہل بابل (کلدانیوں) کی شکست کے بعد سنجاریف (سنحاریب) نے ملکۂ تیل خونو (Teelkhunu) کے زیر اقتدار عرب قبائل کے پڑاووں پر حملہ کر کے انھیں شکست فاش دی اور ان کا تعاقب دومتہ الجندل کے گرد و نواح کے صحرا تک کیا۔ اس نخلستان میں آباد کار بنو قیدر کے زیر دست تھے، جو شمالی عرب میں بااختیار تھے۔ اَدُمّتو کی ملکہ تیل خونو اور اس کے نائب السلطنت خزعیل شاہ عرب نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔ مؤخرالذکر نے ملکہ سے ایک تنازع کے بعد اندرون صحرا راہِ فرار اختیار کر لی، لیکن سنجاریف کے جانشین Assarhaddon نے اسے معاف کر کے بنو قیدر کا سردار مان لیا۔ خزعیل نے ۶۷۵ ق۔م میں وفات پائی اور اس کا بیٹا یطع (Yata) اس کا جانشین ہوا۔ وہ اشوریوں کا باجگزار بنا رہا جنھوں نے ملکۂ تیل خونو کی بیٹی تبوعہ سے اس کی شادی کر دی تھی اور اسے ملکہ اور پجارن بنا لیا تھا۔ ۶۷۶ ق۔م میں Assarhaddon نے وادی سرحان کے نشیب میں بازو اور خزو کے خلاف ایک مہم کی سربراہی کی۔ جب شمش شُمکین شاہِ بابل نے Assurbanipal کے خلاف بغاوت کی تو بنو قیدر نے اس کی مخالفت کی اور حما اور ایدوم کے

درمیانی علاقے کی مغربی سرحدوں کو لوٹ لیا، لیکن انھیں صحرا کی طرف پسپا کر دیا گیا۔ جب انھوں نے دوبارہ اشوری صوبوں کو تاخت و تاراج کیا تو انھیں حوران کی جانب راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ملک کی بربادی سے مشتعل ہو کر رعایا نے شاہ یطع کو ملک سے باہر نکال دیا اور وہ قید کر کے نینوا لایا گیا۔ دمشق سے آمدہ اشوری فوجوں نے نبطیون اور بنو قیدر کے علاوہ، جو Palmyrene اور دمشق کے جنوب میں آباد تھے، جنوبی وادی سرحان کے بنو حرر کو بھی مغلوب کر لیا اور ایک امدادی دستے کو جس نے بابل میں شاہ بابل کی طرف سے جنگ لڑی تھی، دارالخلافہ کی تسخیر کے بعد تباہ و برباد کر دیا۔ عربوں، نبطیون اور بنو قیدر نے اشوری سیادت دوبارہ قبول کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۵۸۰ ق۔م کے لگ بھگ کلدانیوں نے بنو قیدر کو مطیع بنا لیا تھا۔

اشوری عہد میں عرب میں امن و امان قائم کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کی گئیں، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکا کہ صرف تجارتی شاہراہیں محفوظ اور آزاد و نیم آزاد قبائل کے چھاپہ ماروں کا انسداد ہو سکا۔ اس عہد کی اشوری دستاویزات میں جہاں کہیں ''بادشاہوں'' کا ذکر آتا ہے تو اس سے مقامی سردار یا شیخ مراد ہوتا ہے کیونکہ زمانۂ دراز کے بعد ہی مقامی سرداروں نے شاہانہ اختیارات سے کام لینا شروع کیا تھا۔ بائبل (۲۵ [ارمیا] : ۲۳) میں جہاں ارمیا نبی نے ''صحرا نشین شاہان عرب'' کی تباہی کی پیش گوئی کی ہے تو اس کا مصداق یہی بدوی سردار ہیں۔ یہی شاہان عرب بستیوں یعنی وادی سرحان کے نشیب میں واقع نخلستان بوز کے رہنے والوں کے سردار تھے۔ ان سے بعض بستیوں پر نو کلدانی شاہان، یعنی تیماء نے قبضہ جما لیا تھا جس پر نبونی Nabonid (۵۵۲ تا ۵۳۵ ق۔م) نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کے چند سال بعد (۵۳۹ ق۔م) عرب جنگجوؤں نے بابل کی تسخیر میں سائرس دوم کی مدد کی تھی (Xenophon : *Cyropaedia*، ۷ : ۴ و ۱۶؛ ۵ : ۱۳)۔

جب مشرق قریب کا الحاق ہخامنشی سلطنت سے ہوا تو عربوں نے پھر شتر سوار فوج شاہنشاہ ایران کی مدد کے لیے بھیجی (Herodotus، ۷ : ۸۶)۔ کبھی کبھار عرب ایشیا کے حکمرانوں کی امداد ایرانیوں کے خلاف کیا کرتے تھے، مثلاً ان کا بادشاہ Aragdes (مرگدس، خارجہ ؟) croesus کا حلیف تھا (xenophon : *cyropaedia*، ۲ : ۱ و ۵)۔ ہو سکتا ہے کہ ہیرودتس (۳ : ۴) میں مذکورہ عرب بادشاہ لحیانیوں کا حکمران ہو۔ مؤخرالذکر نے شمالی حجاز، یعنی ارض مدائن میں مصران کی بستی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا مرکز اقتدار Agra-Hegra تھا اور وہ ۵۰۰ سے ۳۰۰ ق۔م تک بر سر اقتدار رہا۔

Livy (۴۵ : ۹) اور Pliny (*National History*، ۱۲ : ۶۲) کا بیان ہے کہ سکندر اعظم نے ہخامنشی مملکت کی تسخیر کے بعد عربوں کو بھی زیر کر لیا تھا۔ اب عرب یونانی فوج کو پارچات اور ہتیار مہیا کرنے لگے تھے۔ وہ فوجی مہمات میں بھی شرکت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے غزہ کے دفاع میں بھی حصہ لیا تھا (Arrian ; *Anabasis*، ۲ : ۲۵؛ Curtius Rufus : *Memorabilia*، ۴ : ۶)۔ انھوں نے Raphia کی جنگ (۲۱۷ ق۔م میں انطیوخس

ثالث Antiochus III کا ساتھ دیا تھا ۔ سکندر کی وفات کے بعد اگرچہ بطلمیوس نے مغربی عرب پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن عربوں کی اکثریت انطیوخس سے مل گئی Polybius، ۵ : ۷۱) ۔

گمان غالب یہ ہے کہ یہ عرب نبطیون کے مورثِ اعلیٰ تھے ۔ عربوں کی بستیاں، جولبنان اور شام کے پہاڑوں میں واقع تھیں، ان کا مال تجارت بطرا (الحجر) دمشق اور عراق جانے والی تجارتی شاہراہ سے گزرتا تھا (Pliny : *Nat. Hist.*، ۶ : ۱۴۲؛ Strabo، ۱۶ : ۷۴۹، ۷۵۵، ۷۵۶)، کیونکہ Tigranes نے بدوی عربوں کو اسی مقصد کے پیش نظر وہاں آباد کیا تھا (Plutarch : *Lucullus*، ۲۱؛ Pliny : *Nat. Hist.*، ۶ : ۱۴۲ ۔ Mithridatian کی جنگ میں عربوں نے رومیوں کے دوش بدوش حصہ لیا ۔ جنگِ شام میں انھوں نے Pompey کی زیر کمان رومی فوج کو تنگ کیا، لیکن آخرکار شکست کھائی ۔ پارتھیوں کے خلاف عربوں نے cassius (۵۳ ق ۔ م) اور crassus کے ساتھ شامل ہو کر جنگ کی ۔ رومیوں نے عرب کے شامی صحرا میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو نظر انداز کرتے ہوے پارتھیوں کے خلاف عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھا ۔ رومی شاہنشاہوں نے بھی اسی حکمت عملی کو جاری رکھا ۔ عرب کی شامی سرحد پر غسانی [رک بآں] رومیوں کی طرف سے فرمانروا تھے ۔ اسی طرح الحیرہ میں دریاے فرات کا سرحدی علاقہ لخمیوں [رک بآں] کے تصرف میں ۶۰۲ء تک رہا ۔

اس اثنا میں چوتھی صدی عیسوی میں عرب اونٹ چرانے اور ''شاہراہ بخورات'' پر تجارت کے سلسلے میں جنوبی عرب میں گھس آئے تھے ۔ سبائی کتبات میں ان کا ذکر عربوں کے طور پر آتا ہے اور وہ موروثی مقیم باشندوں کے ساتھ آبادی کا معتدبہ حصہ بن چکے تھے ۔ ان کی اہمیت کے لیے یہ امر کافی ہے کہ سبائی حکمران کے القاب اور خطاب میں ان اعراب کا ذکر آتا ہے، لیکن اس سیاسی صورت حال کے باوجود شمال مغربی عرب کے سبائی جنوبی عرب کے حکمرانوں سے برسر پیکار رہے ۔ شاہ امرؤ القیس بن عَمرو نے شَمَّر یُرْعش کے نجران کا محاصرہ کر لیا اور شاید اسی کے ہاتھوں عُسیر اور جنوبی حجاز میں جنوبی عرب کے اثر و رسوخ کا خاتمہ ہو گیا ۔

چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں مسبوق الذکر امرؤ القیس بن عَمرو نے اسد اور نزار کے قبائل پر بالا دستی حاصل کر لی اور شاہِ عرب کا لقب اختیار کر کے عرب سواروں کا ایک دستہ رومیوں کی خدمت میں پیش کیا ۔ یہ واقعہ النَّمارہ کے نبطی کتبات میں مذکور ہے اور اس پر ۳۲۸ء تحریر ہے ۔

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر آئندہ سو سال تک دَجاعمہ گھرانے کے رؤسا جو بنو صالح کے قبیلے کے سردار تھے شامی سرحد پر بوزنطی مملکت کے باجگزار حکمران تھے ۔ پانچویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یہ علاقے بتدریج غَسّانیوں کے تصرف میں چلے گئے ۔ بدقسمتی سے عرب مآخذ اس بارے میں زیادہ تفصیل نہیں دیتے ۔

چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں بنو کندہ [رک بآں] حضرموت کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد یمن چھوڑنے پر مجبور ہوے اور بنو مَعَدّ کے علاقے میں غَمرذی کندہ کے مقام پر جا آباد ہوے جو نجد کے جنوب مغربی گوشے میں مکے سے دو یوم کی مسافت پر آباد ہے ۔ اگرچہ بنو کندہ کے

شیوخ قبائل ربیعہ و مُضر پر حکمرانی کے سبب نجد کے بدوی قبائل میں اثر و رسوخ رکھتے تھے، لیکن کندہ کی مملکت، جو عرب قبائل اور یمن کے حمیری اقتدار کے وفاق پر مشتمل تھی، کا آغاز حُجر آکل المرار سے ہوتا ہے۔ یمنی روایات کے مطابق جب تُبّع ابن کرب نے عراق پر لشکر کشی کی تو حجر آکل المرار کو بنو معدّ کا حکمران بنا دیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ حملے کندیوں نے حمیریوں سے مل کر ایران اور اس کے باجگزار شاہان حیرہ کے خلاف کیے تھے۔ مزید بیان کیا جاتا ہے کہ حجر نے قبائل ربیعہ کے ہمراہ البحرین میں بھی ایک فوجی مہم کی سربراہی کی تھی اور بنو بکر کو لے کر لخمیوں کی سرحدوں پر بھی حملہ کیا تھا اور ان کے مقبوضات، جو بنو بکر کے علاقے میں تھے، چھین لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حُجر کو ''اعراب نجد اور عراق کے سرحدی علاقوں کا بادشاہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کی مملکت میں وسطی عرب کے بیشتر حصوں کے علاوہ الیمامہ بھی شامل تھا۔ اس نے عرصۂ دراز تک کامیابی سے حکومت کی اور مرنے کے بعد وادی الرُّمّہ کے جنوب میں مکے سے بصرے جانے والی سڑک پر بطن عقیل میں دفن ہوا۔ اس کی وفات (۴۷۸ء) کے بعد بنو ربیعہ نے اس کے بیٹے عمرو المقصور بن حجر کو مملکت سے محروم کر دیا۔ اب بنو تغلب کا سردار کُلَیب ابن وائل بنو ربیعہ کا سربراہ بن گیا۔ بنو ربیعہ نے حمیریوں کے ساتھ جنگ و قتال کا سلسلہ شروع کر دیا جنھوں نے عمرو بن حجر کی مدد کی تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخری عشرے (۴۹۰ء) میں کلیب اور عمرو ان جنگوں میں ہلاک ہوئے۔ حارث بن عمرو کے زمانے میں بنو کندہ کا اقبال عروج پر تھا۔ بوزنطی مؤرخین اسے Arethas لکھتے ہیں اور عربوں کا سردار بتاتے ہیں۔ اس نے ایرانیوں اور الحیرہ کے لخمیوں کے خلاف رومیوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ لخمیوں کے خلاف جنگی مہمات میں بنو بکر اور بنو تغلب نے اہم کردار ادا کیا (حدود ۵۰۳ء)۔

بہر کیف الحارث نے نجد کے قبائل کو متحد کر کے ایک بڑی مملکت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی اور رومی اور ایرانی طاقتوں پر تاخت شروع کر دی۔ یہ بیان کہ الحارث نے شام اور غسّانی حکمرانوں کو شکست دے کر مطیع بنا لیا تھا، مبالغہ آمیز ہے۔ ۵۰۲ء کی صلح کی رو سے رومیوں کے خلاف جنگ و قتال کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس سے اگلے سال (۵۰۳ء) الحارث کے لشکر نے الحیرہ پر حملہ کر دیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس میں رومیوں کی مرضی و مدد شامل تھی۔ الحارث نے عراق کے تمام عربوں کو زیر نگین کر لیا (۵۰۳ء تا ۵۰۶ء)۔ ایرانی شاہنشاہ قباذ نے المنذر اللخمی کی کوئی مدد نہ کی، جس نے ناچار الحارث کی اطاعت قبول کر کے اس کی بیٹی ہند سے شادی کر لی۔ بہر حال لخمیوں کی مملکت پر مکمل قبضہ نہ ہو سکا۔ جنوبی عرب کی ایک روایت کے مطابق قباذ اور الحارث کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جس کی رو سے بغداد کے قریب دریائے فرات الحارث کی عملداری کی شمالی سرحد قرار پایا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب انوشیروان نے المنذر کو الحیرہ میں اقتدار پر فائز کر دیا تو الحارث نے ''دریائے السواد'' کے دوسرے کنارے کے علاقے کو ۵۲۷ تا ۵۲۸ء اپنے پاس رکھا۔ الحیرہ میں بنو کندر کا زمانۂ اقتدار ۵۲۵ تا ۵۲۸ء ہے جبکہ مزدکی تحریک نے ایرانی سلطنت کو مضمحل کر دیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ الحارث نے ایرانی بادشاہ قباز کے جاگیر دار کی حیثیت سے کچھ عرصے کے لیے العراق سے لے کر عمان تک حکومت کی تھی۔ مزدکیوں کے زوال کے بعد الحارث کو فرار ہونا پڑا۔ المنذر نے اس کی تمام جائداد ضبط کر لی اور اس کے خاندان کے اڑتالیس افراد کو ہلاک کر دیا، تاہم الحارث نے رومیوں تک رسائی حاصل کر لی اور انھوں نے اسے مشرقی رومی سلطنت میں عرب قبائل کا سربراہ مقرر کر دیا۔ الحارث نے ۵۲۸ء میں انتقال کیا۔ اور اسی سال بوزنطی مآخذ میں اس کا ذکر بطور سربراہ قبائل عرب آتا ہے۔ اس کے انتقال سے عرب میں کندی اقتدار کا دوسرا دور اختتام پذیر ہوا۔ الحارث نے اپنی مملکت، جو سارے نجد، الحجاز کے بڑے حصوں، البحرین اور یمامہ پر مشتمل تھی، اپنے لڑکوں کے درمیان تقسیم کر دی، جو پہلے ہی قبائل مَعَدّ کے سردار بنے بیٹھے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا حجر بن الحارث مملکت کندہ پر تھوڑا سا اختیار رکھتا تھا، وہ بنو اسد کی بغاوت کے دوران میں مارا گیا۔ شُرَحْبِیل اور سَلَمہ، قبائل ربیعہ و تمیم پر حکمران تھے اور بنو کندہ کی نصف مشرقی مملکت پر قابض تھے۔ باپ کے انتقال پر بیٹوں میں تقسیم ملک پر جھگڑا ہوا اور شُرَحْبِیل جنگ کُلاب میں ۵۳۰ء کے چند سال بعد مارا گیا (الکلاب کوفے اور بصرے کے درمیان ایک کنواں ہے)۔ ہو سکتا ہے کہ ان لڑائی جھگڑوں کا ظہور المنذر کی سازشوں سے ہوا ہو جس کے جھنڈے تلے بنو تغلب اور بنو بکر فتح مند سلمہ کے اخراج کے بعد جمع ہوگئے تھے۔ معدیکرب قبیلۂ قیس عَیْلان کا سردار تھا، وہ پاگل ہو گیا یا جنگ اُوارہ میں مارا گیا۔ حُجر کا پانچواں لڑکا عبداللہ بحرین میں عبدالقیس کے قبیلۂ ربیعہ پر حکمران تھا۔ اس کا مزید ذکر کہیں نہیں آتا۔ اس طرح حجر آکل المرار کے گھرانے کی مملکت شکست و ریخت سے دوچار ہوئی۔ سَدّ مآرب کے ایک کتبے سے پتا چلتا ہے کہ بنو کندہ یا ان کی بیشتر تعداد نقل مکانی کرکے حضرموت چلی گئی اور ۵۴۳ء کے لگ بھگ وہیں رس بس گئی۔ نامور شاعر اِمْرؤ القیس بن حُجْر نے بوزنطی شاہنشاہ کی مدد سے ملک حاصل کرنے کی ناکام کوشش کے دوران میں انقرہ میں ۵۵۴ء سے قبل انتقال کیا۔ امرؤ القیس کا ایک بھتیجا قیس بن سَلَمہ بھی تھا جو بنو کندہ اور بنو مَعَدّ کا رئیس قبیلہ تھا۔ وہ شاید Kaisos کا مماثل ہے جس نے شاہنشاہ سے فلسطین کی ولایت حاصل کی تھی اور المنذر بن النعمان اللخمی کو شکست دی تھی۔ اس نے ۵۵۴ء میں وفات پائی۔

عرب کے بدوی قبائل کے باہمی تنازعات اور مناقشات ''ایام العرب'' [رک بآں] کے تحت مذکور ہیں۔ حرّان کے ایک عربی کتبے (مورخہ ۵۶۸ء) میں خیبر کی جانب ایک مہم کا ذکر ملتا ہے جو ۵۶۷ء میں بھیجی گئی تھی۔ مذکورۂ بالا حکمرانوں کے علاوہ ہر قبیلے کا اپنا حکمران تھا۔ اس کی تصدیق ام الجمال میں دریافت شدہ ایک نبطی کتبے سے ہوتی ہے جس پر ۲۵۰ء ثبت ہے اور جس میں قبیلۂ تنوخ کے ایک حکمران (ملک) کا ذکر ہے۔

مآخذ: O. Blau: *Arabien im sechsten Jahrhundert*، در *ZDMG* ۱۸۶۹ء، ص ۵۷۹ ببعد؛ (۲) E. Glaser: *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، ۲ ۲۳۲ ببعد، برلن ۱۸۹۰ء؛ (۳) وہی مصنف: *Zwei Inschriften über den Dammbuch von Marib*، در *MVAG*، ۱۸۹۷ء، ص ۵۵؛ (۴) M. Hartmann: *Die Abrabische Frage, Der Islamische Orient*

۲: ۷۹ بعد؛ لائپزگ ۱۹۰۹ء، (۵) F. Hommel *Ethnologie und Geographie des alten Orients* (*Handbuch der Klassischen Altertumswissenschaft*، von W. Otto III. Abll. I. Teil, Bd. I میونخ ۱۹۲۶ء)، ۵۵۰، ۵۷۸ بعد؛ (۶) E. Mittwoch: *Proelia Arabum Paganorum* (مقالہ، برلن ۱۸۹۹ء)؛ (۷) B. Moritz: *Der Sinai-kultus in heidnischer zeit*، Preuss. Akad. d. Wissensch. Abh. Neu Folge xvI برلن ۱۹۱۷ء، ۸: ۵۰ تا ۵۳؛ (۸) De Lacy O' Leary: *Arabia before Muhammad*، لندن ۱۹۲۷ء، ص ۵۲؛ (۹) A. Musil: *Northern Hegaz*، نیویارک ۱۹۲۷ء، ص ۲۸۸ تا ۲۹۱؛ (۱۰) *Arabia Deserta*، نیویارک ۱۹۲۷ء، ص ۴۷۷ تا ۴۹۷؛ (۱۱) *Northern Negd*، نیویارک ۱۹۲۸ء، ۲۲۴؛ (۱۲) Th. Noldeke: *Die Ghassanischen Fürsten aus dem Hause Gafnas Abh. Akad*، برلن ۱۸۸۷ء؛ (۱۳) Gunnar Olinder: *The Kings of Kinda or the family of Akilal-Murār* Lunds Universitets Arskrift Lund، ۱۹۲۷ء، ص ۳۲ بعد، ۴۵ بعد؛ (۱۴) G. Rothstein: *Die Dynastie der Lahmiden in al-Hira*، برلن ۱۸۹۹ء؛ (۱۵) H. Winckler: *Geschichte Babyloniens und Assyriens*، لائپزگ ۱۸۹۲ء، ۱: ۹۴، ۲۶۵ تا ۲۶۷، ۲۸۶ تا ۲۸۸؛ (۱۶) T. Weiss Rosmarin در *Journal of the Society of Oriental Research*، ۱۹۳۲ء، ص ۱ تا ۳۷ (آشوری مآخذ)؛ (۱۷) I. Rabinowitz، در *Journal of Near Eastern Studies*، ۱۵ (۱۹۵۶ء)، ص ۱ تا ۹؛ (۱۸) W. F. Albright: *The Biblical Tribe of Massa and some Congeners*، *Studi Orientalistici in onere di G. levi della Vida*، ۱: ۱ تا ۱۴؛ (۱۹) J. Starcky: *Palmyre* (*L'Orient ancien illustre*، عدد ۷، پیرس ۱۹۵۲ء) ص ۳۶ حاشیہ ۱۴، ۶۵، ۸۸؛ (۲۰) S. Smith: *Events in Arabia in the sixth century A.D*، در *BSOAS*، ۱۶ (۱۹۵۴ء) ص ۴۲۵ تا ۴۶۸؛ (۲۱) M. Guidi: *Storia e Cultura degli Arabi*، فلورنس ۱۹۵۱ء؛ (۲۲) W. Caskel: *Entdeckungen in Arabien, Arabeitsgemeinschaft für Forschung des Landes Nordrhein-west-falen*، Hft ۳۰، ۱۹۵۴ء.

(A GROHMANN)

(۲) عربوں کا پھیلاؤ: عام اور ''ہلال خصیب'' اگر عربوں کے پھیلاؤ کے عمل کو متواتر فرض کیا جائے تو اس سے بعض مستقل خصوصیات کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ یہ پھیلاؤ مستقل آبادکاروں کے بجائے چھوٹی یا بڑی بدوی جماعتوں کی نقل مکانی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نقل مکانی کا سبب اپنوں یا غیروں کی فوجی ملازمت یا توسیع مملکت یا تجارتی بستیاں بسانا ہو۔ مؤخرالذکر صورت کے علاوہ نقل مکانی کی تعداد کچھ تو مخصوص اتفاقات اور کچھ متواتر اور بے حساب عامل یعنی عرب میں آبادی کے دباؤ پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ صورت حال زراعت میں انحطاط سے پیدا ہوتی ہے (جنوبی عرب میں صنعت و حرفت کے انحطاط سے)۔

کاروانوں کے ذریعے تجارت بھی آبادی کی نقل مکانی پر اثر انداز ہوتی ہے (عہد اسلام میں حاجیوں کی آمد و رفت بھی اس کا بڑا سبب ہے)۔ اسی تناسب سے بدوی آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ عربوں کے پھیلاؤ سے قبل جزیرہ نمائے عرب کے وسطی حصوں میں جہاں آبادی خال خال تھی پہلے سے نقل مکانی کا سلسلہ شروع تھا۔ پانچ سو برس قبل از مسیح میں اونٹوں کی پرورش نے اس تحریک عمل کو اور بھی سہل کر دیا۔ لسانی، نسلی اور اثری شواہد سے یہ امر قرین قیاس نہیں کہ جنوبی عرب میں آباد کاری سب

سے پہلے شروع ہوئی۔ جنوبی عرب میں نقل مکانی کرنے والوں کے آبا و اجداد غالباً وہ تاجر تھے جو قدیم تجارتی شاہراہوں پر چل کر ارض بخورات میں پہنچے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد عرب شمال میں سینائے اور شرق اردن کی جانب بڑھنے لگے۔ کتبات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۸۵۳ء میں بادیۃ الشام کے شمال اور اس کے بعد ہلال خصیب کے دونوں اطراف پر موجود تھے۔ وہ اونٹ پالتے تھے، نخلستانوں میں رہتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ یہ مشاغل عربوں کے پھیلاؤ کا اہم سبب تھے، تاہم نقل مکانی کا یہی ایک سبب نہ تھا جیسا کہ حبشہ میں سبائیوں کی آمد (غالباً ۴۰۰ء) سے ظاہر ہوتا ہے۔ نوواردوں کو جذب کرنا ہلال خصیب کے ہر ملک کے مختلف حالات پر منحصر تھا۔ اب ان کو یہ دیکھنا تھا کہ وہ ان مہاجرین کو بستیوں میں آباد کر سکتے ہیں، یا ان کو نیم بدوی صورت میں ملک کی سرحدات پر آباد کر سکتے ہیں، یا ایسے میں قابل کاشت زمینوں پر سارے کے سارے خانہ بدوش افراد تو نہیں قابض ہو جائیں گے۔ پہلی صدی قبل از مسیح میں خانہ بدوش قبائل دریائے فرات کے قریبی کنارے کو عبور کرکے Apamaea-Thapsacus تک کی قابل کاشت اراضی پر قابض ہو چکے تھے جبکہ الجزیرہ خابور کے جنوب اور سنجار تک ان خانہ بدوشوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ بعض استثنائی حالات ہمارے تجزیے سے خارج ہیں، مثلاً نبطیوں کی کاروباری ریاست جس کا عروج اسی صدی میں ہوا تھا۔ اس کی سرحدیں شمال میں حوران اور جنوب میں شمال مغربی عرب تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۱۰۵ء میں نبطی مملکت کے شامی صوبے کے انضمام اور ساٹھ برس بعد رومیوں کی شمال مغربی عرب میں عدم دلچسپی نے ان ممالک کے امن و سکون کو غارت کر دیا۔ ہم وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان صحرا نشینوں کی مغرب میں آمد اور شمالی عرب کے وسطی پہاڑی علاقے (الجبال) میں آباد بنوطئی کی نقل مکانی کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ زیریں فرات اور صحرائے عرب کے درمیانی میدان میں دو قبائل کا داخلہ ایک مختلف معاملہ ہے، جس کا آغاز پہلے ساسانی بادشاہ اردشیر اول (م ۲۴۱ء) کے عہد میں ہوا تھا۔ یہ قبائل تنوخ اور اسد تھے جو مشرقی عرب سے آئے تھے۔ ان کے بعد بنو نزار بھی وسطی اور مغربی عرب سے چلے آئے۔ وہ ایاد کے ماسوا دریائے فرات کی سرحدات پر مقیم آباد کاروں میں گھل مل گئے جبکہ بنو تنوخ اور بنو اسد خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بنو تنوخ شمالی شام اور بنو اسد حوران کے جنوب میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ چوتھی صدی عیسوی سے ان ممالک میں مغربی عرب کے قبائل کی آمد جاری رہی۔ اس اثنا میں بخورات کی تجارت میں کمی (تیسری صدی عیسوی سے ؟) اور اس کے خاتمے (پانچویں صدی عیسوی) نے جنوبی عرب کی آبادی کو خانہ بدوش بنا دیا۔ یہ قبائلی گروہ، جو شاہان حِمْیَر کی جنگی مہمات میں بھی حصہ لیتے تھے، نجران اور وسطی عرب (بنو کندہ) تک پہنچنے لگے۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ قبائل شمال کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی محرک شاہان کندہ کی جنگیں تھیں۔ ان کی پیش قدمی کا راستہ شمالی العارض = طویق سے زیریں فرات کا میدان (بنوبکر، تمیم)، بیشہ سے وادی الرمّہ (بنوعامر) اور مدینے کے شمالی علاقے سے پالمائرا

[رَکّ بآن] بَہراء، کلب) کی جانب تھا - بنو تغلب پہلے زیریں فرات میں آباد تھے، لیکن جب اسلام آیا تو وہ بالائی فرات کے ساتھ ساتھ نقل مکانی کرتے ہوئے الجزیرہ میں سنجار کے شمال میں آباد ہو چکے تھے .

آغاز اسلام میں عربوں کا پھیلاؤ فوجی ملازمت کا مرہون منت ہے جب کہ فرات، شرق اردن، جنوبی فلسطین اور اس کے بعد عراق، شام اور الجزیرہ کی تسخیر کے لیے مدینے سے اسلامی عساکر بھیجے گئے تھے- زان بعد عربوں نے خلیج فارس کے پار کوفے اور بصرے کی چھاونیوں سے نکل کر ایران اور دمشق سے لے کر مصر، شمالی افریقیہ اور اندلس تک جنگوں میں حصہ لیا- اس کا دوسرا سبب شرق اردن سے فلسطین تک (شمال میں عاملہ اور جذام اور جنوب میں) لخم قبائل کا ترک وطن تھا - بَلِی اور جُہَیْنہ کے بعض قبائل بھی حجاز چھوڑ کر مصر چلے گئے تھے - بہت سے گروہ اور خاندان الجزیرہ کی چھاونیوں میں لگاتار داخل ہو کر آباد ہو رہے تھے - مزید برآں کوفے اور بصرے کے باشندے خراسان جا کر توطن اختیار کر رہے تھے- بنوسُلَیم اور مغربی عرب کے بنوقَیس کے چار سو گھرانوں نے زیریں مصر میں آباد ہونے کے لیے اپنے نام لکھوائے تھے ، لیکن اس تعداد سے سہ گنا اشخاص بعد میں برضا و رغبت چلے گئے - اس طرح عہد اسلام میں عربوں کے پھیلاؤ کا پہلا مرحلہ تکمیل کو پہنچا - اب زرخیز ہلال اور عرب کے درمیان واقعات کا پردہ دوبارہ حائل ہو جاتا ہے .

عرب کی آبادی میں نقل مکانی اور اسلامی فتوحات کے لیے جنگوں کے سبب جو کمی واقع ہوئی تھی اس کے پورا کرنے میں کافی وقت لگا - پہلی نقل و حرکت کا رخ الجبل سے شمال مشرق کی سمت تھا - نویں صدی عیسوی کے وسط سے قبل ہی بنو اسد نے کوفے سے مکے جانے والی شاہراہ پر پیش قدمی شروع کر دی تھی - ان کے پیچھے پیچھے بنوطئی بھی ہو لیے - دسویں صدی عیسوی کے آخر میں بنو بُوَیْہ کے عہد میں نزاعات کی وجہ سے بنو اسد مزروعہ اراضی پر قابض ہونے لگے - ان کے بعض افراد گھومتے پھرتے خوزستان جا نکلے، جہاں اسلام سے قبل ہی عربوں (بنو تَمِیْم) کی نوآبادی قائم ہو چکی تھی - اس اثنا میں عراق (۳۱۱ھ/ ۹۲۳ء تا ۳۲۵ھ/۹۳۷ء) اور شام و مصر (۳۵۳ھ/۹۶۴ء تا ۳۶۸ھ/۹۷۹ء) میں مشرقی عرب کے قرامطہ کی چھاپا مار سرگرمیوں کی وجہ سے بے شمار لوگ شمال کی طرف چلے آئے تھے - خفاجہ (بنو عُقَیل) مشرقی عرب سے نقل مکانی کر کے زیریں فرات کے میدان میں آ رہے تھے - گیارھویں صدی عیسوی میں ان کے بعد بنومُنْتَفِق (از بنو عقیل) بھی چلے آئے- مشرقی عرب میں تارکان وطن کی جگہ عُمان کے قبائل نے لے لی - ان میں سے بعض قبائلی عراق میں داخل ہو گئے - بنوطئی کے بعض افراد جنوبی شرق اردن میں رس بس گئے اور فلسطین میں اپنے سے پہلے آنے والوں پر اپنی سیادت قائم کر لی - اوائل عہد اسلام میں ترک وطن کی جو تحریک جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف شروع ہوئی تھی، گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں دوبارہ زور پکڑ گئی - (اس میں حکومت کا ہاتھ تھا) اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ازمنۂ متوسطہ میں مصریوں نے فلسطین کو ہجرت شروع کی - بارھویں صدی عیسوی کے اواخر سے بنوجُذام کی تھوڑی سی تعداد شمالی حجاز سے سیناء کو عبور کر کے مصر اور شرق اردن میں داخل ہوتی

رہی تھی تاآنکہ سترھویں صدی عیسوی میں یہ سلسلۂ آمد و رفت بالکل ختم ہوگیا - ان کے بعد بنوبَلِی کی نقل مکانی شروع ہوئی - پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بنوھُتَیم کے ادنیٰ لوگ خیبر کے مشرقی جانب سے ان اضلاع میں گھس آئے تھے - دریں اثنا الجبل میں عربوں کی مزید آمد شروع ہوگئی تھی - بارہ سو کے لگ بھگ بنو غزِّیة (بنوطئی) شمال میں شرق اردن اورعراق کے درمیان اور بنو لام (وہ بھی بنوطئی سے تعلق رکھتے تھے) جنوب میں مدینے اور القَسیم کے درمیانی علاقے میں چلے آئے - پندرھویں صدی عیسوی سے بنو غَزِّیه نے اپنے خیمے دریاے فرات کے کنارے لگا رکھے تھے، لیکن ۱۸۰۰ء سے پیشتر دریا کے دوسری جانب نہیں پہنچ سکے - بنو لام بھی پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں حجاز کی شمالی سرحد میں داخل ہوگئے تھے، لیکن عثمانیوں (ترکوں) نے انھیں پیچھے دھکیل دیا .اور وہ سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنی قدیم شاہراہ پر چل کر جانب مشرق ہوتے ہوے دریاے دجلہ کے زیریں علاقے اور خوزستان کی طرف چلے گئے .

سب سے آخری اور بڑی نقل مکانی بنو شَمَّر اور بنو عنزہ کی تھی - سترھویں صدی عیسوی کے آخرمیں بنوشَمَّر الجبل سے آکرعراق کی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد ہوگئے - بنو عَنْزَہ (جن کا علاقہ اس وقت تک مدائن صالح سے القَسِیْم تک تھا)، بنو صخر کے ساتھ شرق اردن تک نفوذ کر آئے تھے - اٹھارھویں صدی عیسوی میں جنوب مغرب اور جنوب مشرق سے آنے والے بنوعنزہ بادیۂ شام میں سکونت پذیر ہو چکے تھے - اس آمد و رفت کے دوران میں وھابیوں کی لڑائیاں چھڑ گئیں - انیسویں صدی عیسوی میں بنوشَمَّر - قبیلۂ شَمَّر کے بنوالجرباء اپنا آبائی وطن چھوڑ کر، جس پر وھابیوں نے قبضہ کر لیا تھا، فرات کے علاقے میں آ بسے - ۱۸۰۲ء کے آغاز میں ایک سرکاری معاھدے کی رو سے وہ الجزیرہ میں ایشیاے کوچک کے دامن کوہ تک پہنچ گئے - بنو عنزہ کے بعض قبائل وھابی لشکر کے ھمراہ یا محصلین محاصل سے بچتے ہوے بادیۂ شام میں پہنچ گئے .

شمالی عرب میں ۱۹۱۱ء سے زراعت کی ترقی اور گزشتہ بیس سال سے پٹرول کی دریافت نے فی الحال عربوں کے پھیلاؤ کو روک دیا ہے .

اس پھیلاؤ کی بعض خصوصیات ابھی تک محتاج بیان ھیں، جو اس مقالے میں مناسب جگہ نہیں پا سکیں : خلیج فارس کے ایرانی ساحل پر آبادکاری (جس کا تعلق زمانۂ قبل از اسلام سے ہے) - زمانۂ قدیم سے ازمنۂ متوسطہ تک بحیرۂ ھند کے مختلف ساحلی مقامات اور جزائرِ مالا بار ، مدغا سکر اور مشرقی افریقیه پر تجارتی نوآبادیوں کا قیام؛ حضرموت سے متواتر نقل مکانی جس کا رخ زیادہ تر انڈونیشیا کی طرف تھا، (ریاست حیدرآباد [دکن] کی ملازمت میں حضر موت کے رہنے والے سپاھی تھے)، بحیرۂ قلزم کے پار بالائی مصر میں عربوں کا ورود .

(W. CASKEL)

(۳) اوائل عہد اسلام میں عرب ایران میں : عربوں نے ایران فتح کیا تو اس فتح کے جلو میں کچھ عرب بھی ایران میں چلے آئے - ان کی آبادکاری دو طریقوں سے ہوئی : (۱) عرب کے ساحل سے خلیج فارس کے ساتھ ساتھ ایرانی ساحل کے جنوبی علاقے میں نقل مکانی - (اس کے علاوہ) عرب دریاے دجلہ و فرات کے دہانے سے ساحل سمندر کے کنارے کنارے جنوب مشرق کی طرف پھیل گئے تھے - بظاھر

عربوں کی بستیاں یہاں اسلام سے پہلے ہی قائم ہوگئی تھیں (دیکھیے A. Christensen : *L' Iran sous les Sassanides* بار دوم، ص ۸۷، ۱۲۸) اوائلِ عہد اسلام میں عربوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا، مثلاً عمان کے ساحل سے آنے والے بنو عبدالقیس کے آبادکاروں کا خصوصی ذکر ملتا ہے (البلاذری، ۳۸۶، ۳۹۲؛ الاصطخری، ۱۴۲، ابن الأثیر (بولاق)، ۳ : ۴۹) - اس زمانے سے عربوں کی بستیاں ساحل اور اندرونی ملک کے بعض مقامات (مثلاً ۹۸۵ء میں بردسیر کے ضلع میں ماہان - المقدسی، ۳ - ۴۶۲) میں مغولوں کے زمانے تک قائم تھیں (B. Spuler : *Die Mongolen in Iran*، طبع دوم، لائپزگ ۱۹۵۵ء، ص ۱۴۲، ۱۶۹ ببعد، ۱۶۴) - یہ ماننے کی معقول وجوہ ہیں کہ ماضی اور حال کی بستیوں کے درمیان رابطہ رہا ہے کیونکہ خلیج فارس اور بصرے سے نقل مکان کا سلسلہ مسلسل جاری رہا ہے - عرب آبادکاروں کا دوسرا ریلا عراق عرب سے ایران آیا - ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کی بستیاں متعدد شہروں، مثلاً کاشان، ہمدان اور اصفہان میں قائم ہو چکی تھیں - قم میں عربوں (شیعوں) کی غالب اکثریت تھی اور یہ عرصۂ دراز تک رہی (البلاذری، ۳۱۴، ۴۰۳، ۴۱۰، ۴۲۶؛ نرشخی (شیفر)، ۵۲؛ ابن الأثیر (بولاق)، ۵ : ۱۵؛ E. G. Browne : *Account of a rare ms. Hist. of Isfahan*، Hertford ۱۹۰۱ء، *JRAS* ۲۷ و ۱۹۰۱ء سے نقل شدہ طباعت)؛ B. Spuler : *Iran* [دیکھیے مآخذ] ص ۱۷۹) - عرب آبادکاروں کی تعداد آذربیجان میں قلیل تھی (البلاذری، ۳۲۸، ۳۳۱؛ الطبری ۱ : ۲۸۰۵ ببعد؛ ابن حوقل، بار دوم، ص ۳۵۳؛ الیعقوبی : تاریخ، ۲ : ۴۴۶؛ الاغانی، بار اول، ۱۱ : ۵۹)

ان نقل مکانیوں میں عربوں کا منتہائے مقصود خراسان رہا - حقیقی آباد کاری ایک حد تک بڑی بڑی جماعتوں کی مرہون منت ہے - بعض بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ پچیس ہزار عرب بصرے اور اتنی ہی تعداد کوفے سے ۵۲ھ/۶۷۲ء خراسان آئی تھی - ان آباد کاروں کا دوسرا گروہ ۶۸۳ء میں خراسان پہنچا تھا - قابل جنگ مردوں کی یہ تعداد (۵۰۰۰۰) اور بھرتی کے سخت قوانین کی بنا پر J. Wellhausen (دیکھیے مآخذ) کا اندازہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں عرب آباد کاروں کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی - ان کا قیام شہروں ہی میں نہ تھا جہاں فتح پر ان کے لیے محلے مخصوص کر دیے گئے تھے، بلکہ وہ سارے ملک میں پھیلے ہوے تھے - مثال کے طور پر وہ مرو کے نخلستان میں رس بس گئے تھے اور وہاں املاک حاصل کر کے انھوں نے دھقانوں کے طور طریقے اختیار کر لیے تھے - خراسان کی جغرافیائی کیفیت بھی عربوں کے حسب حال تھی - وہ میدانوں اور کھلے علاقوں کو آسانی سے عبور کر لیتے تھے، لیکن دریاؤں اور پہاڑوں کے پار کرنے میں خراسانیوں کی نسبت زیادہ پھرتیلے نہ تھے (دیکھیے Barthold : *Turkestan*، ص ۱۸۲) .

خراسان میں عربوں کی بیشتر تعداد بصرے سے آئی تھی - آباد ہونے والے قبائل میں بنو قیس کی اکثریت مغرب میں تھی، بالخصوص آٹھویں صدی عیسوی میں (الطبری، ۲ : ۱۹۲۹ء) جبکہ بنو تمیم اور بنو بکر کی مشرق اور سیستان میں مخلوط آبادی تھی - اس طرح ان قبائل کے باہمی جھگڑے مختلف نوعیت کے ہوتے تھے - ابن الأثیر (بولاق، ۵ : ۶) کا بیان ہے کہ ان نوواردوں کی تعداد حسب ذیل تھی : اہل بصرہ نو ہزار، بنو بکر

سات ہزار، بنو تمیم دس ہزار، عبد القیس چار ہزار، بنو ازد دس ہزار، اہل کوفہ سات ہزار، (کل تعداد سینتالیس ہزار، جو اہل کوفہ و بصرہ کی متذکرہ تعداد سے ملتی ہے)۔ اس کے علاوہ ان قبائل کے سات ہزار موالی بھی تھے۔ (اس فہرست میں ان قبائل کے علاوہ جو تعداد مذکور ہے، وہ اہل بصرہ و کوفہ کی ہے)۔ ان قبائل کے جو اختلافات بصرے میں تھے، وہ خراسان میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ اگر ایک طرف ربیعہ (بنو بکر اور عبد القیس) اور یمنی ازدی تھے (جو بعد میں آئے تھے) تو دوسری طرف بنو تمیم اور بنو قیس تھے (وہ مجموعی حیثیت سے مضر کے نام سے معروف تھے) اور اپنے حسب و نسب پر نازاں تھے۔ ۶۸۳ء میں خلافت کے لیے خانہ جنگی ہوئی تو ربیعہ اور مضر میں بھی خونریز جنگ ہوئی۔ ۶۴ تا ۶۵ھ/۶۸۴ تا ۶۸۵ء میں ہرات سے باہر بنو بکر اور بنو تمیم کے درمیان ایک سال تک جنگ برپا رہی (الطبری، ۲: ۴۹۰ تا ۴۹۶)، جو بنو تمیم کے باہمی تفرقے ہی سے خود بخود ختم ہوگئی۔ اگرچہ ۷۴ھ/۶۹۳۔۶۹۴ء میں ایک غیر جانبدار قریشی والی بن کر آ گیا تھا پھر بھی جنگ ۸۱ھ/۷۰۰ء تک جاری رہی (الطبری، ۲: ۸۵۹ تا ۸۶۲)۔ فتح اور شکست کا مدار والی کے رویّے پر تھا جبکہ خود اس کی روش پر مغرب (شام اور عراق) کے جماعتی اختلافات اثر انداز ہوتے تھے۔ ۸۵ تا ۸۶ھ/۷۰۴ تا ۷۰۵ء میں والیوں کا تبادلہ ہوا تو بنوازد اور ربیعہ کے سیاسی اقتدار میں عارضی طور پر فرق آ گیا۔ ماوراء النہر کے فاتح قتیبہ بن مسلم ان مقتدر گروہوں میں سے کسی سے بھی قرابتداری نہ رکھتے تھے، انھوں نے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کی۔ ان کی ترکتازیوں کی بدولت عرب سمرقند، بخارا اور خوارزم تک پھیل گئے، جہاں ان کے لیے مخصوص محلے تیار کیے گئے تھے (البلاذری، ۴۱۰، ۴۲۱ ببعد؛ الطبری، ۲: ۱۵۶؛ ابن الأثیر (بولاق)، ۳: ۱۹۴؛ النرخشی، ۵۲)۔ قتیبہ بن مسلم کے انتقال کے بعد یزید ثانی کے عہد خلافت میں بنو ازد نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا، لیکن ۷۲۰ء میں بنو تمیم نے طاقت حاصل کر لی۔ بنو قیس اور بنو تمیم کی بد انتظامی نے خراسان میں اموی حکومت کو اس قدر رسوا کیا کہ نصر بن سیار جیسا فراخ دل والی بھی ۷۴۴ء کے بعد ان متحارب گروہوں میں مصالحت نہ کرا سکا۔ عباسی انقلاب، جو عربوں کے طرز عمل کا نتیجہ تھا، ان کو متأثر نہ کر سکا۔ ۷۴۸ تا ۷۵۰ء میں عباسیوں کی کامیابی نے مشرق میں عربوں کے لیے نئے حالات پیدا کر دیے۔

خراسان کی فتح کے بعد عربوں کی ایک قلیل تعداد نے ایرانیوں سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے تھے۔ بعض مرزبانوں اور دھقانوں نے بعجلت تمام عربوں سے صلح کر لی تھی۔ یہ عرب ایرانیوں کی ثقافتی زندگی کے بعض مظاہر میں شریک ہوتے تھے (نوروز اور مہر جان کے تہواروں میں شامل ہوتے تھے جب کہ وہ مصر میں قبطیوں کے جشنوں میں شرکت کیا کرتے تھے)۔ ایرانیوں اور عربوں کے درمیان شادیاں بھی ہوتی تھیں (ان کا ذکر اسی وقت ہوتا تھا جبکہ فریقین مقتدر حیثیت کے مالک ہوتے تھے، عوام میں بھی شادیاں بکثرت ہوتی رہتی تھیں) اور ان کی اولادیں مشرف بہ اسلام ہونے والے ایرانیوں میں گھل مل جاتی تھیں یا خود کو ان سے منسوب کرنے لگتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض عربوں (مثلاً ترمذ میں موسیٰ بن عبداللہ بن خازم، نے حکومت سے لڑ جھگڑ کر مقامی لوگوں

سے اتحاد کر لیا تھا ۔ مزید برآں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت (۷۱۷ تا ۷۲۰ء) میں بعض عربوں میں دینی شعور بیدا ہونے لگا تھا (مثلاً حارث بن سریج) اور انھوں نے اس جذبے کے تحت ایرانیوں کے لیے مکمّل مساوات کا مطالبہ کیا (قب Wellhausen : *Das arab. Reich*، ص ۲۸۰)، اس لیے ان کے شخصی اور مالی محاصل کے مسائل کے حل کے لیے بہت سی کوششیں کی گئیں ۔ بہرکیف یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ۷۲۰ء سے آگے قبائلی وفاداری کی جگہ اسلامی اخوت نے لے لی تھی، جو عالمگیر عرب اتحاد کے احساس کے لیے ایک ضروری امر تھا ۔ آئندہ چل کر جو سیاسی حوادث پیش آئے ان کا سرچشمہ قبائلی تنازعات کو قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

ان اسباب کی بدولت اموی سیاست، جو قبائلی نظام پر تعمیر ہوئی تھی، ناکامی کی موت مر گئی اور آگے چل کر عنان اقتدار عباسیوں کے ہاتھ آ گئی ۔ (اس اقتدار میں علوی بھی شامل تھے، جو شروع میں عباسیوں کے شریک حال تھے) جن کا طریق کار جدا تھا ۔ عرب عباسی تحریک میں آگے آگے تھے، لیکن ان کے دوش بدوش ایرانی بھی کام کر رہے تھے ۔ عربوں اور ایرانیوں کا یہ اتحاد امویوں کے زوال تک قائم رہا (زمانۂ مابعد میں بھی کوئی نسلی تفرقہ پیدا نہیں ہوا) ۔ ان اسباب کی بنا پر ۷۴۶ تا ۷۵۰ء میں عربوں اور ایرانیوں کو امویوں پر فتح حاصل ہوئی ۔ اس زمانے میں ابو مسلم کی فوج کے بیشتر عرب سپاہی فارسی بولتے تھے (الطبری، ۳: ۵۱، ۶۴ ببعد) ۔

بعض عربوں نے اس یک جہتی میں بالکل حصہ نہیں لیا ۔ ان کی بیشتر تعداد کو عباسی جنگوں کے دوران خراسان سے باہر دھکیل دیا گیا ۔ باقی ماندہ آبادکار جو (عربوں کی طرح) سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم نہ تھے، ایرانیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے ۔ قبائل کی باہمی آویزشیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں، اگرچہ دسویں صدی عیسوی میں بھی بعض قبائل کا ذکر ملتا ہے (دیکھیے مندرجۂ ذیل مآخذ) ۔ باہمی میل ملاپ (انجذاب) کا عمل مسلسل جاری رہا اور بہت سے عرب ایرانیوں میں گھل مل گئے ۔ یہ عمل ان طاقتوں میں بسرعت تمام ہوا جہاں عرب اپنی جاگیروں میں دوسروں سے الگ تھلگ رہتے تھے، (مرو کا نخلستان اس کی ایک مثال ہے) ۔ عباسی عہد میں بھی ملک بھر میں عربی عنصر کی مزید تقسیم کو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ اس کے بعد عربوں کا نیا ریلا مغرب سے آیا ۔ یہی وجہ تھی کہ بعض مقامات میں عربوں کی آبادی گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی تک پائی جاتی ہے، اگرچہ دسویں صدی عیسوی ہی میں ان کی تعداد گھٹنے لگی تھی ۔ اس بارے میں تفصیلی بیانات کم یاب ہیں، مثلاً اصفہان کے لیے دیکھیے الیعقوبی : البلدان، ص ۲۷۴؛ خراسان کے مختلف مقامات کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب مذکور، ص ۲۹۴؛ الاصطخری، ص ۳۲۲، ۳۲۳؛ ابن حوقل، بار دوم، ص ۴۹۹؛ المقدسی، ص ۲۹۲، ۳۰۳؛ کاشان کے لیے حدود العالم، ص ۱۳۳، اور کتاب مذکور ۱۰۴، ۱۰۸، ۲۱۶ (جوزجان)؛ الجاحظ : ثلاث رسائل (Van Vloten)، ۴۰؛ الاغانی، بار اول، ۱۴: ۱۰۲، ۱۷: ۶۹؛ الجوینی، ۲: ۴۶ (منزل گاہ عرب پڑھیے)؛ S.A. Volin : *K istorii sredneaziatskikh arabov* (در *Trudy vtoroy Sessii assotsiotsii arabistov* ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۱ء)، ۱۲۴؛ B. Spuler : *Iran*، ۲۵۰ - ابن بلخی کا فرس نامہ (۱۹ ببعد: ۱۱۶ ببعد) اور القمی : تاریخ قم (تہرانی)، ۲۶۶ تا

۳۰۵ (خاندان اشعری) عرب کُتّاب کے ایرانیوں میں بتدریج گھل مل جانے کے بارے میں بصیرت افروز معلومات پر مشتمل ہیں۔

مآخذ: (۱) A. v. Kremer: *Culturgeschichte des Orients*، ویانا ۱۸۷۵ تا ۱۸۷۷ء (بالخصوص ۲: ۱۴۳)؛ (۲) J. Wellhausen: *Das arabische Reich und sein Sturz*، برلن ۱۹۰۲ء، بالخصوص ص ۲۴۷ تا ۳۵۲؛ (۳) W. Barthold: *Turkestan*، اشاریہ؛ (۴) وہی مصنف: *K Istorii oroshevniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ص ۱۱۱، ۱۲۶؛ (۵) P. Schwarz: *Iran*، ۸: ۱۱۸۱ تا ۱۱۸۵ (آذربائیجان)؛ (۶) B. Spuler: *Iran infrüh-islamischer Zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ۲۰ تا ۴۵، ۲۴۷، ۲۵۰، ۳۳۵ ببعد اور اشاریہ۔

(B. SPULER)

ضمیمہ: زمانۂ حال میں وسطی ایشیا کے عرب: زمانۂ حال میں وسطی ایشیا اور افغانی ترکستان کے عربوں (جن کی زبان فارسی ہے: *The Imperial Gazeteer of India*، ۵: ۶۸) آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، اگرچہ ان مقامات کا تعین نہیں ہوسکا) کی اصل کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ انہیں امیر تیمور یہاں لایا تھا۔ یہ عرب اپنی ابتدائی بستی [منزل گاہ] کا نام افغانستان کے ضلع اَنْدَخُوئی [رکّ بان] اور اس کے متصل آقچہ [صوبۂ مزار شریف] کا نام بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرشی، بخارا اور حصار ان کی گزرگاہیں تھیں۔ امیر تیمور کے سوانح حیات کے مآخذ میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں کہ اس نے عربوں کو دوبارہ بسایا تھا اور نہ اس کے داماد میر حیدر کا کہیں پتا چلتا ہے، جس کا زبانی روایات میں ذکر آتا ہے۔ اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرو کے باشندوں کو بخارا اور ساکنان بلخ، شبرغان اور اندخوئی کو ۱۵۱۳ء میں وادی زرافشان میں لے جا کر بسایا گیا تھا (عبید اللہ: زبدۃ الآثار، در *Zap. Vostocnago Otdéleniya*، ۱۵: ۲۰۲ ببعد)۔ مزید برآں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ایک طرف تو عراق عجم اور بخارا، دوسری طرف سمرقند اور وادی کشکہ دریا کے درمیان مہاجرت کا امکان تھا (عبداللہ بن محمد المَرْوَرِید: الترسل، بحوالۂ Volin، ص ۱۲۱ تا ۱۲۳؛ قب H. R. Roemer: *Staatsschriben der Timuridenzeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ص ۹۴ ببعد، ۱۷۷، مع لوح ۳۸ ب تا ۳۹ الف [اس میں دستاویز کا اصلی حصہ دکھائی نہیں دیتا])۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وسطی ایشیا کے زمانۂ حال کے عرب اوائل عہد اسلام کے عرب مہاجرین کی نسل سے نہیں ہیں [دیکھیے اوپر (۳)]، اگرچہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان کا حسب و نسب ان آباد کاروں سے ملتا ہو جو گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں ایرانی بن گئے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی میں وسطی ایشیا کے عرب "میر ہزار" کے ماتحت ہوتے تھے، جو سرکار کی طرف سے محصّل ہوتا تھا۔ یہ عرب بادیہ نشین (اعراب) کے نام سے معروف تھے (مذکورۂ بالا دستاویز کے علاوہ دیکھیے سمرقند کا مجموعۂ انشا، مولفۂ ۱۵۳۰ء، مطبوعۂ Volin، ص ۱۱۷ تا ۱۲۰)۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں ان عربوں کا کہیں بھی ذکر نہیں آتا، لیکن انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ان کا تذکرہ مختلف سفر ناموں میں ملتا ہے (ان کے اقتباسات Volin نے دیے ہیں)۔ یہاں دو نظریات میں امتیاز ضروری ہے:

(۱) ایک گروہ، جو خود کو عرب کہتا ہے، شکل و شباہت کے اعتبار سے ایرانیوں سے

مختلف نہیں - یہ لوگ جس ملک میں رہتے ہیں، اسی کی زبان بولتے ہیں - سمرقند کے علاقے میں ان عربوں کا ایک گروہ تاجیکی اور دوسرا اُزبکی زبان بولتا ہے - سیاحوں کے بیانات کے مطابق عربوں کے دوسرے گروہ ترکمنستان، خیوہ، فرغانہ اور کوہ تاجیکستان میں بھی پائے جاتے ہیں - انیسویں صدی عیسوی میں ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد پچاس سے ساٹھ ہزار تھی - ۱۹۲۶ء میں Vinnikov (دیکھیے مآخذ) اسی تعداد کو (مردم شماری کے باوجود) معتبر قرار دیتا ہے - انیسویں صدی عیسوی میں بھی یہ عرب ''میر ہزار'' کے تحت تھے، اگرچہ اسے مالی اختیارات حاصل نہ تھے - ۱۹۲۶ء میں روس میں جو مردم شماری ہوئی، اس کی رو سے ان کی تعداد ۲۸۹۷۸ اور ۱۹۳۹ء میں ۲۱۷۹۳ تھی - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عرب جو اپنے گرد و پیش کی زبان بولتے تھے، اُزبکی اور تاجیکی ماحول میں زیادہ سے زیادہ جذب ہو گئے تھے - ان کی اور ان کے پڑوسیوں کی معاشی حالت یکساں تھی - چونکہ ایک زمانے میں یہاں عورت کو سربراہ خاندان کی حیثیت حاصل رہی تھی، لہٰذا بعد میں بھی معاشرے کے اندر ''ماموں'' کی اہمیت برقرار رہی (بھانجے اور ماموں کے درمیان خصوصی تعلق اور ماموں زاد بہن یا بھائی سے شادی)؛ چنانچہ انقلاب سے قبل ان عربوں کی کم از کم تہائی تعداد اسی قسم کے معاشرے میں زندگی بسر کر رہی تھی (دیکھیے M. O. Kosven : *Avunkulat* در *Sovetskaya Etnografia*، ۱۹۴۸ء عدد ۱) .

ان خود ساختہ ''عربوں'' (بلحاظ تاریخ) اور ان عربوں میں ہمیں امتیاز کرنا ہوگا جو ابھی تک عربی بولتے ہیں - مذکورۂ بالا دستاویزات کی رو سے ان میں وجہ امتیاز سولھویں صدی عیسوی ہی میں پیدا ہو چکی تھی - دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عرب اس سے خاصا عرصہ پیشتر آباد ہو چکے تھے، ورنہ ان (بدویوں) کا لسانی اعتبار سے جزوی طور پر گھل مل جانا خارج از امکان ہوتا - ۱۹۲۶ء کی روسی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد ۴۶۵۵ تھی، جو زبان کے اعتبار سے سعنونی اور سعبونی قبائل میں منقسم تھے - ان کی بیشتر تعداد ازبکستان (۲۱۷۰) اور تاجیکستان (۲۲۷۴) میں رہتی ہے - ۱۹۳۹ء میں ازبکستان کے عربی بولنے والوں کی تعداد ۱۷۵۰ تھی - بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۷ء کی روسی مردم شماری، جس میں ۱۶۹۶ عرب مذکور ہیں، تو اس سے عربی بولنے والے عرب ہی مراد ہیں - یہ اعداد و شمار غیر مستند معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ما بعد کے سالوں میں عربوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ دکھائی گئی ہے - یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ گروہ بھی اپنے ماحول کے زیر اثر اپنی انفرادیت کھو رہا ہے .

ان عربوں کی زبان عراقی عربی سے مأخوذ ہے، لیکن مالٹی زبان کی طرح عربی کی ایک مستقل قسم بن گئی ہے اور دو حصوں میں منقسم ہے - وسطی ایشیا کے عربوں نے خالص عربی زبان میں پ اور چ کا اضافہ کر لیا ہے، جبکہ انھوں نے ث اور ذ اور جزوی طور پر ہمزہ کو خیر باد کہ دیا ہے - حرف ف معدوم ہوچکا ہے اور ق کو گ بولتے ہیں، الف ممدودہ کو ساکن پڑھتے ہیں - پیش (ـُ) پر زور بدلتا ہے - حذف و اختصار کا عمل جاری رہتا ہے - صیغۂ غائب اور حاضر کی جمع مؤنث میں آخری حرف بدوی بولیوں کی طرح قائم رہتے ہیں - ان دو بولیوں میں ایک کے افعال مضارع میں م کا سابقہ شامل ہو جاتا ہے - (کیا یہ سابقہ ایرانی یا شامی یا مصری عربی

سے مشابہت رکھتا ہے ؟) ۔ شاید یہ رد و بدل ترکی زبان کے اثر کا نتیجہ ہو ۔ کاکیشیا کی زبانوں (مثلاً قدیم گرجستانی) کی طرح مفعول کے اظہار کے لیے فعل کے ساتھ ایک لاحقہ ہوتا ہے (دیکھیے شامی عربی کی نشو و نما) ۔ ''کَانَ'' بطور معاون فعل مستعمل ہے (دراصل ماضی بعید کے معنوں میں)۔ مصدر کے آخر میں اَحَان اور ان ہوتا ہے ۔ اسما پر تنوین نہیں آتی اور جمع کے آخر میں یْن اور ات آتے ہیں ۔ (یہ مذکر اسما میں بھی اکثر واقع ہوتا ہے)، جبکہ جمع مکسر کا استعمال شاذ ہے ۔ عربی ہندسوں کی جگہ مکمل طور پر تاجیکی عددوں نے لے لی ہے ۔ جملے کی ترتیب اپنی جگہ قائم ہے، لیکن ہندی جرمنی جیسی زبانوں کی طرح لفظوں کی ترکیب عام ہے (حَطَب مبیع = ایندھن فروش) ۔ عام لفظی ترتیب میں سب سے پہلے فاعل، پھر مفعول اور دیگر متعلقات ہوتے ہیں ۔ لفظی ذخیرہ سامی زبانوں سے مأخوذ ہے جو زیادہ تر عراقی عربی اور جزیرہ نمائے عرب کی عربی پر مشتمل ہے ۔

مآخذ : (الف) تاریخی : (۱) M.S. Andreev، در *Izvestiya Turkest. otdela. Russk. geogr. ob-va*، ۱۹۲۴ء، ص ۱۲۶ تا ۱۳۷؛ (۲) N. Burykina و M. Izmaylova : *Nekotorye dannye po yazyku arabov kishlaka Dzugary Bukharskogo Okruga i kishlaka Dyeonau Kashkadar inskegs okruga Uzbeksoy SSR, Zap. Kollegii Vostokovedov*، ۱۹۳۱ء، ص ۵۲۷ تا ۵۴۹؛ (۳) S.L. Volin: *K. istorii sredneaziatskikh arabov, Trudy vtoroy sessii assotsiatsii arabistov*، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۱ء، ۱۱۱ تا ۱۲۶؛ (۴) I.N. Vinnikov: *Araby v SSSR, Sovetskaya Etnografiya*، ۱۹۴۰ء، عدد ۴، ص ۳ تا ۲۲، (۵) D.N. Logofet: *Bukharskoe khanstvo pod russkim protektoratom*، ج ۱، ۱۹۱۰ء؛ (۶) *Bol'shaya Sovetskaya Entsiklopediya*، بار دوم، ۲ : ۵۹۸؛ (ب) زبان : Burykina و Izmaylova کتاب مذکور؛ (۱) eli، eret، G.V.C: *K. kharakteristike yazyka sredneaziatskikh arabov, Trudy vtoroy sessii assotsiatsii arabistov*، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۱، ۱۳۳ تا ۱۴۸؛ (۲) وہی مصنف : *Materialy dlya izuceniya arabskikh dialektov Sredney Azii, Zap. Instituta Vostokvedeniya Akademii Nauk SSSR*، ۱۹۳۹ء ص ۲۵۴ تا ۲۸۳ - (جو ملاحظے میں نہیں آسکیں : Zarubin: *Spisok narodnostey SSSR*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء؛ (۳) N. B. Arkhipov : *Sredne-aziatskie respubliki*، بار سوم لینن گراڈ ۱۹۳۰ء) .

(B. SPULER)

(۴) عرب مصر میں : ۱۸ھ/۶۳۹ء کے آخر میں ایک عرب فوج (یلغار کرتے ہوئے) شامی - مصری سرحد پر نمودار ہوئی اور اس نے مصر کی تسخیر کا آغاز کر دیا ۔ ۲۰/ ربیع الآخر/ ۹ اپریل ۶۴۱ء کو صلح نامے پر دستخط ہوگئے جس کی رو سے سرزمین مصر یا صحیح تر الفاظ میں مصری قبطیوں کو بوزنطی غلامی سے نجات مل گئی ۔ اہل اسکندریہ نے مقابلہ کیا ، لیکن اٹھارہ ماہ بعد ہتیار ڈال دیے ۔ اگر مصر کی فتح کا بحثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے تو یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ یہ فتح نہ صرف ایک پرجوش پیش قدمی کا نتیجہ تھی، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں لائی گئی تھی ۔ (اس اعتبار سے) اس زمانے کے اوراق بردی خاص طور پر اہمیت حاصل کر لیتے ہیں ۔ (ان میں) عرب افواج کی رسد رسانی اور قیام کے انتظام کے متعلق سرکاری احکام ملتے ہیں اور یہ پتا چلتا ہے کہ اس ضمن میں اہل دیہات

جو کچھ خرچ کرتے تھے، وہ سال آئندہ کے محاصل میں مجرا کر دیا جاتا تھا - اوراق بردی شاہد ہیں کہ مصر میں پیش قدمی کرنے والی فوج ساز و سامان سے اچھی طرح مسلح ہوتی تھی - پیادہ اور سوار مسلح فوج کے ہمراہ بالائی مصر میں فوجی کارروائی کے لیے کشتیوں کا بیڑا بھی تھا - ہتیاروں کی مرمت کے لیے لہاروں اور اسلحہ سازوں کی جماعتیں بھی تیار کی گئی تھیں - یہ معلومات یونانی متون پر مشتمل ہیں جن کے ساتھ عربی ترجمہ بھی ہے - اگر یہ انتظامات قبطی اہل‌کاروں نے کیے تھے، تو یہ امر بدیہی ہے کہ عربوں کے فوجی سربراہ بھی ان کے انتظام و انصرام سے بخوبی آگاہ ہوں گے - اس سے فوجی تربیت اور نظم و نسق کا بھی پتا چلتا ہے اور ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ عربوں کی فوج کا بیشتر حصہ بدوی عربوں پر مشتمل نہ تھا- حضرت عمرو بن العاصؓ (فاتح مصر) کا زیادہ تر اعتماد یمنی دستے پر تھا، جو تقریباً سب کے سب عَک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور اضلاع فسطاط کے نام اس امر کے مظہر ہیں کہ فوج کی بیشتر تعداد یمنی لشکر پر مشتمل تھی - دوسری طرف بنو جذام اور بنو لخم، جو غسانی مملکت میں آباد تھے اور جنگ یرموک میں غیر جانبدار رہے تھے، اب مصری لشکر میں شامل ہو گئے تھے - عرب مجاہدین کی زیادہ سے زیادہ تعداد پندرہ ہزار تھی - یہ تعداد اگرچہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے، لیکن ناممکن الیقین بھی نہیں .

(مصر کی) فتح کے بعد عرب اپنے قبائلی گروہوں ہی میں رہے - اس بارے میں فسطاط کے اضلاع کے نام معلومات افزا ہیں-اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شروع میں عربوں کا فوجی خدمت کے سوا اور بھی کوئی شغل تھا - کیونکہ فوج ہی با اقتدار تھی- اس میں کسی ملکی باشندے کا بمشکل ہی گزر ہو سکتا تھا - فوجی مقامی باشندوں سے مل جل بھی نہ سکتے تھے، کیونکہ اراضی کا حصول ممنوع تھا - قابض فوج فسطاط، اسکندریہ اور بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ مختلف چوکیوں، دریاے نیل کے صحرائی کناروں اور جنوبی سوڈان کی سرحدات میں بٹی ہوئی تھی - مستند مآخذ کے دستیاب نہ ہونے کے سبب ہم ان فوجوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جنھیں نئے فوجیوں کی کمک ملتی رہتی تھی، کیونکہ ۴۳ھ/۶۶۳ء میں صرف اسکندریہ کے دفاع کے لیے بارہ ہزار جوانوں کی ضرورت تھی - اتحاد و اشتراک پیدا کرنے کی غرض سے ان کی تنظیم قبائل کی بنا پر ہوئی تھی - ہر قبیلے کے افراد سات یا دس حصوں میں منقسم تھے - ہر حصے کا ایک منتظم ہوتا تھا جو فوجیوں کی تنخواہیں وصول کرتا تھا اور قاضی کی نگرانی میں یتیموں کو وظائف ادا کرتا تھا - ہر صبح ایک اہل‌کار ان قبائل میں جا کر نئے پیدا ہونے والے بچوں کے کوائف لکھا کرتا تھا .

۱۰۹ھ/۷۲۷ء میں مصر کے مہتمم مالیات نے بنو قیس کی ایک بڑی جماعت کو بلبیس کے علاقے میں آباد کر دیا تھا - یہ جماعت تین ہزار افراد پر مشتمل تھی جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے - قیسیوں کی یہ جماعت، جو فسطاط - قلزم کی شاہراہ پر شترہانی کرتی تھی غالباً فوجی خدمات بھی بجالاتی تھی، کیونکہ ان کے نام قبض الوصولوں میں درج تھے- ان کی بھرتی کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب ۱۰۷ھ/ ۷۲۵ء میں قبطیوں نے پہلی شورش کی - یہ واقعہ بیان کرتے ہوے اسکندریہ کے کلیسا کا

عیسائی مؤرخ رقمطراز ہے: ''ایک قبیلہ مصر کے مشرقی صحرا میں بلبیس اور قلزم کے درمیان ساحل سمندر پر آباد ہے؛ یہ مسلمان تھے اور عرب کہلاتے تھے۔'' یہ طرز بیان اس امر کا غماز ہے کہ مقامی مسلمان، جو اگرچہ بحیثیت مجموعی اقلیت میں تھے، لیکن تعداد میں عربوں سے کہیں زیادہ تھے۔

ان قبائل نے دو سو برس تک اپنے حسب و نسب کو یاد رکھا۔ آسوان اور فسطاط کے قبرستانوں میں ان کے الواح مزار پر ناموں کے ساتھ قبیلے کا نام بھی لکھا ملتا ہے۔ یہ عربی نشان تمغاے شرافت تھا، جس سے قبطی مسلمان محروم تھے۔ بعض قبطیوں کو عرب قبائل سے منسوب ہونے کا شوق چرایا تو انھوں نے ایک مشکوک کردار کے حامل قاضی کے خلاف جس نے قبطیوں کو خالص عربوں کا درجہ دے دیا تھا، خلیفۂ بغداد سے استمداد کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں قبائلی نسبت کی جگہ جغرافیائی نسبت نے اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اس بارے میں الواح مزار ہی بہترین دستاویزات ہیں جن سے متوفی کی جاے سکونت کا پتا چلتا ہے۔

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلمانان فسطاط ہی تمام کاروبار اور سرکاری ملازمتوں پر چھائے ہوے تھے۔ دوسری صدی میں جن عربوں نے دریاے نیل کی گزرگاہ کے کنارے مقامی بغاوتوں کے دبانے میں حصہ لیا تھا ان کے نام خراسانیوں اور بعد میں ترکوں کی آمد کے بعد، فوجی دفتر سے خارج کر دیے گئے۔ ان عربوں نے دیہات میں جا کر اپنے آبا و اجداد کی طرح مویشی پالنے کا پیشہ اختیار کر لیا۔ بہرحال اس کے بعد ان کا شہروں میں ذکر نہیں آتا۔ یہ عرب سابقہ فوجیوں کی اولاد تھے اور انھوں نے اراضی بھی حاصل کر لی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سرکار ان سے خراج یا مالیہ وصول کیا کرتی تھی۔ اس طرح وہ مقامی آبادی میں گھل مل گئے، جو تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں زیادہ تر مسلمان تھی۔ اس کے علاوہ قبطیوں نے عربی زبان کا روز افزوں استعمال شروع کر دیا۔ فوج کی اکثریت، جو ترکوں پر مشتمل تھی، مقامی باشندوں اور عرب مہاجرین میں وجہ امتیاز نہ پا سکی۔

آخرکار ۲۱۹ھ/۸۳۴ء میں بنولَخم اور بنوجُذام نے دریاے نیل کے آس پاس بغاوت کر دی۔ انھیں بآسانی منتشر کر دیا گیا اور ان کے حقوق کا ذکر دوبارہ سننے میں نہیں آتا۔ عربوں کا ذکر تاریخ مصر میں بار بار آتا ہے۔ ان کی قبائلی تنظیم برقرار رہی اور انھوں نے بدوی خوبو بھی نہیں چھوڑی۔ ہنگامی حالات میں ان سے محفوظ فوج کی حیثیت سے خدمت لی جاتی تھی، جیسا کہ دمیاط میں صلیبیوں کے داخل ہونے پر ہوا تھا۔ بعد کی حکومتوں کو محاصل کی وصولی یا قزاقوں کو دبانے کے لیے ان کے خلاف فوجی اقدام بھی کرنا پڑتا تھا۔ عام طور پر یہ مہمیں اگرچہ تعزیری ہوتی تھیں، لیکن خون خرابے کا بھی باعث بن جاتی تھیں۔

پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں بنو ہلال کی شمالی افریقیہ پر تباہ کن یلغار سے قبل ان کی نقل مکانی سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوے۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ۱۷۹۹ء میں جزیرہ‌نماے عرب کے بدویوں نے بالائی مصر میں فرانسیسی افواج کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی تھی۔

زمانۂ حال کی مردم شماری کے نتائج

حد درجہ غیر واضح ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مصری صحراؤں میں بدویوں کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔

مآخذ: (۱) ابن عبدالحکم: فتوح مصر؛ طبع Torrey؛ (۲) الکندی: ولاۃ مصر، طبع Guest؛ (۳) المقریزی: الخطط طبع بولاق؛ (۴) القلقشندی: نہایۃ العرب فی معرفۃ انساب العرب؛ (۵) وہی مصنف: قلائد الجمان فی التعریف بقبائل عرب الزمان؛ (۶) Quatremère: *Mémoire sur les tribus arabes établies en Egypte*، در *Mémories géographiques et historiques sur l' Egypte*، طبع و ترجمہ G. Wiet؛ (۷) G. Wiet: *Précis d' Histoire d' Egypte*، جلد دوم؛ (۸) وہی مصنف: *Histoire de la Nation égyptienne*، ج ۴؛ (۹) ابن ایاس: تاریخ مصر.

(G. WIET.)

(۵) عرب شمالی افریقیہ میں: ان عربوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے جو ۲۷ھ/۶۴۷ء میں شمالی افریقیہ میں داخل ہوئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سب سے اول بیس ہزار مجاہدین آئے تھے، جو حجازی قبائل سے بھرتی کیے گئے تھے۔ ان کے سپہ سالار متعلقہ قبائلی سردار تھے جنھیں مصری فوج کی بھی کمک حاصل تھی۔ ابتدائی مہمات دور دراز قسم کے دھاوے تھے، جن کی غرض مستقل قیام کی نہ تھی۔ عقبہ بن نافعؓ نے المغرب میں اپنی محیر العقول پیش قدمی جاری رکھی اور ۵۰ھ میں القیروان [رک بآں] کا شہر بسایا۔ ان کی شہادت کے بعد بربروں نے القیروان پر قبضہ کر لیا اور اسلامی فوج کو کمک بھیجنی پڑی۔ عساکر اسلامیہ کی نئی پیش قدمی یا بربروں کی بغاوت کے سبب تازہ دم مجاہدین کے دستے آتے رہتے تھے۔ اموی عہد میں یہ مجاہدین شامی چھاؤنیوں سے آئے تھے جن میں مختلف قبائل کے افراد شامل تھے۔ یہ قبائلی ان مجاہدین کی جگہ لینے لگے جو عرب میں بھرتی ہوا کرتے تھے۔ عباسی عہد میں خراسانی سپاہ بھی شامیوں کے دوش بدوش مصروف کار زار رہنے لگی یا ان کی جگہ لینے لگی۔ یہ فوجی عناصر، جو مشرق کی طرح مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، مفتوحہ ملک کے شہروں میں بھیج دیے گئے۔ یہ واضح ہے کہ ان کی خودسری، روز افزوں مطالبات اور نظم و ضبط کا فقدان افریقیہ کے والیوں کے لیے درد سر بنے رہے۔ اغلبی امیروں نے بڑی خونریزی کے بعد ان کو زیر کیا اور صقلیہ میں ان کی ملازمت کا انتظام کرا دیا۔

عرب مجاہدین جنھیں ملک پر قبضہ کرنا مقصود ہوتا تھا، اپنے ساتھ دیوانی حکام بھی لاتے تھے۔ والیوں، ان کے حاشیہ نشینوں اور ان کے قرابت داروں کے علاوہ علما بھی ہوتے تھے، جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانۂ خلافت (۹۹ھ/۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/۷۲۰ء) سے بربروں میں تبلیغ اسلام کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں تاجر بھی ہوتے تھے جو مفتوحہ ملک کے گراں قدر وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

عرب مہاجرین زیادہ تر شہروں میں سکونت رکھتے تھے۔ جن شہروں میں ان کی اکثریت تھی، وہ عربی تہذیب و تمدن کے مرکز بن گئے۔ عرب فاتحین کے وقار و اقبال، مساجد و قرآنی مکاتیب میں تعلیم، معاشی تعلقات اور منڈیوں میں باہمی میل جول کی بدولت شہروں اور مضافات میں اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی بھی خوب اشاعت ہوئی۔ اس عمل میں القیروان نے اہم کردار انجام دیا، اگرچہ افریقیہ میں عرب فوج اور اس کی المغرب کی طرف پیش قدمی نے محدود علاقے کو متاثر کیا۔

بنو ہلال [رک بہ ہلال] کا افریقیہ پر حملہ عربوں کی نقل مکانی کا پہلا مرحلہ تھا ۔ یہ نقل مکانی نووارد ہونے کے باعث اور بربرستان میں ان کے تاریخ ساز کردار کی بدولت، اسلامی فتح اور اس کے نتائج سے یکسر مختلف ہے ۔ اس حادثے کا ابتدائی سبب یہ تھا کہ پانچویں صدی عیسوی میں بنو صنہاجہ کی بنو زیری [رک بہ زیری] شاخ کا امیر المعز، جو فاطمی خلیفہ المنصور کی طرف سے افریقیہ کا والی تھا، خلافت قاہرہ سے منحرف ہوگیا۔ فاطمی خلیفہ نے اپنے وزیر الیازوری کے مشورے پر عرب کے بدویوں کو، جو ساحل نیل پر خیمہ زن تھے، باغی والی کی سرزنش کے لیے روانہ کیا ۔ (اس کے صلے میں) خلیفہ نے ان کا یہ حق پہلے ہی تسلیم کر لیا کہ وہ مفتوحہ شہروں اور قصبوں کے مالک ہوں گے ۔

بنو ہلال جو ''المغرب کی طرف تحریک'' (تغریب) کا ہراول دستہ تھے اور بنو سلیم، جو بعد میں آئے، دونوں اپنے مشترک جد امجد منصور بن قیس کے واسطے سے بنو مضر سے اپنا نسب ملاتے تھے ۔ یہ دونوں قبیلے نجد کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان وہیں بود و باش رکھتے تھے ۔ انھوں نے دیر سے اسلام قبول کیا تھا اور نقل مکانی کرکے شمالی عراق اور بادیۃ الشام میں آ رہے تھے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات کے بعد ہی ان کی خودسری ظاہر ہونے لگی تھی ۔ یہ حاجیوں کے قافلوں کو لوٹ لیتے تھے، اس لیے اموی اور عباسی حکمران ان کی گوشمالی کیا کرتے تھے ۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں انھوں نے قرامطہ کی بغاوت میں حصہ لیا ۔ فاطمی خلیفہ العزیز نے اس تحریک کو سختی سے دبا دیا (۳۶۸ھ/۹۷۸ء) اور اس کے حمایتی عربوں کو بالائی مصر جانے پر مجبور کر دیا ۔ ان کی فتح افریقیہ کا یہی نقطۂ آغاز ہے ۔

جب بنو ہلال کے ہراول دستے، جو بمشکل دس لاکھ سپاہیوں پر مشتمل ہوں گے، القیروان میں داخل ہو کر زیری مملکت کے زوال کا باعث بنے ۔ بنو ہلال میں زیادہ طاقتور بنو رباح تھے جو تونس کے میدانوں پر قابض ہو گئے ۔ ان کے آگے جانب مشرق بنو حماد اور زاب [رک باں] کی مملکت تھی جہاں بنو اثبج چلے آئے ۔ عربوں کا یہ پھیلاؤ جس کی حدود الادریسی نے چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں واضح کی ہیں ، بنو حماد کے قلعے سے بجایہ کی طرف نقل مکانی کرنے کا سبب بنی ۔ بنو زناتہ کے خانہ بدوش قبائل بھی وہران کے میدانوں کی طرف چلے آئے ۔

نئے گروہوں کی آمد سے عربوں کے علاقے میں مزید توسیع ہوئی اور ان کی تقسیم میں ردّ و بدل کرنا پڑا ۔ نقل مکانی کرنے والوں میں سب سے بڑا ریلا طرابلس الغرب کے بنو سلیم کا تھا، جس کا آغاز بارھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ شروع میں بنو سلیم نے ایک ارمنی مہم جو قرقوش سے رشتۂ اتحاد استوار کیا؛ پھر بنو غانیہ کے حلیف بن گئے جو المرابطون کو دوبارہ برسر اقتدار لانا چاہتے تھے۔ المرابطون کے افریقی والی بنو حفص تھے جن سے وابستہ ہو کر بنو سلیم بام عروج پر پہنچے ۔ اس طرح افریقیہ، جو بنو ہلال کی اوّلین مملکت تھی، بنو سلیم کے قبضۂ اقتدار میں رہی ۔ اس علاقے میں عربوں کی اکثریت تھی اور وہی سب سے زیادہ طاقتور تھے، لیکن شمالی افریقیہ کا کوئی گوشہ بھی اس آفت سے نہ بچ سکا، جو بقول ابن خلدون ناقابل تلافی تھی ۔ نو وارد غیرمملوکہ

اراضی کی تلاش میں تھے، شہری آبادی پیداواری وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی، طاقتور کمزوروں کو آگے دھکیل رہے تھے، بعض قبائل، مثلاً جنوبی مراکش کے بنو معقل صحرا کی مغربی حدود سے چلے آرہے تھے۔ یہ غیر معمولی اسباب ''حرکت تغریب'' کا موجب تھے۔ اس کے علاوہ المغرب کے بعض فرمانرواؤں نے عرب افواج کے دستوں کو، جن کی تائید پر ان کی حکمرانی کا انحصار تھا، اقصاے مغرب کی طرف منتقل کر دیا۔ اس سے بھی افریقیہ کی مغربی جانب نقل مکانی میں اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں الموحدین کے المنصور نے، انھیں مراکش کے اطلسی میدانوں میں آباد کر دیا، جو اب تک غیر آباد چلے آرہے تھے۔

اس توسیع سے بربروں کے علاقے کی معیشت تہ و بالا ہوگئی۔ شمال مغربی افریقیہ کے علاوہ جہاں یہ عرب موسم گرما گزارتے تھے، صحرائی علاقوں تک بھی ان کے بدویوں کی تگ و تاز محیط تھی۔ وہاں خانہ بدوش موسم خزاں میں اپنے اہل و عیال سمیت چلے آتے تھے؛ یہ علاقے ان کے اونٹوں کے لیے چراگاہوں کا بھی کام دیتے تھے۔ ان دہری نقل مکانیوں کے خاتمے پر انھیں یافت بھی ہو جاتی تھی۔ پروانۂ حفاظت کی رو سے یہ عرب، اہلِ نخلستان اور کھجور کے کاشتکاروں سے جنس کی شکل میں محصول ٹیکس اور شہریوں سے اقطاع یا جزوی ٹیکس (جبایہ) بھی لیتے تھے، جس کی تحصیل کے لیے انھیں ذمے دار ٹھیرایا گیا تھا۔ یہ مشرقی بدوی بربروں کے روزمرہ کے معاملات میں دل و جان سے شریک تھے، اس لیے انھوں نے عربی زبان کی ترقی و اشاعت میں اہم حصہ لیا۔ بنو ہلال، بنو سُلَیم اور بنو معقل ایسے بڑے قبائل کی علمی مساعی کے فرق کا اندازہ آج بھی ان قبائل کی بولیوں کی خصوصیات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جہاں بربروں نے عربی زبان اور عربی تمدّن کو اختیار کیا، وہاں عربوں نے بھی بربروں کے طور طریقے اپنائے۔ خانہ بدوشی کے بجاے ایک جگہ مستقل قیام ہونے لگا اور مہاجرین، جو فاقہ مستی کی زندگی گزار رہے تھے، خوشحالی اور مرفّہ الحالی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون: العبر، طبع دیسلان، ۲ جلدیں، پیرس ۱۸۴۷ — ۱۸۵۱ء، مترجمۂ دیسلان (*Histoire des Berbères*)، ۴ جلدیں، الجزائر ۱۸۵۲ — ۱۸۵۶ء؛ (۲) ابن الأثیر، مترجمۂ Fagnan؛ (۳) الیعقوبی: کتاب البلدان، مترجمۂ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ (۴) التیجانی: الرحلة، مترجمۂ Rousseau، *JA* (۱۸۵۲ء)، ج ۲: ۱۸۵۳ء، ج ۱؛ (۵) الادریسی: المغرب؛ (۶) Fournel: *Les Berbers*، ۲ جلدیں، پیرس ۱۸۵۷—۱۸۷۵ء؛ (۷) Carette: *Recherches sur les origines et les migrations des tribus de l'Afrique septentrionale* (*Exploration Scientifique de l' Algérie*)، پیرس ۱۸۵۳ء؛ (۸) Carette و Warnier: *Notice sur la division territoriale de l' Algérie Tableau des Établissements Français*، ۱۸۴۴ — ۱۸۴۵ و ۱۸۴۶ء کا نقشہ؛ (۹) *Nomenclature et répartition des tribus de la Tunisie*، Chalon-sur-Saône، ۱۹۰۰ء؛ (۱۰) A. Bernad و N. Lacroix: *L' évolution du nomadisme*، الجزائر-پیرس ۱۹۰۶ء؛ (۱۱) E. Mercier: *Comment l' Afrique Septentrionale a été arabisée*، قسطنطینیہ ۱۸۷۴ء؛ (۱۲) G. Marçais: *Les Arabes en Berbèrie du XI° au XIV° siècle*، قسطنطینیہ - پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۱۳) وہی مصنف: *La Berbèrie musulamane et l'Orient au moyen âge*، پیرس ۱۹۴۶ء؛ (۱۴) W. Marçaise: *Comment*

l'Afrique du Nord a été arabisée، در *AIEO*، ۱۹۳۸ء.

(G. Marçais)

* **عَرْبان** : عراق عرب کا ایک مقام جہاں اب صرف کھنڈر باقی ہیں، دریاے خابور کے مغربی کنارے پر جبل عبدالعزیز کے جنوب میں ۳۶ درجے ۱۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۰ درجے ۵۰ دقیقے طول بلد مشرقی (گرین وچ) پر واقع ہے۔ پرانے شہر کے آثار متعدد ٹیلوں کے نیچے دبے ہوے ہیں، جن میں سے ایک ٹیلے کے نام پر اس جگہ کو ''تلّ عَجابه'' بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے H. A. Layard کو متعدد پردار بیلوں کے مجسمے ملے تھے، جن کے سر آدمیوں کے سے تھے۔ یہ مجسمے عراق عرب کی اپنی حقیقی تہذیب کی پیداوار ہیں جو بابل کے قدیم تمدّن سے قریبی رابطہ رکھتی تھی۔ عَرْبان غالباً وہی مقام ہے جو خط میخی (cuneiform) کے کتبوں میں گَرْ (شَهْ) ۔ دِکَنّه کے نام سے مذکور ہوا ہے۔ رومی اقتدار کے متأخر دور میں یہ مقام جو اَرْبَنه کہلاتا تھا، پارتھی [اشکانی] سلطنت کے سرحدی خط پر واقع ہونے کی بنا پر جنگی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ عربوں کے دور اقتدار میں عربان ولایت خَابُور کا مرکز ہونے کے لحاظ سے، نیز وادی خابُور میں پیدا ہونے والی روئی کی منڈی ہونے کے سبب، بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ جغرافیہ نویس (مثلاً یاقوت، بذیل مادّۂ عربان) اور مؤرّخ اس کا ذکر بار بار ایک با رونق شہر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اس کی تباہی کا زمانہ معلوم نہیں۔ غالباً یہ اس وقت تباہ ہوا، جب مغول نے تیمور کی سرکردگی میں یہاں حملہ کیا۔

مآخذ : (۱) K. Ritter: *Erdkunde*، ۱۱: ۲۷۱؛ (۲) H. A. Layard: *Niniveh und Babylon*، جرمن (ترجمہ از Zenker)، ص ۲۰۸ ببعد؛ (۳) M. von Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum persischen Golf*، (برلن ۱۹۰۰ء)، ۲: ۱۹ تا ۲۱؛ (۴) وہی مصنف، در *ZG Erdkunde*، ۳۶ (۱۹۰۱ء): ۶۹ ببعد؛ (۵) Streck، در *Zeitschr. f. Assyriologie*، ۱۸: ۱۹۰؛ (۶) Le Strange، ص ۹۷۔

(M. Streck)

* **عُربان** : رک به العرب۔

* **عربستان** : ''ملک عرب'' ۔ ایک اصطلاح جو پہلوی دور تک خوزستان کے ایرانی صوبے کے لیے مستعمل رہی ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے عہد میں اس صوبے کا نام خوزستان رکھا گیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے خوزستان۔ ایرانی استعمال کی پیروی میں ''عربستان'' کبھی کبھی جزیرہ نماے عرب پر بھی دلالت کرتا ہے۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے حکومت عثمانیہ کی انتظامی دستاویزات میں عربستان کا اطلاق مملکت کے عربی بولنے والے صوبوں، بالخصوص شام پر ہونے لگا تھا۔

(مدیر، آ، لائیڈن، بار اول)

* **عرب فقیه** : شہاب الدین احمد عبدالقادر، مسلم حبشہ کا سولھویں صدی عیسوی کا وقائع نگار۔ اس نے امام احمد بن ابراہیم امیر ہرر اور Negus Lebna Denghel کے مابین جنگ میں خود حصہ لیا، لیکن جب اس نے وقائع لکھے تو وہ حبشہ چھوڑ کر عرب کے شہر جِزان میں جا چکا تھا۔ اس کے لقب ''عرب فقیه'' کی توجیہ یا تو یوں ہو سکتی ہے کہ وہ کسی حبشی کا عرف تھا، جو عربی زبان اور فقہ میں کامل دسترس رکھتا تھا، یا اس طرح کہ وہ کسی عرب کا مقامی لقب تھا، جو نقل مکانی کر کے پہلے حبشہ چلا گیا تھا، اور پھر بعد میں اپنے وطن واپس آ گیا۔ اس

کے وقائع کا نام (خاتمۂ کتاب پر) ''تحفۃالزمان'' مرقوم ہے ، لیکن مخطوطے میں اس کا عنوان ''فتوح الحبشہ'' لکھا ہے ۔ وقائع کا اختتام سنہ ۱۵۳۷ء کے واقعات کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن خاتمۂ کتاب کی عبارت میں اسے ''پہلا حصہ'' ظاہر کیا گیا ہے ۔ اس کا دوسرا حصہ کبھی دستیاب نہیں ہوا ۔ اغلب یہ ہے کہ مؤلف اپنے منصوبے کے مطابق اپنی اس تالیف کو مکمل نہ کر سکا ۔ فتوح الحبشہ کے ہمارے پاس صرف چند مخطوطے ہیں، جو تمام کے تمام زمانۂ حال کے ہیں اور اس کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے ۔ اس کا خلاصہ گجرات کی تاریخ ظفرالوالہ بمظفر وآلہ میں دیا گیا ہے ۔ یہ الغ خاں کی عربی تالیف ہے، جو عرب مصنف بھی ہے ۔ وہ سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے دوران میں نقل مکانی کر کے ہندوستان آ گیا تھا ۔

مآخذ : (۱) René Basset : *Histoire de la Conquête de l' Abyssine* (عربی متن اور فرانسیسی ترجمہ)، دو جلدیں، پیرس ۱۸۹۷ء؛ (۲) E. Denison Ross : *An Arabic History of Gujarat* (ظفر الوالہ ؛ ظفر وآلہ) دو جلدیں لنڈن، ۱۹۱۰ - ۱۹۲۸ء ۔

(E. CERULLI)

⊗ **عرب گیر** : (آرپ گیر، ارب گیر)؛ ولایت ملطیہ کے ایک ضلع کا صدر مقام، سمندر کی سطح سے ۱۲۰۰ میٹر بلند، دریاے فرات سے ۲۲ کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک وسیع وادی میں واقع ہے، جو ''عرب گیر'' ندی نے ایک سطح مرتفع کے کھلے میدان میں بنا دی ہے ۔ یہ ندی دریاے فرات کے دائیں کنارے کے معاونوں میں سے ہے ۔ اس شہر کے نام کا تعلق ازمنۂ وسطیٰ کی عرب فتوحات سے ہے اور ارمنیوں کے ہاں یہ ''آرپ گیر'' کہلاتا تھا ، اور بوزنطی دستاویزات میں اسے Arabrakes لکھا ہے ۔ چونکہ اس کی زمین نہایت زرخیز ہے، اس لیے یہ سکونت کے لیے ہمیشہ موزوں رہا ہے، لیکن اس امر کے متعلق معلومات بہت کم یا تقریباً نایاب ہیں کہ ازمنۂ قدیمہ میں اس میں آبادی کی کیا حالت تھی ۔ قدیم ملطیہ (Melitene) سے جو سڑک زِمارا کو جاتی ہے، اس پر ہِسّپا کے نام سے ایک مقام تھا ۔ بطلمیوس (۵ : ۶، ۲۰) کے بیان کے مطابق اس کا مترادف اِسپا تھا جو غالباً وہیں تھا، جہاں آج کل ارپ گیر واقع ہے ۔ Dascusa بھی جس کا ذکر Antonious کے سیاحت نامے میں آیا ہے، اسی نواح میں آباد تھا، لیکن غالباً دریاے فرات سے قریب تر تھا ۔ ''عرب گیر'' کا نام قدیم عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں نہیں ملتا، لیکن ابن بی بی کے سلجوقی وقائع نامہ میں جو ۸۸۰ھ/۱۲۸۱ء کے لگ بھگ کی تصنیف ہے (طبع Houtsma، لائیڈن، ۱۹۰۲ء)، اس کا ذکر کئی دفعہ آیا ہے ۔ یہ شہر ازمنۂ وسطیٰ میں مسلسل ارمنی، ایرانی اور بوزنطی حکمرانوں کے قبضے میں آتا رہا، لیکن آخر عربوں نے اسے فتح کر لیا ۔ پھر گیارھویں صدی کے اختتام پر سلجوق اس پر قابض ہوگئے اور پندرھویں صدی کے آغاز میں جب تیمور کی یورش ختم ہوئی تو اس شہر کو قلمرو عثمانی میں شامل کر لیا گیا ۔ سلیمان قانونی کی تنظیمات کے ماتحت عرب گیر ولایت سیواس کی ایک سنجاق کا صدر مقام تھا ۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں جب مَزْرعہ ایک ولایت کا صدر مقام بنا تو یہ اس کے ماتحت ایک ناحیہ تھا ۔ ۱۲۹۲ھ میں جب معمورۃ العزیز کو دیار بکر سے الگ کر کے ایک مستقل ولایت بنایا گیا تو عرب گیر کو اس میں شامل کر دیا گیا اور دوبارہ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں یہی صورت پیش آئی ۔ بالآخر جدید

تقسیمات کے ماتحت اسے ملطیہ سے منسلک کیا گیا، لیکن زمانۂ حال کا عرب گیر پرانے شہر کے محل وقوع پر واقع نہیں - انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ملطیہ کی طرح اس شہر کے باشندے ان تاکستانوں میں جا بسے جو یہاں سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھے- نتیجہ یہ ہوا کہ پرانا عرب گیر بالکل غیر آباد ہوگیا اور اس کی جگہ جلد ہی ایک نیا شہر وجود میں آ گیا - C. Texier کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا - اس کا بیان ہے کہ عرب گیر کی آبادی میں تقریباً نصف ترک اور نصف ارمنی تھے - یہاں کے لوگ سوتی پارچہ بافی (جو دیہات میں بھی عام تھی)، رنگریزی اور کاروانوں کے کاروبار کے ذریعے سے معاش حاصل کرتے تھے - اس وقت سے لے کر شہر اور دیہات کے بہت سے باشندے روزی کمانے کے لیے استانبول اور دوسرے ترکی شہروں میں چلے گئے - اس زمانے کے بعد، خصوصاً صنعت پارچہ بافی کے زوال کی وجہ سے بے روزگاری میں بہت اضافہ ہوگیا؛ بڑے شہروں میں ملازمت کرنا یا سرکاری دفتروں میں صفائی کا کام انجام دینا، کھیتوں میں کام کرنے کی بہ نسبت زیادہ پُرکشش سمجھا جانے لگا، اس لیے نقل مکانی کا سلسلہ اور بڑھتا گیا. آناطولی کے دوسرے اضلاع کے باشندوں کی طرح عرب گیر کے لوگ بھی طالع آزمائی کی غرض سے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں بلکہ امریکہ تک پہنچ گئے تھے؛ تاہم متعدد افراد (مثلاً ترکی کی دنیاے ثقافت کا مشہور فرد یوسف کامل پاشا) اسی علاقے میں پیدا ہوے - اس شہر کی آبادی اور اس کے اجزاے ترکیبی کے متعلق جو مختلف معلومات حاصل ہوئی ہیں، انھیں باہم تطبیق دینا ناممکن معلوم ہوتا ہے، مثلاً ۱۸۲۹ء میں Ainsworthy نے بتایا کہ اس شہر کے آٹھ ہزار نفوس میں سے چھے ہزار ارمنی تھے، لیکن اس سے چند سال قبل انگریز قونصل J. Brant نے اعلان کیا تھا کہ عرب گیر میں چھے ہزار مکانات ہیں جن میں ۴۸۰۰ مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور صرف ۱۲۰۰ ارمنیوں کے ہیں - اگر یہ صحیح ہے تو اول الذّکر شمار اور تناسب درست نہیں - ۱۸۶۸ء میں Taylor نے لکھا تھا کہ عرب گیر کی آبادی پینتیس ہزار ہے، لیکن ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ V. Cuinet نے بیان کیا کہ کل نفوس بیس ہزار ہیں جن میں سے گیارہ ہزار مسلمان اور ۸۵۰۰ گریگورین ارمنی ہیں.

اُنیسویں صدی کے آخر میں سوتی پارچہ بافی (خصوصاً اس کی وہ قسم جسے ''مَنُوسہ'' کہتے ہیں) برابر جاری تھی - عرب گیر کافی پانی کی بہمرسانی اور سازگار لیکن سخت موسم کی وجہ سے پھلوں کے گنجان باغوں سے پٹا پڑا تھا - ان باغوں کے درمیان مختلف محلّوں میں مسطّح چھت کے مکانات ایک پہاڑی کے اوپر تک پھیلے ہوے تھے - اس کی تجارتی سرگرمی، سوتی کپڑے، پھل، اناج اور شراب کی برآمد پر مشتمل تھی، لیکن ۱۹۱۴ - ۱۹۱۸ء کی جنگ کے زمانے میں اس شہر کو بعض شدید صدمات سے دو چار ہونا پڑا، جن سے اس کی صنعتی سرگرمیاں بالکل مسدُود ہوگئیں - اس کے مشہور باغ اور تاکستان برباد اور اکثر مکان ویران ہوگئے - عرب گیر کبھی اپنی زرعی پیداوار کی وجہ سے نہایت خوشحال تھا - انھیں زراعتی امکانات کی بنا پر اب اس شہر میں پھر ترقی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں - ۱۹۳۵ء کی مردم شماری میں اس کی آبادی ۶۸۱۰ تھی - شہر کا اور ضلع کے ۸۲ دیہات کا رقبہ ۱۵۹۵ مربع

کیلومیٹر ہے اور مجموعی آبادی تیس ہزار تک پہنچ گئی ہے ۔ اس شہر کو ۸۶ کیلومیٹر کی ایک پختہ سڑک کے ذریعے [معمورۃ] العزیز سے ملا دیا گیا ہے ۔ ولایت ملطیہ کا صدر مقام اس سے ذرا آگے ہے ۔ چونکہ ''سیواس ارز روم'' اور سیواس ملطیہ کی ریلیں جو حال ہی میں بنی ہیں اس ضلع کے قریب سے گزرتی ہیں، اس لیے اس کے تجارتی ترقی کے امکانات میں اضافہ ہوگیا ہے ۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ عرب گیر اپنی قدیم خوشحالی کو دوبارہ حاصل کر لے گا ۔

مآخذ : (۱) کاتب چلبی: جہان نما، طبع ابراہیم ص ۶۲۴؛ (۲) اولیا چلبی : سیاحت نامہ (طبع احمد جودت)، ۲ : ۲۱۵ ببعد ؛ (۳) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۹؛ (۴) Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۷۹۳ تا ۷۹۹؛ (۵) E. Reclus : *Nouvelle Géographie Universelle*، ۹ : ۳۷۱؛ (۶) J. Brant : *Journ. of the Royal Géogr. Society* (۱۸۳۶ء)، ۶ : ۲۰۲ ببعد ؛ (۷) Von Moltke : *Briefe über Zustände und Begebenheiten in der Türkei in den Jahren 1835—39*، برلن ۱۸۴۱ء، ص ۳۵۷؛ (۸) W. Ainsworth : *Travels and Researches in Asia Minor, Mesopotamia, Chaldea and Armenia*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۲ : ۵؛ (۹) Taylor : *Journ. Royal Geogr. Society*، ایک رپورٹ، لنڈن ۱۸۶۸ء؛ (۱۰) Ch. Texier : *Asia Mineure*، ص ۵۸۹ ببعد؛ (۱۱) V. Cuinet : *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۱ء، ۲ : ۳۵۸ تا ۳۶۱ ؛ (۱۲) معمورۃ العزیز ولایتی سالنامہ سی، ۱۳۱۰ء ۔

(بسیم درکوت)

* **عربہ** : (وادی عربہ) شرق اردن کے جنوبی رخنے کا بڑھاؤ، جس میں بحیرۂ مردار کا نشیبی علاقہ بھی شامل ہے ۔ تورات میں عربہ سے مراد وادی اردن ہی ہے ۔ اس کی چوڑائی کم و بیش تین سے پانچ میل تک ہے ۔ یہ وادی بحیرۂ مردار کے جنوبی کنارے سے خلیج عقبہ کے شمالی سرے تک جو بحیرۂ قلزم کا مشرقی کنارہ ہے، ایک سو دس میل تک چلی گئی ہے ۔ وادی کی لمبان کے بیشتر حصے میں تانبے کی متعدد قدیم کانوں کی جگہیں اور سامن مچھلی کے ٹھکانے ہیں ۔ کنعانی ان کانوں سے معدنیات نکالتے تھے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بھی ان کے اندر سے دھاتیں نکالی جاتی تھیں ۔ وادی عربہ میں گھونگھے کے بھی وسیع ذخائر ہیں ۔

بنو اسرائیل کے خروج کا راستہ وادی عربہ میں سے ہو کر نکلتا تھا ۔ دھات کے عہد اول (اکیسویں صدی سے انیسویں صدی قبل از مسیح)، اور فولاد کے عہد دوم (دسویں سے چھٹی صدی قبل از مسیح)، بالخصوص نبطی، رومی اور بوزنطی زمانے سے وادی عربہ کے چشموں کی کشش کی بدولت یہاں نوآبادیاں قائم ہوچکی تھیں ۔ وادی عربہ کے جنوبی سرے پر خلیج عقبہ کے شمالی ساحل کے مرکز کے قریب تل الخلیفہ ہے — حضرت سلیمانؑ کے زمانے کا تجارتی مرکز و بندرگاہ ایلات ۔ (Ezion - geber) اور تل الخلیفہ ایک ہی مقام ہیں ۔ نبطی اور بوزنطی عہد کا ایلہ ساحل کے مشرقی کنارے پر واقع ہے اور عقبہ کا موجودہ شہر اس کے مشرق میں ہے ۔ ایلات کا موجودہ اسرائیلی شہر ساحل کے مغربی کنارے پر واقع ہے ۔

مآخذ : (۱) A Musil : *Arabia Petraea*، ج ۲؛ (۲) N. Glueck : *The Other Side of the Jordan*؛ (۳) وہی مصنف : *The River Jordan*؛ (۴) وہی مصنف : *Explorations in Eastren Palestine*، ج ۱ تا ۴ ۔

(N. GLUECK)

* **العربیّۃ** : عربی زبان اور ادب ۔

(الف) عربی زبان (العربیّۃ)؛ (i) قدیم یا

کلاسیکی دور سے پہلے (Pre-classical) کی عربی : (۱) عربی کی حیثیت سامی زبانوں میں؛ (۲) قدیم عربی (اصلی عربی = (Proto-Arabic)؛ (۳) دور اول (تیسری تا چھٹی صدی عیسوی).

(*ii*) ادبی زبان : (۱) مستند یا کلاسیکی عربی؛ (۲) ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل کی عربی؛ (۳) ازمنۂ وسطیٰ کی عربی ؛ (۴) جدید عربی؛ (*iii*) مقامی زبانیں (Vernaculars)؛ (۱) عام تبصرہ؛ (۲) مشرقی بولیاں؛ (۳) مغربی بولیاں .

(ب) ادب عربی . العربیّہ موسوم بہ لغۃ، نیز لسان العرب سے مراد ہے : (۱) عربی زبان اپنی تمام اصناف میں ـ یہ استعمال زمانۂ قبل اسلام سے چلا آتا ہے، جیسا کہ تیسری صدی کے عبرانی ماخذ میں لاشون عارابھی "lāshōn arabhi" اور سینٹ جیروم St. Jerome کی تصنیف (*Praefatio in Danielem* میں *arabica lingua*) سے ظاہر ہوتا ہے ـ یہی مفہوم غالباً لسان عربی (مُبین) کا قرآن مجید (۱۶ [النّحل] : ۱۰۳ و ۲۶ [الشّعراء]: ۱۹۵ و ۴۶ [الاحقاف]: ۱۲ میں ہے؛ (۲) اصطلاحاً مستند عربی زبان (Cl. Ar.) جو قدیم شاعری، قرآن مجید، اور اسلامی ادب کی زبان ہے؛ وسیع تر مفہوم میں اس زبان کو العربیۃ سے متمیز کر کے العربیۃ الفصیحۃ یا العربیۃ الفُصْحٰی کہا جا سکتا ہے ـ فَصِیْحَۃ یا فُصْحٰی مشتق ہیں فَصُحَ سے، بمعنی پاک و صاف ہونا؛ آشوری: پصُو = خالص، روشن؛ آرامی : پَصِّیْح = روشن، درخشاں)؛ اس سے مراد "صاف" (یعنی "عام طور پر سمجھی جانے والی") عربی ہے نہ کہ "خالص عربی"، جیسا کہ وہ اَفْصَح الْکَلَامَ" = صاف طور پر بولنا") سے ظاہر ہوتا ہے (لسانُ العرب، ۳ : ۳۷۷)؛ دیکھیے نیز اَعْرَبَ = "صاف اور قابل فہم طور پر بولنا"، اور صحیح عربی استعمال کرنا"

مستند (کلاسیکی) عربی، عربی کی اعلیٰ ادبی زبان ہے، اگرچہ یہ تنہا تحریری زبان نہیں ہے (دیکھیے عربی قدیم اور بعض جدید عوامی بولیاں، بالخصوص مالٹا کی بولی) ـ عربی کی دیگر صورتیں جن سے ہم واقف ہیں، تین نمایاں ادوار سے تعلق رکھتی ہیں: (۱) قدیم عربی جسے عربی اوّل بھی کہا جاتا ہے، شمالی عرب کی قدیم بولی ہے (اگرچہ بہتر یہ ہوگا کہ اس اصطلاح کو سب عربی بولیوں کے فرضی مشترک مورث اعلیٰ کے لیے مخصوص کر دیا جائے)؛ جرمن: *altnordarabisch*؛ (۲) دور اوّل کی بولیاں (لغات)؛ (۳) عوامی زبانیں (قرون وسطیٰ کی لغۃالعامۃ، زمانۂ جدید کی اللغۃالعامیۃ یاالدّارجۃ یا لہجات) .

(*i*) کلاسیکی عربی سے قبل کی زبان .

(*ii*) سامی زبانوں میں عربی کی حیثیت . عربی، سامی زبانوں کے خاندان سے ہے جو خود ایک وسیع تر 'حامی ـ سامی' خاندان کی ایک شاخ ہے ـ اس میں علاوہ دیگر زبانوں کے قدیم مصری بھی شامل ہے ـ زبانوں کا یہ گھرانا غربی جنوبی سامی یا جنوب مغربی سامی شاخ سے تعلق رکھتا ہے ـ اس میں دو مزید ذیلی شاخیں شامل ہیں : (الف) جنوبی عربی (مشتمل بر قدیم سبائی، معینی، قتبانی، حضرموتی، وغیرہ، جو یمن اور جنوبی حضرموت میں رائج ہیں؛ اور جدید مہری اور شحَوْری، وغیرہ جو شمالی حضرموت میں مستعمل ہیں اور جزیرۂ سقوطرہ کی زبان) ـ ایک رائج العام مفروضے کے بر عکس قدیم جنوبی عربی ایک ایسے لسانی گروہ میں سے ہے جو عربی سے بالکل مختلف ہے؛ (ب) حبشی (Ethiopic) (مشتمل بر قدیم حبشی یا جعز (Ge'ez)، جدید تگری Tigre، تگرینیا Tigrinya، امہری Amharic،

حرری Harari، گوراگہ Gurage، وغیرہ) - ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا حبشی زبان دراصل جنوبی عربی کی کس صورت سے بنی ہے (قب E. Ullendorff: *Sem. Languages of Ethiopia*، ۱۹۵۵ء) - جنوبی سامی شاخ کے مشترک خصائص (جو جدید صورتوں میں ایک حد تک اوجھل ہوگئے ہیں) حسب ذیل ہیں: قدیم سامی نظامِ صوتی کا تقریباً مکمل طور پر باقی رہنا، سوا پ کے ف میں تبدیل ہونے اور ش اور س کے باہمی ادغام کے (عربی ش سامی اوّل کا ŝ ہے)؛ اسما کی جمع اندرونی حروف علت کو بدل کر بنانا؛ فَاعَلَ اور اِسْتَفْعَلَ کے وزن پر افعال بنانا؛ تاہم جنوبی عربی اور حبشی میں اکادی سے مشترک بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عربی میں نہیں پائی جاتیں (W. Leslau، در *JAOS*، ۱۹۴۴ء، ص ۵۳ تا ۵۸)۔

دوسری طرف عربی اور شمالِ مغربی سامی (عبرانی، آرامی وغیرہ) میں بعض اقدار مشترک ہیں جو جنوبی عربی اور حبشی میں نہیں، مثلاً جمع مذکر، لاحقہ یْن/ما، فعل مجہول کی اندرونی ساخت (W. Christian، در *WZKM*، ۱۹۲۷ء، ص ۲۶۳؛ جنوبی عربی کے لیے دیکھیے M. Höfner: *Altsüdarab Gramm*، ص ۸۲) اور پُعَیل [فُعَیل] کے وزن پر اسم مصغر (F. Praetorius، در *ZDMG*، ۱۹۰۳ء، ص ۵۲۴ تا ۵۲۹)، دیکھیے I. al-Yasin: *Lexical Relation between Ugaritic and Arabic*، ۱۹۵۲ء - عربی کی بعض صورتوں کا شمال مغربی سامی سے زیادہ قریبی تعلق تھا: قدیم عربی میں عبرانی کی طرح ایک حرف تعریف (definite article) تھا جس کے ساتھ بعد میں آنے والے حرف صحیح کو مضاعف کر دیا جاتا تھا (جیسے Αμμασιχος میں) Αβισιλα (تیسری صدی قبل مسیح) اور Αβινουν (تیسری صدی عیسوی) کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اَبْ کی شکل تمام حالتوں (یعنی رفع، نصب اور جر) میں اَبی رہتی تھی، جیسا عبرانی میں ہے - قدیم بولیوں میں قبیلۂ طیئ کا اسم موصول ''ذُو'' عبرانی کا شاعرانہ ''زُو'' ہے، بحالیکہ دیگر مغربی بولیوں کے ''ذِی'' کا مساوی حرف قدیم آرامی میں ملتا ہے - مغربی بولیوں میں بھی الف ممدودہ کی آواز کنعانی اور مغربی شامی کی طرح اُو ó کی سی ہوتی تھی اور اس میں عبرانی کی طرح اِ یا آ میں بدل جاتا تھا - برخلاف اس کے مشرقی بولیوں میں ی حروف سابقہ (prefixes) کے ساتھ الف فعل ناقصہ ہوتا تھا، جیسے کہ کنعانی اور مغربی شامی میں دیکھیے C. Rabin: *Journal of Jewish Studies*، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲ تا ۶۶)۔

اس طرح عربی بحیثیت مجموعی جنوبی سامی اور شمال مغربی سامی کے بین بین ہے اور دونوں سے اس کے تعلقات ہیں - ممکن ہے کہ شمال مغربی سامی اور عربی کے (ارتقائی دور کے) درمیان میں کچھ بولیاں موجود رہی ہوں، چنانچہ ایسا ادّعا اس مقامی بولی کے بارے میں کیا گیا ہے جس سے عبرانی کتاب ایّوب (*Book of Job*) متأثر ہوئی ہے (دیکھیے B. Moritz، در *ZATW*، ۱۹۲۶ء، ص ۸۱ تا ۹۳؛ Foster، در *Am. Journ. of Sem./Lang.*، ۱۹۳۲ء، ص ۲۱ تا ۴۵)۔

(۲) ابتدائی عربی: عربی کا سب سے قدیم ذکر ان تقریباً چالیس اسماے معرفہ کی شکل میں آیا ہے جو ۸۵۳ تا ۶۲۶ قبل مسیح کی عربی (Aribi)، (عربو (Urubu) عربی (Urbi)، قب (Aram Naharaim: O' Callaghan، ص ۹۵) کے خلاف جنگوں کے آشوری بیانات میں

ملتے ہیں اور جنھیں T. Weiss-Rosmarin (در *JSOR* ۱۹۳۲ء، ص ۱ تا ۳۷) اور F. Hommel (: *Ethnologie u. Geogr. die alten Orients*، ۱۹۲۶ء، ص ۵۷۸ تا ۵۸۹) نے جمع کر دیا ہے۔ ان سب کو بطور عربی ناموں کے شناخت کیا جا سکتا ہے: Landsberger اور Bauer کا یہ خیال (در *Z A*، ۱۹۲۷ء، ص ۹۷ - ۹۸) کہ اربی آرامی تھے ایسا ہی بے بنیاد ہے جیسا B. Moritz (*Or.* *Studies.....Paul Haupt*، ۱۹۲۶ء ص ۱۸۴ تا ۲۱۱) کا یہ نظریہ کہ اَرَمّو (Arammu) جن کا ذکر اسی زمانے کے متون میں آتا ہے، عرب تھے۔ گمبولو (Gambulu) کا اربی سے گہرا رشتہ تھا (Assurbanipal : *Rassam Prism*، ۳ : ۶۵)؛ ان کے سرداروں میں (Sargon : *Annals*، ص ۲۵۴ تا ۲۵۵) ہمدانو (Hamdanu)، زبیدو (Zabidu) اور حزائلو (Haza'ilu) شامل تھے اور اسی طرح بعض آرامی تھے، تاہم بیشتر کے نام آشوری تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان قبائل میں سے بعض پر اعلیٰ تر تہذیب و تمدّن [یعنی آشوری تمدن] کا اثر پڑ چکا تھا۔

آشوری اثران قدیم ترین متون میں بھی نمایاں ہے جو عربوں نے آٹھویں تا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایک شمالی عربی خط میں، جو دِیدانی (Dedanite) سے ملتا جلتا ہے، لیکن اکادی (Accadian) زبان میں لکھے تھے۔ سوا مخلوط شکل ی زب ل کے جو اکادی ازبل ''وہ لے گیا'' یا اس نے اٹھایا میں مغربی سامی کے حرف سابق ی کے سابقے سے بنا ہے۔ ان میں وہ دو مختصر کتبے شامل ہیں جو اُر (Ur) میں دستیاب ہوے تھے (Burrows، در *JRAS* ۱۹۲۷ء، ص ۷۹۵ تا ۸۰۶) اور کچھ اسطوانی شکل کی مہریں بھی (W. F. Albright، در *Bull. Am. School f. Or. Res.*، شمارہ ۱۲۸، ص ۳۹ تا ۴۵) - Albright نے اس جماعت کو جو ان متون کی مصنف تھی، کلدانی قرار دیا ہے۔

العُلا کے دیدانی (Dedanite) کتبے غالبًا ان سے ذرا ہی بعد کے ہیں (H. Grimme : *Buch. u. Schrift*، ۴ : ۱۹ تا ۲۸؛ وہی مصنف، در *OLZ*، ۱۹۳۲ء، ص ۷۵۳ تا ۷۵۸) - اسی مقام پر لیکن بعد کے زمانے کے لحیانی کتبے بھی ہیں۔ ان میں سے مؤخر ترین تقریبًا ۱۵۰ء کے ہیں اور ان میں قدیم عربی کے خصائص نمایاں ہیں۔ تقریبًا اسی زمانے میں (لیکن دیکھیے Boneschi، در *R S O*، ۱۹۵۱ء، ص ۱ تا ۱۵) لحیانی بادشاہ مسعود نے متروک نبطی - آرامی میں کتبے لگوائے۔

مآخذ: متون: (۱) Jaussen و Savignac: *Mission archéol-en Arabie*، ۱۹۰۴ تا ۱۹۱۴ء، ۲: ۳۶۳ تا ۵۳۴؛ نحو: Winnett: *Study of the Lihy. and Thamudic Inscr.*، ۱۹۳۷؛ وہی مصنف، در *Mus.*، ۱۹۳۸ء، ص ۲۹۹ تا ۳۱۰؛ (۲) W. Caskel: *Liyhan u. Lihyanisch*، ۱۹۵۴ء۔

لحیانی رسم خط میں مقابر کے کتبے الحَسا میں موجود ہیں (G. Ryckmans، در *Mus.*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۳۹؛ Cornwall، در *G J*، ۱۹۴۶ء، ص ۴۳ تا ۴۴؛ Winnett: *Bull. Am. School for Or. Res.*، عدد ۱۰۲، ص ۴ تا ۶) - S. Smith (در *BSOS*، ۱۹۵۴ء، ص ۴۴۲) کا خیال ہے کہ یہ کتبے اہل حیرہ کی تصنیف ہیں۔

ثمودی زبان کی نمائندگی دیواروں پر کندہ وہ تحریریں (graffiti) کرتی ہیں جو شمالی حجاز، سینا، شرق اردن، جنوبی فلسطین (تین ہزار، در A. v. d. Branden: *Inscriptions thamoudeennes*، ۱۹۲۴ء، پانچ سو چوبیس، در Harding و Littmann, : *Some Th. Inscr. from.....Jordan* ۱۹۵۲ء)، عَسیرْ (نو ہزار

دریافت کردہ G. Ryckmans در ۱۹۵۲ء) اور مصر (Kensdale)، در *Mus.*، ۱۹۵۲ء، ص ۲۸۵ تا ۲۹۰) میں پائی جاتی ہیں؛ نحو کے لیے دیکھیے v. d. Branden : کتاب مذکور؛ E. Littmann : *Thamud u. Safā*، ۱۹۴۳ء؛ وہی مصنف، در *ZDMG* ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۸ تا ۱۸۰ - متأخر ثمودی متون ابتدائی عربی کے ساتھ ساتھ ملتے ہیں: ایک سطر حجر کی لوح پر، مؤرخہ ۲۶۷ء (نبطی رسم الخط میں)، یا دیوار پر کندہ چند تحریریں سینا میں واقع رم (Ramm) کے مندر میں مؤرخہ تقریباً ۳۰۰ء - عربی رسم خط میں قدیم ترین کندہ تحریروں کے پہلو بہ پہلو چھے سو سال تک استعمال ہونے کے دوران میں اس زبان میں بہ مشکل ہی کوئی تغیر ہوا؛ اس میں سے ایک ادبی روایت کی موجودگی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

صفائی (Safaitic یا safatene) کندہ تحریریں صفا، حرّہ اور لجا میں، جو دمشق کے مشرق میں ہے، پائی جاتی ہیں (اس علاقے سے باہر کے متون کے لیے دیکھیے E. Littmann)، در *Melanges Dussaud*، ۱۹۳۹ء، ص ۶۶۱ تا ۶۷۱؛ یا G. Ryckmans : وہی کتاب، ص ۵۰۷ تا ۵۲۰) - النمّارہ کے آس پاس بعض ایسی کندہ تحریریں ہیں جو صفائی اور ثمودی کے بین بین ہیں - ان میں جو تاریخی تلمیحات ہیں ان میں تیسری صدی عیسوی تک کی تاریخیں ملتی ہیں (G. Ryckmans)، در *Comptes Rend. Ac. Inscr.*، ۱۹۴۲ء، ص ۱۲۷ تا ۱۳۶؛ M. Rodinson، در *Sumer*، ۱۹۴۶ء ص ۱۳۷ تا ۱۵۵) اور بقول *Winnett* (در *JAOS* ۱۹۵۳ء ص ۴۱) ۶۱۴ء تک کی - ان میں کا ایک ثمودی متن ممکن ہے نصرانی ہو (E. Littmann)، در *M W*، ۱۹۵۰ء، ص ۱۶ تا ۱۸) - اس کے برخلاف دیکھیے (v. d. Branden)، در *Mus.*، ۱۹۵۰ء، ص ۴۷ تا ۵۱)۔

مآخذ: متون: ۳۹۶، در M. de Vogue : *Syrie Central : Inscr. Semit*، ۱۸۶۸ تا ۱۸۷۷ء؛ ۹۰۴، در Dassaud و Macler : *Mission dans . . . Syrie*، ۱۹۰۳ء؛ ۱۳۶، در E. Littmann : *Public Moyenne Semitic Inscriptions*، ج ۴، *Amer. Arch. Exp.* ۱۹۰۴ء؛ ۳۹۰، در H. Grimme : *Texte u. Untersuchungen zur Saf. arab Religion* ۱۹۲۹ء؛ ۱۳۰۲، در E. Littmann : *Syria = Safatic Inscr.* - - - - - - *Publ. of the Princeton Archaeol. Exp.*، ج ۴، C، ۱۹۴۳ء، نحو کے بہترین خاکے سمیت، قبّ نیز وہی مصنف: *Thamud u. Safa*؛ ۵۳۸۰، در *Crop. Inscr. Sem.*، ج ۵ / ۱، ۱۹۵۰ء دیکھیے نیز R. Dussaud : *Arabs en Syrie avant 'l' Islam* ۱۹۰۷؛ وہی مصنف : *Peneteration des Arabes en Syrie qvant l' Islam*، ۱۹۵۵ء۔

مزید مآخذ کے لیے دیکھیے G. Ryckmans، در *Revue Biblique*، ۱۹۳۲ء، ص ۸۹ تا ۹۵؛ وہی مصنف در، *Med. Kon. Vlaamsche Acad.*، ۱۹۴۱ء، ص ۱۲-۱۳؛ وہی مصنف در *Mus.*، ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۷ تا ۲۱۳۔

چونکہ دیواروں پر کندہ تحریریں بیشتر ناموں پر مشتمل ہیں، اس لیے ان سب محاورات کے بارے میں ہمارا علم بہت کم ہے - اس کا امکان ہے کہ لغات عربی کے حوالے سے ان کی تشریح کے طریقے کی وجہ سے وہ مستند عربی سے اس سے زیادہ مشابہ معلوم ہونے لگی ہیں جتنی کہ وہ در حقیقت تھیں - اربی (Aribi) ناموں کو عربی رسم خط میں منتقل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عین کی آواز خفیف ہوتی تھی، ''ج'' کی آواز اکادی (Accadian) g کی سی گاف، قاف کی کاف کی طرح، ثاء کی تاء کی سی، اور فاء کی پ جیسی ہے - صفائی علاقے کے ان ناموں کو

یونانی حروف میں منتقل کرنے پر حروف علت کا ایک ایسا نظام ظاہر ہوتا ہے جو عبرانی یا عوامی عربی سے مشابہ ہے، مثلاً Οσεδου = اُسَید - ب، ن، ی = بنی اور ن، ج، ی = نجا کے ہجوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب افعال ناقصہ عبرانی کی طرح ایا پر ختم ہوتے تھے۔

بحالیکہ یہ سب لوگ اپنی زبانوں کو ایسے مختلف رسوم خط میں لکھتے تھے جو جنوبی عربی رسم خط سے بہت زیادہ مماثل تھے۔ نبطی (ایک سو قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی عیسوی تک) اور اہل تدمر (Palmyrenians) (پہلی سے تیسری صدی عیسوی تک) شاہی آرامی کی مقامی شکلوں کو (جو ہخامنشی سلطنت کی عام زبان تھی) اور آرامی رسم خط کو استعمال کرتے تھے، لیکن ان کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبطی کاملاً عرب تھے اور یہ کہ تدمر (Palmyr) میں ایک اہم عرب عنصر موجود تھا (دیکھیے Goldmann: *Palmyr. Personennamen*، ۱۹۳۷ء - تدمری میں عربی الفاظ بہت کم ہیں (J. Cantineau: *Gr. du Palm. épigr.*، ۱۹۳۵ء، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱؛ F. Rosenthal: *Sprache d. palmyr. Inschr.*، ۱۹۳۷ء، ص ۹۴ تا ۹۶ میں اور بھی کم) - نبطی میں کئی طرح کی عربیت ہے اور مؤخر متون میں اس کی مثالیں تعداد میں تیزی سے بڑھتی جاتی ہیں (Catineau: کتاب مذکور، ۲: ۱۷۱ تا ۱۸۰؛ وہی مصنف: *AIEO*، ۱۹۳۴ء، ص ۷۷ تا ۹۷ دیکھیے، نیز F. Rosenthal: *Aramaistische Forschung*، ۱۹۳۹ء، ص ۸۹ تا ۹۲) - اس بنیادی عربی میں جو غالباً مختلف علاقوں میں مختلف نوعیت کی تھی، ثمودی صدق (sdk) بمعنی ''جائز وارث'' شامل ہے برخلاف کتبوں کی پرانی عربی کے - اس میں ال حرف تعریف موجود تھا (شیء القوم بہ مقابلۂ صفائی شیء ھقوم ایک دیوتا کا نام؛ *hgra=lhgrw*)؛ الف ممدودہ کی آواز واو مجہول کی سی ہوتی تھی جیسے کہ شروع کی مغربی (عربی) بولیوں میں۔

قدیم عربی کا ایک مأخذ جس سے بمشکل استفادہ کیا گیا ہے ان اسماے شخصی میں موجود ہے جو ہزاروں کی تعداد میں معروف ہیں - یہ نام عربی کے زمانے سے لیکر آج کل کے بدویوں تک ایک قابل توجہ تسلسل ظاہر کرتے ہیں اور مختلف قدیم عربی محاورات میں ایک مشترک بنیاد کا کام دیتے ہیں (ایک مفید مطلب شکل، در Hardings و Littmann: کتاب مذکور، ص ۵۰ میں ہے)۔ ان سے مستند عربی میں بعض متروک شکلیں باقی رہ گئی ہیں جیسے اُدَد (الطبری، ۳: ۲۳۶۰) = Αυδαδου صفائی 'dd (یعنی Odadu) جو کلاسیکی عربی میں اود ہوگا اور ان سے قدیم عربی لغات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مآخذ: (۱) G. Ryckmans: *Noms propressud semit.*؛ (۲) Wuthnow: *sémiticues Menschennamen i. d. griech. Inschr. u. Papyri d.*، ۱۹۳۴ء؛ *Vornern Orients*، ۱۹۳۰ء؛ (۳) Gratzl: *Arab.*، *Frauennamen*، ۱۹۰۶ء؛ (۴) Bräu: *Altnordar.*، *kultische Personennamen*، *WZKM*، ۱۹۲۵ء ص ۳۱ تا ۵۹، ۸۵ تا ۱۱۵۔

عربی کی تاریخ صوتی (Phonetic) کی از سر نو تشکیل کے لیے اور قیمتی ذریعہ جغرافیائی اسما ہیں جو اکادی (Accadian) متون میں پائے جاتے ہیں (دیکھیے اوپر بذیل عربی اور اسی طرح عبرانی متون میں J. A. Montgomery: *Arabia and the*:

Bible، ۱۹۳۴ء؛ وہی مصنف، در Haverford Symposium on Archeol. and Bible، ۱۹۳۸ء، ص ۱۸۸ تا ۲۰۱)؛ یونانی اور لاطینی متون بحوالۂ (A. Sprenger : Alte، Geogr. Arabiens، ۱۸۷۵ء؛ Glaser : Skizze etc.، ۱۹۸۸ تا ۱۸۹۰ء؛ A. Musil : Topographical Itineraries، ج ۲، ضمیمہ ۳؛ اس سب مواد کے لیے دیکھیے F. Hommel : Ethnologie etc.، ص ۵۳۸ تا ۶۳۴)؛ O. Blau : Altaab. Sprachstudien، در ZDMG، ۱۸۷۱ء، ص ۵۲۵ تا ۵۹۲ کا طریق کار قابل اطمینان نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ قدیم عربی جُرْہُم کی زبان ہو جس کے تقریباً تیس الفاظ ابوعبید (۲۲۳ھ/۸۳۸ء) نے اپنے رسالۃ فی ما ورد فی القرآن الکریم من لغات القبائل میں دیے ہیں (دیکھیے Rabin : Ancient West-Arabian، ص ۷؛ اور شاید جسے صلاح الدین المنجد نے اسمٰعیل بن عمرو المقریٔ کی تصنیف کے طور پر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، قاہرہ ۱۹۴۶ء)۔ جُرہم یقیناً عرب العاربہ (رکّ بآن) یا البائدہ میں سے تھے جن سے بقول عرب مؤرخین العرب المستعربہ یعنی ان قبائل نے جو چھٹی صدی عیسوی میں آبادی کا بیشتر حصہ تھے، ملک عرب اور عربی زبان پر اپنی سیادت قائم کر لی۔ ہمیں صاف طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ بنو طیء نے بنو صُحار کی زبان اختیار کر لی تھی (یاقوت، ۱: ۱۲۷)۔ ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیے کہ (۱) آیا العاربہ بعینہٖ وہی لوگ تھے جو قدیم عربی بولتے تھے؛ (۲) اس سے قبل کہ انھوں نے عربی کو اختیار کیا المستعربہ کونسی زبان بولتے تھے۔ ان دونوں سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ اس معاملے کا مزید تعلق مشرقی اور مغربی ابتدائی بولیوں کے افتراق باہمی سے ہے۔ بحیثیت مجموعی مؤخر الذکر بظاہر قدیم عربی سے نزدیک تر تھیں، لیکن یہ بھی اغلب ہے کہ قدیم عربی کی حقیقی جانشین قضاعۃ کی بولیاں تھیں جو اس علاقے میں رائج تھیں جہاں وہ مقدم الذکر زبان بولی جاتی تھی اور جس کے بارے میں ہمارا علم عملاً صفر ہے۔ دوسری طرف ان علاقوں سے متعلق جہاں یا تو مشرقی یا مغربی بولیاں رائج تھیں، ہمارے پاس عملاً کتبوں کی شکل میں کوئی بھی مواد موجود نہیں اور ممکن ہے کہ قدیم عربی کے زمانے میں ان علاقوں کی بولی ان قدیم عربی بولیوں سے جو کتبوں کی بدولت باقی رہ گئی ہیں، بالکل مختلف ہو۔

(۳) شروع کی عربی (تیسری تا چھٹی صدی عیسوی) کا ابتدائی دور: انگریزی اور جرمنی زبانوں کے ناموں کی سابقہ مثالوں کی پیروی کرتے ہوے ہم یہ نام تیسری سے چھٹی صدی عیسوی کے لیے استعمال کرسکتے ہیں جب کہ عرب کے ایک بڑے حصے میں کئی ایسی بولیاں رائج تھیں جو قدیم عربی سے بالکل جداگانہ تھیں، لیکن مستند عربی کے قریب تھیں، اور اس زمانے میں خود مستند عربی کا یقیناً ظہور ہوا ہوگا۔

اس عہد کے بارے میں خارجی شہادت کمیاب ہے، لیکن ہم‌عصر یہودی مآخذ میں متعدد اقتباسات موجود ہیں (جنھیں A. Cohen نے JQR، ۱۹۱۲/۱۹۱۳ء، ص ۲۲۱ تا ۲۳۳ میں جزوی طور پر جمع کر دینا ہے)۔ ان میں جملے بھی شامل ہیں، مثلاً מבעד לצמתן = مُبْعَد لِضُمْتِك، یعنی اپنی جماعت کے لیے جگہ خالی کرو (Midrash Rabba بر Canticles، ۴ : ۱)۔

یہی وہ عہد تھا جس کے دوران میں عیسائی اور یہودی روابط کے ذریعے سیکڑوں آرامی مستعار لفظ زبان میں داخل ہو گئے (S. Fraenkel : Arm. Fremdwörter im Arab.، ۱۸۸۶ء)۔ ان کے صوتی

مطالعے سے اس عہد کی عربی زبان پر کچھ روشنی پڑتی ہے؛ اس طرح زبان کا ایک قدیم تر دور ہے جبکہ آرامی ش = س اور اس کے بعد کا طبق جس میں یہ ش بن جاتی ہے، جس کا سبب بلا شبہہ عربی میں ایک صوتی تغیّر ہے (D. H. Müller: *Acts VII Or. Congr.*، ۱۸۸۸ء، ص ۲۲۹ تا ۲۳۸؛ Brockelmann: *Grundr. Vergl. Gr.*، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۳۰) - اس زمانے میں کچھ اور الفاظ جنوبی عربی زبان سے داخل ہوے (H. Grimme، در *Z A*، ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۸ تا ۱۶۸؛ نیز دیکھیے F. Krenkow، در *WZKM*، ۱۹۳۱ء، ص ۱۲۷ تا ۱۲۸) اور اسی طرح حبشی زبان سے بھی (Nöldeke: *Neue Beiträge*، ص ۳۱ تا ۶۶، مزید دیکھیے Rabin: *Ancient West-Arabian*، ص ۱۰۹ بذیل تابوت و مشکوٰۃ) - جنوبی عربی زبان سے متعلق ہماری محدود معلومات کی وجہ سے ان دونوں مأخذوں میں ہمیشہ صاف طور پر تمیز کرنا ممکن نہیں - فارسی کے بعض مستعار الفاظ بھی جو قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں اس عہد میں داخل ہوے، اگرچہ فارسی الفاظ کی بڑے پیمانے پر درآمد اسلام کے قرونِ اولیٰ میں واقع ہوئی (A. Siddiqi: *Studien über d. pers. Fremdwörter*، ۱۹۱۹ء) . یونانی الفاظ زیادہ‌تر آرامی کے توسط سے داخل ہوے اور لاطینی کے یونانی اور آرامی کے واسطے سے، مثلاً قنطار سریانی قنطیرا سے مأخوذ ہے جو لاطینی میں *centenarius* ہے؛ مَنْدِیل سریانی کا مندیلا ہے جو یونانی μανδήλη سے مأخوذ ہے (مخصوص یونانی صوتی تغیر کے ساتھ) اور لاطینی *mantele* سے - ہو سکتا ہے کہ بعض فوجی اصطلاحیں، مثلاً صراط مأخوذ از *strata* یا قصر مأخوذ از *castra* (دیکھیے فلسطینی یہودی آرامی قصرا) لاطینی سے براہ راست آئی ہوں .

مآخذ : (۱) الجو الیقی: المعرّب (طبع Sachau) ۱۸۶۷ء؛ (۲) Nöldeke: *Neue Beiträge*، ص ۲۳ تا ۳۰؛ (۳) A. Jefferry: *Foreign Vocabulary of the Qur'ān*، ۱۹۳۸ء؛ (۴) A. Salonen: *Alte Substrat-und Kulturwörter im Arab.*، ۱۹۵۰ء (= *St. Or. Soc. Or. Fennica*، ۱۷ : ۲) .

یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ ابتداء یہ الفاظ کسی ایسے مخصوص لسانی علاقے میں داخل ہوے ہوں گے جو زیر بحث تمدن سے علاقہ و روابط رکھتا تھا، بعد ازاں مستند عربی میں رائج ہوگئے- ہم بعض ایسے الفاظ کا ذکر سنتے ہیں جو مدینے میں مستعمل تھے (Rabin: کتاب مذکور، ص ۹۶؛ Fück: *Arabiya*، ص ۱۰) .

علم لسان سے متعلق عربی ادب میں نجد کی ابتدائی بولیوں (تمیم، اسد، بکر، طیٔ، قیس) کے بارے میں بہت کچھ مواد محفوظ ہے اور اسی طرح حجاز اور جنوب مغرب کے مرتفع علاقے (ہذیل، ازد، یمن) کے بارے میں، لیکن اور علاقوں کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے- یہ معلومات بظاہر دوسری سے تیسری صدی ہجری تک کے زمانے میں جمع کی گئیں جب کہ غالباً یہ مقامی بولیاں کسی حد تک ان قبائلیوں کی مدد سے جو شہروں (امصار) میں موجود تھے تیزی سے معدوم ہو رہی تھیں- یہ معلومات متکلمانہ زاویۂ نظر کی بدولت، نیز اس وجہ سے کہ انھیں ایسے متون کی دشواریوں کے حل کرنے کے لیے استعمال میں لایا گیا ہے جو مذکورہ بولیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، توڑ مروڑ کر پیش کی گئی ہیں- بولیوں میں خود ان کی خاطر دلچسپی بعد میں پیدا ہوئی اور بہت سا مواد صرف مؤخر تصانیف میں محفوظ ہے جن کے مآخذ کا ہم جائزہ نہیں لے سکتے .

[ان معلومات سے] بولیوں کے مشرقی گروہ میں جس کا مرکز خلیج فارس تھی اور مغربی گروہ میں جس میں جنوب مغربی اور حجازی بولیوں کے علاوہ طیئ کی بولی بھی شامل تھی، ایک نمایاں افتراق عیاں ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر میں امتیازی خصائص یمن اور طیئ کی بولیوں میں سب سے زیادہ صاف طور پر نمایاں ہیں، بحالیکہ ہذیل اور حجاز کی بولیوں میں مشرقی اثر کی شہادت ملتی ہے۔ یہ اختلافات وزن (rhythm) میں (مشرق میں حروف علت کی تخفیفات اور ادغام)، حروف کے نظام صوتی (phonetcs) میں (مثلاً مغرب میں آ (ā) جس کی آواز او (ō) کی سی نکالی جاتی تھی اور ای (ē) میں تمیز کی جاتی تھی بحالیکہ مشرق میں دونوں آ (ā) میں مدغم ہو جاتے تھے جس کی آواز آی (āē) کی سی ہوتی تھی۔ ہمزہ کی آواز مشرق میں زوردار ہوتی تھی، بلکہ وہ عین میں تبدیل ہو جاتا تھا، لیکن مغرب میں اس کی آواز بالکل ہلکی ہوتی تھی)، صرف و نحو میں (مثلاً مشرقی الذی = مغربی ذو، ذی؛ مشرقی فعل مجہول، قول = مغربی قیل؛ مشرقی صیغۂ امر رُدّ = مغربی اُرْدُد) : نحو میں (مثلاً حجازی ما؛ مشرقی جاء (جاءت) الرجال = مغربی جاؤوالرجال) اور الفاظ میں پائے جاتے ہیں۔

یہ معین کرنا دشوار ہے کہ یہ افتراق محض زمانۂ قریب میں رونما ہوا تھا یا موروثی اور قدیم تھا۔ اس امکان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عرب کے باشندے سامی دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوں گے اور یہ کہ مشترک عربی خصوصیات عرب میں آباد ہونے کے بعد باہمی اثر سے پیدا ہوئی ہوں گی یا کسی مشترک بنیاد کی وجہ سے۔

یمن کی بولیوں کو ایک مخصوص مقام حاصل ہے۔ ابن دُرید اور نَشوان بن سعید کی لغوی تصانیف کی بدولت ان کے بارے میں معلومات بکثرت ہیں اور ان کی صحیح قدر و قیمت بھی جانچی جا سکتی ہے، اس لیے کہ آج کل یہاں جو عوامی زبان ہے اس میں قدیم بولی کا تسلسل قائم رہا ہے (دیکھیے بیانات در C. de Landberg : *Datina*، ۱۹۰۵ تا ۱۹۱۳ء؛ وہی مصنف : *Glossaire Datinois*، ۱۹۲۰ تا ۱۹۴۷ء)۔ حِمیر کی بولی جس کا ذکر عرب ماہرین لسان نے کیا ہے، مغربی عرب کی متروک زبان تھی جو جنوبی عربی سے بہت زیادہ متأثر تھی۔ اس بولی میں ہمارے پاس چند اشعار اور کہاوتیں موجود ہیں اور متعدد کتبے (مُسْنَد) بھی جنھیں نشوان اور الهَمْدانی نے اس نظریے کے تحت پیش کیا ہے کہ قدیم حمیر اور سبأ کے جنوبی عربی بادشاہ ساتویں صدی عیسوی کی حمیری [رکّ بہ حِمیر] زبان بولتے تھے۔

مآخذ : قدیم‌تر ادب (جس سے احتیاط سے کام لینا چاہیے) : (۱) G. W. Freytag : *Einführung etc.*، ۱۸۶۱ء، ص ۶۵ تا ۱۲۵؛ (۲) انستاس ماری، در المشرق، ۶ : ۵۲۹ تا ۵۳۶؛ (۳) ناصیف الیازجی، در *Acts VII Or. Congr.*، ۱۸۸۸ء، ۲ : ۶۹ تا ۱۰۴؛ (۴) K. Vollers : *Volkssprache*، ۱۹۰۶ء۔ زمانۂ حال کی تحقیق کا آغاز مندرجۂ ذیل سے شروع ہوتا ہے : (۵) Sarauw : *Die altarab. Dialektspaltung*، در *ZA*، ۱۹۰۸ء، ص ۳۱ تا ۴۹؛ (۲) H. Kofler : *Reste altarab. Dialekte*، در *WZKM*، ۱۹۴۰ء، ص ۱۶ تا ۱۳۰، ۲۳۳ تا ۲۶۲؛ ۱۹۴۱ء، ص ۵۲ تا ۸۸، ۲۴۷ تا ۲۷۴؛ ۱۹۴۲ء، ص ۱۵ تا ۳۰، ۲۳۴ تا ۲۵۶؛ (۳) ابراهیم انیس = اللهجات العربیہ، ۱۹۴۶ء؛ (۴) E. Littmann : *B. Fac. Ar.*، ۱۹۴۸ء، ص ۱ تا ۵۶؛ (۵) C. Rabin :

; K. Petráček (۶) ؛ ۱۹۵۱ء، *Ancient West-Arabian*
ArO ۱۹۵۴ء، ص ۴۶۰ تا ۴۶۶ .

عربی کے ابتدائی دور کے دو کتبے موجود ہیں جو نبطی رسم الخط میں ہیں، لیکن ان کی زبان عملی طور پر خالص عربی ہے : ان میں سے ایک (الحجر میں جسے اب مدائن صالح کہتے ہیں) مورخۂ ۲۶۷ء شمالی حجاز میں ہے، (M. Lidzbarski، در *Z A*، ۱۹۰۹ء؛ ص ۱۹۴ تا ۱۹۷؛ Jaussen و Savignac، در *Rev. Biblique*، ۱۹۰۸ء، ص ۲۴۱ تا ۲۵۰؛ Chabot، در *Comptes Rend. Ac. Inscr.*، ۱۹۰۸ء، ص ۲۶۹ تا ۲۷۲؛ I. Cantineau : *Nabatéen*، ۲ : ۳۸) جس میں ایک ثمودی زبان کی سطر بھی ہے؛ دوسرا کتبہ امرؤالقیس ''ملک العرب'' کا النمارہ میں ہے، مورخۂ ۳۲۸ء (R. Dussaud، در *Rév. Archéol.*، ۱۹۰۲ء، ص ۴۰۹ تا ۴۲۱؛ وہی مصنف : *Mission...Syrie Moyenne*، ص ۳۱۴؛ M. Lidzbarski : *Ephemeris*، ۲ : ۳۴)؛ Cantineau (*Rép. Epigr. Sém.*، عدد ۴۸۳؛ ۲ : ۴۹)؛ M. Hartmann (*OLZ* ۱۹۰۶ء، ص ۵۷۳؛ *Arab. Frage*، ۱۹۰۸ء، ۱ : ۵۰۱)؛ اور اب Dussaud : *Pénètration* etc. کا بھی) یہ خیال تھا کہ امرؤالقیس حیرہ کا کوئی بادشاہ تھا، لیکن کتبے کا مغربی بولی میں ہونا ''تی [= تِ]'' اسم ضمیر واحد مؤنث اور ذو اسم موصول سے عیاں ہے .

۲. ادبی زبان

(۱) کلاسیکی عربی

عربی میں قدیم ترین متون سینا میں رَمّ کے معبد میں دیواروں پر کندہ تین نقش ہیں جن کی تاریخ تقریباً ۳۰۰ء ہے (H. Grimme : *Rev. Bibl.*، ۱۹۳۵ء، ص ۲۷۰؛ ۱۹۳۶ء، ص ۹۰ تا ۹۵) - بعض نصرانی کتبے جن کے ساتھ ان کے یونانی ترجمے بھی ہیں زباد میں موجود ہیں؛ ان کی تاریخ ۵۱۲ء ہے (E. Sachau، در *Mitth. Pr. Ak. W.*، ۱۸۸۱ء، ص ۱۶۹ تا ۱۹۰؛ وہی مصنف، در *ZDMG*، ۱۸۸۲ء، ص ۳۴۵ تا ۳۵۲)، اور حرّان میں لِجّہ کے مقام پر جن کی تاریخ ۵۶۸ء ہے (Schröder، در *Z D M G*، ۱۸۸۴ء، ص ۴۴؛ Dussaud : *Mission...Syrie Moyenne*، ص ۳۲۴؛ Cantineau : *Nabatéen*، ۲ : ۵۰؛ دونوں کتبوں پر دیکھیے E. Littmann، در *R S O*، ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۲ء، ص ۱۹۳ تا ۱۹۸) - حیرہ میں ہند الحیرہ کے کلیسا کے ایک کتبے مؤرخۂ ۵۶۰ء کا متن مسلم مؤرخین نے نقل کیا ہے، (البکری، ص ۲۶۴؛ G. Rothstein : *Lahmiden*، ۱۸۹۹ء، ص ۲۴) - ایک دیوار پر ایک غیر مؤرخہ نقش امّ الجمال میں ہے (E. Littmann، در *ZS*، ۱۹۲۹ء، ص ۱۹۷ تا ۲۰۴) - یہ چاروں کتبے N. Abbott کی تصنیف (*Rise of the North Arabian Script*، ۱۹۳۹ء، لوحہ ۱) میں موجود ہیں - تاریخ والے کتبوں کے طور و طرز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی رسم خط اسلام سے بہت پہلے مروج تھا اور حروف ابجد کی شکلیں موجود تھیں - Abbott (کتاب مذکور، ص ۵) اس خط کی ایجاد کا مقام حیرہ یا انبار تصور کرتا ہے .

یہ بات اغلب ہے کہ بائیبل کے کم از کم جزوی ترجمے عربی میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھے - (W. Rudolph : *Abhängigkeit d. K. v. Judentum u. Christentum*، ۱۹۲۲ء؛ A. Mingana : *Bull. J. Rylands Library*، ۱۹۲۷ء، ص ۷۷ تا ۸۹؛ Ahrens، در *ZDMG*، ۱۹۳۰ء، ص ۱۵ تا ۶۸، ۱۴۸ تا ۱۹۰) - A. Baumstark نے دعوٰی کیا تھا کہ بائیبل کے بعض عربی مخطوطات زمانۂ قبل

اسلام کے ہیں (*Islamica*، ۱۹۳۱ء، ص ۵۶۲ تا ۵۷۵؛ *BZ*، ۱۹۲۹ - ۱۹۳۰ء، ص ۳۵۰ تا ۳۵۹؛ *OC*، ۱۹۳۴ء، ص ۵۵ تا ۶۶ - برخلاف اس کے دیکھیے Graf : *Gesch. d. Chr. Arab Lt.*، ۱: ۱۴۲ تا ۱۴۶) - الحان داؤدی (*Psalms*) کا عربی میں ایک حصّہ بھی یونانی رسم خط میں موجود ہے (Violt، در *OLZ*، ۱۹۰۱ء، ص ۳۸۴ تا ۴۰۳) - اس سے اور Baumstark کے دو متون (B. Levin : *Griech. Arab. Evang. Uebers*، ۱۹۳۸ء) سے ایک ایسی زبان کا پتا چلتا ہے جو مستند عربی سے بہت قلیل حد تک عوامی بولیوں کی طرف ہٹی ہوئی تھی - عیسوی عربی ادب کا یہ ایک مخصوص پہلو ہے (Graf : *Sprachgebrauch d. älteren Chr. Arab. Liter.*، ۱۹۰۵ء)، جو ابتدا کے اوراق بردی (papyri) اور علمی تحریروں کی زبان دونوں میں نمایاں ہے - اس کا باعث ابتدائی عوامی زبان کا اثر ہو سکتا ہے، لیکن ایک ایسی عربی زبان بھی ہو سکتی ہے جسے اب تک نحویوں نے معیاری نہیں بنایا تھا۔

اس کا امکان کمتر ہے کہ عرب کے یہودیوں نے بھی مستند عربی کی ادبی نشو و نما میں کوئی حصہ لیا ہو، اس لیے کہ اس عہد میں عہدنامۂ قدیم کے ترجمے یہودی نہیں کر رہے تھے (اگرچہ ایک یہودی ترجمے کا ذکر البخاری، ۳ : ۱۹۸ میں آیا ہے) - وہ یہودی روایات جو اُمیّة بن ابی الصَّلْت (کی شاعری) میں (J. W. Hirschberg : *Jüd. u. Chr. Lehren im vor-u. früh-islam. Arabien*، ۱۹۳۹ء) پائی جاتی ہیں، ان سب میں زبانی نقل کے آثار نظر آتے ہیں؛ تاہم یہودی ظہور اسلام سے پہلے مستند عربی استعمال کرتے تھے، جیسے کہ، مثلاً السَّمَوْءَل بن عادیاء (نیز دیکھیے I. Guidi : *Arabie antéisl.*، ۱۹۲۱ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶؛ Hirschberg : *Dīwān des as-S b.'Ā*، ۱۹۳۱ء، مقدمہ) اور کہا جاتا ہے کہ مدینے میں وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھاتے تھے (البلاذری : فتوح، ص ۴۷۳)۔

Wellhausen (*Reste arab. Heidentums*، بار دوم، ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۲) کا یہ خیال بہت معقول ہے کہ کلاسیکی عربی کی نشو و نما میں حیرہ کے دربار کا بھی حصہ ہے - اسلامی روایت ان لوگوں میں جنھوں نے سب سے پہلے عربی لکھی، زید بن حماد (حدود ۵۰۰ء) اور اس کے بیٹے شاعر عَدی کا نام بھی شامل کرتی ہے، یہ دونوں حیرہ کے عیسائی تھے (الاغانی، ۲: ۱۰۰ تا ۱۰۲) - عدی کی زبان کو مکمل طور پر فصیح نہیں سمجھا جاتا تھا، جس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک عربی زبان اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہی تھی - المُفَضَّل (المرزُبانی : الموشّح، قاہرہ ۱۳۴۳ھ، ص ۴۷) بتاتا ہے کہ عدی نے کئی قبائلی بولیوں سے کام لیا ہے، جو ایک ایسا طریق عمل ہے جس سے بقول بعض دیگر علما قریش کی بولی کی فضیلت کی توجیہ کی جا سکتی ہے - اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ آج کل اقامت پذیر عربوں کی شاعری اکثر بدوی بولیوں میں ہے، نیز یہ کہ قدیم ترین مستند قطعات نظم، یعنی وہ جو حرب بسوس سے متعلق ہیں، فرات کے علاقے سے آئے ہیں، تو اس بیان میں مزید زور پیدا ہو جاتا ہے - حیرہ کا دربار بدوی شعرا کا مرکز رہا؛ اس سے شاعری کی زبان کے ارتقا اور یکسانیت میں مدد ملی - حیرہ میں اس کے تحریری استعمال نے اسے ٹکسالی بنانے میں مزید مدد دی۔

جہاں تک خود اس شاعرانہ زبان کے منبع کا تعلق ہے، قدیم تر اسلامی روایت اسے مختلف

قبائل میں تلاش کرتی تھی، بحالیکہ مؤخّر علما نے، بلاشبہہ مذہبی وجوہ کی بنا پر، اسے قریش کی بولی قرار دیا - اس نظریے کو Grimme (*Mohammed*، ۱۹۰۴ء، ص ۲۳) نیز طٰہٰ حسین (الادب الجاھلی، ۱۹۲۷ء) اور Dhorme (*Langues et écritures sémit.*، ۱۹۳۰ء، ص ۵۳) نے قبول کر لیا تھا - [ادارہ اس رائے سے متفق نہیں] - بیشتر مغربی علما اس کا اصلی گھر نجد کے بدویوں کے درمیان تلاش کرنے میں متفق ہیں، جیسا کہ عملاً دوسری سے چوتھی صدی ہجری کے مسلم نحویوں نے بھی کیا ہے جو صرف نجدی بدویوں کو قابل اعتماد راوی تصور کرتے تھے - بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک مخصوص قبیلے کی زبان تھی، بعض کے نزدیک یہ مختلف بولیوں کی باہمی آمیزش سے بنی اور بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے چند خالصۃً مصنوعی خصائص اپنا لیے تھے - ایک اہم خصوصیت اس کا قدیم صوتی اور نحوی نظام ہے - نظام صوتی کے لحاظ سے اس میں وہ اختصارات مفقود ہیں جو مشرقی بولیوں کا طرّۂ امتیاز ہیں اور نحو کی رو سے اس میں ابتدائی نثر کی ترکیبیں اب تک قائم ہیں (Bloch : *Vers und Sprache im Altarab*، ۱۹۴۶ء)؛ بہر حال اس میں شبہے کی گنجائش نہیں کہ چھٹی صدی کے آخری حصے میں یہ ایک خالص ادبی زبان تھی جو تمام بول چال کی زبانوں سے الگ اور فوق القبائلی تھی - اسے آج کل اکثر شاعرانہ زبان کہا جاتا ہے - اس کے تسلسل کے ضامن مستند ناقلین یا رُواۃ تھے - یہ زبان عملاً پورے عرب میں یکساں تھی - بعض مزعومہ مقامی خصائص، مثلاً قبیلۂ طیء کا ''ذُو'' اور اہلِ حجاز کا ''ما'' بھی ان علاقوں کے باہر کی شاعری میں پائے جاتے ہیں - الفاظ کے انتخاب میں اختلافات شاید رہے ہوں، مثلاً پروفیسر کرینکو Krenkow نے راقم مقالہ کو ایک خط میں یہ بتایا تھا کہ شمالی عرب شاعر شیر کے لیے ''اسد'' کا لفظ استعمال کرتے تھے اور جنوبی ''لَیْث'' کا - نمایاں اختلافات، جیسے کہ اور معیاری زبانوں میں بھی ہیں، بلاشبہہ تلفظ میں تھے - یہ دلچسپ بات ہے کہ قبیلۂ عبدالقیس کے ابوالاَسْوَدالدؤلی نے تیس آدمیوں میں سے ایک عبقسی کو بہترین تلفظ ادا کرنے والا منتخب کیا تھا (الانباری : نزھۃ، ص ۱۱) اور یہ کہ عثمان حجازی کے نزدیک بھی کسی کاتب کو کوئی تحریر لکھوانے کے لیے ایک ھُذَلی بہترین شخص تھا (*Gech. d. Qor.*، ۳ : ۲) - بہرحال یہ ممکن ہے کہ بعض علاقائی خصائص اور متروک محاورات کو جو اشعار میں پائے جاتے تھے، مؤلفین نے حذف کر دیا ہو، اس لیے کہ بسا اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی نحوی کسی ایسے شعر کو کسی خصوصیت کے ضمن میں نقل کر دیتا ہے جو اس شاعر کے دیوان میں نہیں پایا جاتا، اس لیے کہ شعر میں خفیف سا رد و بدل کر دیا گیا ہے .

مآخذ : (۱) K. Vollers، در *ZA.*، ۱۸۹۷ء، ص ۱۲۵ تا ۱۳۹؛ (۲) I. Guidi : *Una somiglianza fra la storia dell' arabo e del latino, Miscellanea linguist.....G. Ascoli*، ٹورینو، ۱۹۰۱ء، ص ۳۲۱ تا ۳۲۶؛ (۳) وہی مصنف : *Arabie antéisl.*، ۱۹۲۱ء، ص ۴۱ تا ۴۴؛ (۴) A. Fischer : *Verhandl. d. Philologentags zu Halle*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۵۴؛ (۵) Nöldeke : *Beitr z. Sem. Sprachwiss*، ۱۹۰۴ء، ص ۱ تا ۱۴؛ (۶) C. de Landberg : *La langue arabe et ses dialectes*، ۱۹۰۵ء؛ (۷) C.Brockelmann : *Grundr. d. vergl. Gramm.*، ۱ : ۲۳؛ (۸) M. Hartmann،

در *O L Z*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۹ تا ۲۸؛ (۹) R. Geyer، در *GGA*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۰ تا ۵۶؛ (۱۰) Nallino، در الهلال، اکتوبر ۱۹۱۷ء=*Scritti*، ۶: ۱۸۱ تا ۱۹۰؛ (۱۱) J. H. Kramers: *Taal van den Koran*، ۱۹۴۰؛ (۱۲) H. Fleisch: *Introd. à l étude des langues sém.*، ۱۹۴۷ء، ص ۹۶ تا ۱۰۴؛ (۱۳) H. Birkeland: *Språk og religion hos Jder og Arabere*، ۱۹۴۹ء؛ (۱۴) J. Fück: *Arabiya*، ۱۹۵۰ء، ص ۵؛ (۱۵) R. Blachère: *Hist. de litt. Arabe*، ۱ (۱۹۵۲ء): باب ۳؛ (۱۶) W. Caskel، در *ZDMG*، ۱۹۵۳ء، ص *۲۸ تا *۳۶؛ (۱۷) *Amer. Anthrop. Assoc. Memoir*، عدد ۷۶، ۱۹۵۴ء؛ (۱۸) C. Brockelmann: *Handbuch d. Orientalistik*، ۳/۲/۳ (۱۹۵۴ء): ۲۱۴ تا ۲۱۷؛ (۱۹) Rabin: *Ancient West-Arabian*، ۱۹۵۱ء، باب ۳؛ (۲۰) وہی مصنف، در *Stud. Isl.*، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹ تا ۳۷.

حقیقی کلاسیکی عربی کے بارے میں تحقیق و تفحّص کے مآخذ ہمارے پاس حسب ذیل ہیں: (۱) زمانۂ قبل اسلام اور آغاز اسلام کی شاعری؛ (۲) قرآن مجید؛ (۳) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور خلفاے راشدین کے رسمی خطوط جنھیں ابتدائی مؤرخین نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے اور قدیم اوراق بردی (papyri)؛ (۴) حدیث؛ (۵) ایام العرب کی نثر.

زمانۂ قبل اسلام کی شاعری اور ابتدائی دور کے اسلامی شعرا کی زبان ایک بدوی روایت کی شاہد ہو سکتی ہے جو قرآن مجید (کی زبان) سے جدا گانہ تھی.

[قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے جو اپنے اسلوب اور اعجاز کے باعث منفرد حیثیت رکھتی ہے - اس کی نثر میں بھی وہ فصاحت و بلاغت اور حسن و جمال ہے جس کی نظیر بہترین شاعری میں بھی نہیں ملتی - بعض الفاظ کی املا کے بارے میں قرآن مجید کی اوّلین املا کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل کیے بغیر انھیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے].

قرآن مجید قریش کی زبان میں نازل ہوا - قریش کی زبان صوتی لطافت، پاکیزگی ساخت اور حسن ترتیب کے اعتبار سے عرب کی تمام بولیوں پر فوقیت رکھتی تھی - قرآن مجید کے اثر سے عربی زبان میں حسن اسلوب، کثرت مضامین اور زور استدلال پیدا ہوا (احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی، مطبوعۂ قاہرہ).

مآخذ: (۱) السیوطی: الاتقان؛ (۲) الزرکشی: البرہان فی علوم القرآن؛ (۳) صبحی الصالح: مباحث فی علوم القرآن؛ (۴) طاہر الجزائری: التبیان لبعض المباحث المتعلقة بالقرآن؛ (۵) محمد جمال الدین القاسمی: محاسن التاویل، جلد اول؛ (۶) ابو عمرو الدانی: المحکم فی نقط المصاحف؛ (۷) Nöldeke: *Sprache d. Korans*، در *Neue Beiträge*، ص ۱ تا ۳۰، مترجمۂ G. H. Bousquet، بعنوان *Remarques critiques sur le style et la syntaxe du Coran*، ۱۹۵۳ء؛ (۸) G. Bergsträsser: *Verneinungs u. Fragepartikeln im K.*، ۱۹۱۴ء؛ (۹) T. Sabbagh: *La métaphore dans le K.*، ۱۹۴۳ء؛ (۱۰) Zayat: *Les néologismes arabes au début de l' Islam*؛ (۱۱) R. Blachère: *Introduction au Coran*، ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۶ تا ۱۸۱؛ (۱۲) G. E. v. Grunebaum، در *WZKM*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۹ تا ۵۰.

حدیث کی زبان سادہ، فصیح اور دل نشین ہے اور زیادہ تر روزمرّہ کی جانب مائل ہے - سلاست زبان اور فصاحت بیان دعاؤں اور خطبوں میں زیادہ نمایاں ہے - کتب حدیث کے ابواب ''الزہد

والرقاق'' اثر انگیزی اور دلآویزی کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ صحیحین اور امام مالکؒ کی الموطأ زبان و ادب کے اعتبار سے بہترین شاہکار ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا اثر صحابۂ کرامؓ پر بھی ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے خطبات و ارشادات عربی زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ صدر اول کی زبان کے نمونے المبرد کی الکامل، الجاحظ کی کتاب البیان و التبیین اور ابن عبد ربّہ کی العقد الفرید میں محفوظ ہیں۔

ایام العرب کی زبان میں جو ہم تک ماہرین لسان کے ذریعے پہنچی ہے، صرف چند انحرافی خصوصیات نظر آتی ہیں (W. Caskel، در *Islamica*، ۱۹۳۱ء، ص ۴۳)۔

کلاسیکی عربی میں ایک انتہائی بیش بہا ذخیرۂ لغات تھا جس کا سبب کچھ تو بدویوں کی قوت مشاہدہ تھی اور کچھ شعر و شاعری کی کثرت و فراوانی۔ اس فراوانی کا ایک باعث بولیوں کی باہمی آمیزش بھی ہو سکتی ہے۔ اسلوب و ہیئت کے اعتبار سے یہ زبان زیادہ باثروت نہ تھی، لیکن اس میں اس مقصد کے لیے کافی لوچ تھا کہ وہ اپنی بنیادی ساخت کو بگاڑے بغیر ایک انتہائی متمدن اور ممتاز ثقافت کی ضروریات کے مطابق بن کر زندہ رہ سکے۔

عرب کے زمانۂ جاہلیت ہی میں فصیح زبان کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور جب غیر عربوں کو بنو امیّہ اور بنو عباس کے عہد میں اسے سیکھنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ لوگ جن کے پاس یہ محفوظ تھی اور جو اسے سکھاتے تھے، یعنی راوی، موقع پر موجود اور تیار تھے۔ ابو الأسْوَد الدُّؤَلِی اور خلیل بن احمد اسی طبقے سے تھے، لیکن جلد ہی ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو یونانی فکر سے متأثر تھے اور جنھوں نے راویوں کے روایتی علم کو نحو کی ایک منظّم شکل دے دی۔ جو علم [صرف و نحو] اس طرح تخلیق ہوا، اسے نہ صرف شاعری بلکہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کے لیے بھی استعمال کیا، گویا اس سے پہلے کہ کلاسیکی عربی عہد اسلامی کی ادبی زبان بنی، وہ چھان بین اور تنظیم کے ایک عمل سے گزرچکی تھی اور بعد ازاں اس کے قدیم مآخذ یعنی شاعری اور قرآن مجید کے اعلیٰ معیار کے مطابق ترمیم و تجدید بھی ہوگئی۔

مآخذ: (۱) J. Fück: *Arab Studien, in Europa vom 12 bis.....19. Jahrh., Beiträge, zur Arabistik*، لائپزگ ۱۹۴۴ء، ۸۵ تا ۲۵۳؛ [(۲) الرافعی: تاریخ ادب العربی، ج ۲، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۳) ضیاءالدین ابن الاثیر: المثل السائر، مطبوعۂ قاہرہ]۔

اہل یورپ کے مطالعۂ ادب عربی کی تاریخ میں پہلا مرحلہ عرب ماہرین لسان کے کام سے بیش از بیش مؤثر طور پر استفادہ کرنا ہے۔ Postel (۱۵۳۸ء) اور Erpenius (۱۶۱۳ء) کی تصنیف کردہ سب سے پہلی صرف و نحو کی کتابیں قدیم درسی کتابوں پر مبنی تھیں۔ پہلا شخص جس نے زیادہ قدیم اور بلند پایہ عربی تصانیف سے باقاعدہ کام لیا، سلوستر دساسی S. de Sacy (۱۸۱۰ء) تھا۔ کیسپری C. P. Caspari (۱۸۴۸ء) کی کتاب الزَّمَخْشَری پر مبنی تھی۔ W. Wright کے ترجمے (۱۸۹۶ء اور بعد کی طباعتوں) کے تیسرے ایڈیشن میں بہت سے اضافے کر دیے گئے۔ D. Vernier (۱۸۹۱ - ۱۸۹۲ء) نے سیبویہ سے استفادہ کیا؛ M. S. Howell (۱۸۸۰ تا ۱۹۱۱ء) نے تمام عرب نحویوں سے اقتباس کیا۔

لغات میں ارتقا کا آغاز Raphelenglus (۱۶۱۳ء) نے کیا - Giggeius نے (۱۶۳۲ء میں فیروز آبادی کی قاموس پر کام شروع کیا)- Golius نے ۱۶۵۳ء میں الجوہری کی صحاح کو اپنے کام کی بنیاد بنایا - E. W. Lane نے تاج العروس کے ضخیم ترجمے کو نئی ترتیب سے ایک شاہکار کی صورت میں پیش کیا (۱۸۸۳ - ۱۸۹۳ء) - لین پول کے تالیف کردہ حصے ۶ تا ۸ کم افادیت کے حامل ہیں اور Belot اور Hava وغیرہ کی عملی لغات جو لسان العرب پر مبنی ہیں لغت نویسی کی آخری کڑیاں ہیں.

دوسرے مرحلے میں یورپی علما نے متون کی جانب بلاواسطہ رجوع اور آزادانہ تجزیے کی مدد سے عربوں کے کارناموں میں اصلاح و اضافے کی کوشش کی - صرف و نحو میں یہ عمل S. de Sacy : (*Kleinere Schriften*، ج ۱ تا ۲، ۱۸۸۶ تا ۱۸۸۸ء) پر H.L. Fleischer کے حواشی سے شروع ہوا - اس کے علاوہ یہ تصانیف خاص اہمیت کی حامل ہیں: Th. Nöldeke: *Zur Gramm. d. klassischen Arabisch*، در *SBAK*، wien ۱۸۹۷ء، ج ۲؛ H. Reckendorf : *Syntaktische Verhältnisse d. Arab.*، ۱۸۹۵ تا ۱۸۹۸ء؛ وہی مصنف: *Arabiche Syntax*، ۱۹۲۱ء؛ C. Brockelmann. : *Grundr. d. vergl. Gramm.*، ج ۲ (۱۹۱۳ء)؛ M. Gaudefroy - Demomby و R. Blachère : *Gramm. de l Arabe Classique*، ۱۹۳۷ء - لغت نویسی کے سلسلے میں عربی تصانیف کا بڑا نقص یہ ہے کہ ماسوا بعض متخصصانہ ذخیرۂ الفاظ اور الفیّومی کی المصباح المنیر کے بعد کے کلاسیکی دور کے لسانی اضافوں کو زیادہ تر نظرانداز کر دیا گیا ہے - G.W. Freytag (۱۸۳۰ تا ۱۸۳۷ء) اور A. de Biberstein-Kazimirski (۱۸۶۰ء) پہلے ہی متون سے استفادہ کرچکے تھے - R. Dozy کی *Supplément* (۱۸۸۱ء)، E. Fagnan کی *Additions* (۱۹۲۳ء) اور ان حواشی کے جو الطّبری کے لائیڈن ایڈیشن (۱۹۰۱ء) میں بڑھائے گئے اور *BGA* کی جلد ۴، ۵، ۸ وغیرہ کے باوجود قرون وسطٰی کی عربی کے الفاظ بھی پورے طور پر منضبط نہیں ہو سکے - I. Krachkovsky، Neustadt و Shusser (۱۹۴۷ء) اور H. Wehr (۱۹۵۲ء) جدید عربی سے بحث کرتے ہیں - بہرحال ابھی کلاسیکی عربی میں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے - بعض اوقات خلا ان حواشی سے پر ہو جاتا ہے جو متون کی طبعات کے ساتھ شامل ہوتے ہیں، مثلاً Nöldeke کی *Delectus* (۱۸۹۰ء) پر A. Müller کے حواشی، المفضّلیات، طبع C. J. Lyall، پر A. A. Bevan کے حواشی (ج ۳، ۱۹۲۴ء)، نیز وہ جو Ch. Lyall نے دیوان عَبِیْد اور عامر بن طُفَیل پر اضافے کیے (۱۹۱۳ء) اور F. Krenkow نے دیوان طفیل اور دیوان طِرِمّاح (۱۹۲۷ء) پر - بیت المقدس کی عبرانی یونیورسٹی نے زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا ایک مجموعۂ لغات تیار کیا ہے - قاہرہ میں A. Fischer کی مرتبہ لغات کو شائع کرنے کی تجویز ہو رہی ہے؛ Nöledcke : *Belegwörterbuch*، طبع از J. Kraemer (جس میں Bevan اور دوسرے لوگوں کے جمع کردہ الفاظ بھی شامل کر دیے گئے ہیں) پر ۱۹۵۲ء میں کام شروع ہو گیا تھا.

(C. RABIN)

(۲) اوائل قرون وُسْطٰی کی عربی :

درسی اعتبار سے عربی ادبی زبان کا معیار تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے زمانے سے معیّن ہو گیا تھا - اس کے صرف، نحو، جملوں کا استعمال، لغات اور محاورات ادبی کی

تعیین منظم اور پر مشقت تحقیق و تدقیق کے بعد واضح طور پر کر دی گئی تھی - اس وقت سے لے کر زمانۂ موجودہ تک اسے ایک مسلسل اور بے روک ٹوک زندگی حاصل رہی ہے، اگرچہ ہر عربی بولنے والے ملک میں روز مرہ کی زندگی کے لیے ایک مخصوص عوامی زبان بن گئی ہے، تاہم لکھنے کے لیے سب لوگ برابر وہی معیاری ادبی زبان استعمال کرتے رہے ہیں .

اسلام کی ابتدائی صدیوں کے علما نے جن کے سر اس مہتم بالشان لسانی معیار کی تعیین کا سہرا ہے، اپنا نقطۂ آغاز قرآن مجید کے متن کو قرار دیا، جو تاریخی لحاظ سے معتبر اور مستند ہے اور اپنی تعریف بطور ایک واضح عربی کتاب کے [کتابٌ عربیٌّ مُّبِینٌ] کرتا ہے اور جس کا انضباط تالیف اور سرکاری طور پر اشاعت پہلی صدی ہجری کے چوتھے عشرے/ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی - احادیث کے مجموعے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے رسائل و خطب، خلفاے راشدین اور صدر اسلام کے مشہور خطبا کے اقوال و خطبات، نیز عربی شاعری کے منتخب مجموعے بھی حوالوں اور ادبی زبان کے تحریری نمونوں کے طور پر کام میں لائے گئے، لیکن ان علما کی سب سے بڑی مساعی زمانۂ جاہلیت کے ادب کو جو اب تک راویوں اور بدویوں کے ذہن میں محفوظ تھا، جمع کرنے، اسے نئی زندگی بخشنے اور اس کی توثیق و تصدیق کی طرف مبذول رہیں - زمانۂ جاہلیت کے آخری ڈیڑھ سو سال کی شاعری، نیز خطبات اور امثال کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کیا گیا، ان کی شرحیں لکھی گئیں اور انھیں محاورات قرآنی کی توضیح کے لیے اور لسانی و ادبی صحت کی سند کے طور پر استعمال کیا گیا .

وہ مفروضہ جس پر اس تعمیری تجدید و تعیین معیار کی عمارت کھڑی کی گئی یہ تھا کہ زمانۂ قبل اسلام اور بعد اسلام کی ادبی زبان یکساں تھی - یہ مفروضہ متعدد تاریخی اور ادبی معلومات کی بنا پر صحیح ثابت ہوتا ہے - قرآن مجید کا دعوٰی یہ تھا کہ اس نے عربوں سے انھیں کی زبان میں خطاب کیا، جیسا کہ ہر مقدس رسالت کے سلسلے میں خداے تعالٰی کا معمول رہا تھا : [وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ (۱۴ [ابرٰھیم] : ۴) یعنی ہم نے کبھی کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اس کے اپنے لوگوں کی زبان میں .

جب عربوں نے قرآن مجید سنا اور اسے سمجھا، تو اس کے ادبی محاسن کے معترف ہوے اور اس کی اعلٰی پائے کی فصاحت نے ان پر بہت اثر کیا (ابن ھشام، قاہرہ ۱۹۱۴ء، ۱ : ۲۰۱، ۲۱۶ تا ۲۱۷) .

زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے مستند ہونے کے لیے جسے تلاش و جستجو سے حاصل کیا گیا، اس کی ترکیب، ساخت، اسلوبِ بیان اور زبان میں قرآن سے مطابقت اور بعد اسلام کی شاعری سے اصول نظم میں مماثلت کے دعوے کی تائید میں بہت سے حوالوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے - ایک اور حقیقت جس پر تاریخی حوالے متفق ہیں یہ ہے کہ جاہلیّت کی شاعری جس شکل میں کہ وہ جمع کی گئی ہے اور ہم تک پہنچی ہے پورے ملک عرب میں پڑھی جاتی تھی اور استحسان کی نظر سے دیکھی جاتی تھی، چنانچہ وہ شاعرانہ زبان جو حیرہ میں بنولَخْم اور شام میں غسانیوں کے درباروں میں سنائی دیتی تھی اور جسے لوگ نجد اور حجاز میں سن کر سراہتے تھے ایک ہی تھی .

اس ادبی زبان کی تشکیل میں اولیت کے دعاوی مختلف قبائل کی جانب سے ہوتے رہے۔ ایک بیان میں جو اسلامی کتابوں میں اکثر مذکور ہوتا ہے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ جاہلیّت کی شاعری کا آغاز بنو ربیعہ میں مُہَلْہِل سے ہوا، پھر وہ قبیلۂ قیس میں منتقل ہوئی جہاں دونوں نابغۃ [الذّبیانی و الجعدی] اور زہیر نے عروج حاصل کیا، اور آخرکار یہ بنو تمیم میں پہنچی اور اسی قبیلے میں یہ ظہور اسلام تک باقی رہی (المُزْہِر، ۲ : ۴۷۶، ۴۷۷) ۔ اس موضوع پر روشنی ان متعدد کوششوں میں تلاش کی جا سکتی ہے جو اس روایت کی توضیح و تشریح کے ضمن میں کی جاتی رہی ہیں کہ ''قرآن مجید سات ''احرف'' (بولیوں یا زبانوں) میں نازل ہوا'' ۔ حضرت ابن عبّاس رضؓ کے نزدیک یہ سات بولیاں بالائی ہَوازن اور زیریں تمیم کی تھیں ۔ اس کا مفہوم یہ لیا جا سکتا ہے کہ ان سات بولیوں کا جو کہ واضح ترین اور فصیح ترین تھیں، ادبی زبان کی تشکیل میں بڑا حصہ تھا (السُّیوطی : الاتقان، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۴۷) ۔ [عربوں کی بولیوں سے مراد ان کے وہ سات مشہور لہجے ہیں جن میں قرآن مجید کے الفاظ کو ادا کیا جا سکتا ہے، اور قرآن مجید کے الفاظ اس بات کے متحمل ہیں کہ انھیں سات لہجوں میں سے کسی ایک میں ادا کیا جا سکے ۔ اس سے نہ تو لفظوں کی بناوٹ اور ساخت میں فرق آتا ہے اور نہ مفہوم و معنی میں کسوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے] ۔

ادبی عربی کے ارتقا اور شیوع کا دوسرا دور اسلام سے شروع ہوتا ہے ۔ اسلام نے شاعری کے دلدادہ عربوں کے سامنے اپنے دعوے کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید پیش کیا ۔ [قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت اور وحی الٰہی ہونے کے باعث] عربوں کے لیے ایک ایسا ہی معجزہ بن گیا جیسا بنی اسرائیل کے لیے ایک عصا کا سانپ میں تبدیل ہو جانا یا بیماروں کو شفا دینا تھا ۔ عربوں کی زندگی، عقیدے اور عملی فلسفے کا انقلاب تمام و کمال اسی قرآن مجید کا رہین منت تھا ۔ اس کے نزول کے آغاز ہی سے مسلمانوں نے اسے حفظ کرنا شروع کر دیا اور اس کی تحریر ان کاتبوں [= کاتبان وحی] کے ہاتھوں ہونے لگی جنھیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کام کے لیے مأمور فرمایا تھا (اَلْجَہْشیاری : الوزراء والکتّاب، طبع سقّا وغیرہ، قاہرہ ۱۹۳۸ء) ۔

عام دستور یہ تھا کہ ہر مسلمان چند آیات (تقریباً دس) یاد کر لیتا تھا اور ان سے آگے نہیں بڑھتا تھا جب تک کہ وہ ان کا مفہوم نہ سمجھ لے اور ان کی تعلیم پر اپنی عملی زندگی میں کاربند نہ ہو جائے (الطَّبری : جامع البیان، ۱ : ۲۷ تا ۲۸) ۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ صحابۂ کرام رضؓ میں سے بعض (مثلاً حضرت ابن عبّاس رضؓ، حضرت ابن مسعود رضؓ، حضرت ابی بن کعب رضؓ اور حضرت علی رضؓ) نے قرآن کی تفسیر میں مہارتِ خصوصی حاصل کر لی ۔ اس طرح ادبی اور لسانی علم کی ایک نئی شاخ قائم ہوگئی جس نے آگے چل کر ادبی عربی کے معیاری بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ۔ [تفصیلات کے لیے رکَ بہ قرآن اور علم القرآن] ۔

اس طرح قرآن مجید اسلام کی پہلی اور اوّلیں ادبی تحریر کا سب سے زیادہ مستند نمونہ بن گیا ۔ برق رفتاری سے پھیلتا ہوا اسلام جہاں جہاں بھی پہنچا، اس ادبی و دینی آئین کو اپنے ساتھ لیتا گیا ۔ ہر مؤمن اسے کلّی یا جزوی طور پر

زبانی یاد کر لیتا ہے اور اپنی ادبی سرگرمیوں میں اس کے اسلوب اور افکار سے متأثر ہوتا ہے۔

قرآن مجید کا ایک پہلو اور بھی تھا جس سے یہ ادبی زبان کی روش ارتقا پر اثر انداز ہوا، یعنی اس کی معجزانہ اور ناقابل سبقت برتری۔ عربوں کے نامور ادیبوں نے اس کے اعجاز بلاغت کے آگے عجز و بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے سر تسلیم خم کیا اور مسلمان صدیاں گزرنے پر بھی اسے ایک ادبی رہنما اور لسانی سند تصور کرتے ہیں۔ فصاحت قرآنی (اعجازالقرآن) کے اسرار و رموز کے مطالعے نے ادبی تنقید کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا اور بہت سا بیش قیمت مواد فراہم کر دیا (دیکھیے محمد خلف اللہ: *Qur'anic Studies as an Important Factor in the Development of Arabic Literary Criticism*، در *Faculty of Arts Bulletin*، اسکندریہ ۱۹۵۳ء)۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ حیات اور اس کے کچھ بعد تک عربوں کی شاعرانہ سرگرمیوں کی جگہ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت نے لے لی۔ بعض مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھنے اور اس کے حسن اسلوب پر غور و فکر کرنے کا ایک بہتر مشغلہ مل گیا اور بعض شام، عراق اور ایران کی جنگوں میں مشغول اسلامی فوجوں میں شریک ہو گئے۔ کچھ عرصے تک فن خطابت، فن شاعری کا جانشین بن گیا۔ ادبی زبان اب بیش از پیش رشد و ہدایت اخلاقی بلندی اور نئے دستور کے لیے وضع قوانین کا ذریعہ بنتی گئی۔ زمانۂ قبل اسلام کی ادبی زبان کے ڈھانچے کے اندر معانی کے نئے نئے رنگ اور ادبی محاورات بننے شروع ہو گئے۔ بقول ابن فارس عربوں نے اپنے ایام جاہلیت میں اپنے آبا و اجداد سے بولیوں، ادب، رسم و رواج اور قربانیوں کے دستور کا ایک ورثہ پایا تھا، لیکن جب اسلام آیا تو حالات بدل گئے۔ قدیم مذہبی عقائد متروک ہو گئے، عادات منسوخ ہو گئیں اور بعض لسانی اصطلاحات ایک معنی سے دوسرے کی جانب منتقل ہو گئیں، اس لیے کہ بہت سی چیزوں کا اضافہ ہوا، احکام عائد کیے گئے اور قواعد مقرر ہوئے۔ ان تغیرات کی مثالیں السیوطی، ابن خالَوَیْہ، الثّعالبی اور ابن دُرَیْد نے دی ہیں (دیکھیے المُزْہر، ۱: ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۱، ۳۰۲)۔

اس طرح ادبی عربی کے ارتقا کے دوسرے دور میں نئے اہم اسباب وعوامل پیدا ہو گئے جن میں سے بعض دینی تھے اور بعض اجتماعی۔ اس دور میں بہت سے ضروری لسانی تغیّرات رونما ہوئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ منظر اب معتدبہ حد تک وسیع تر ہو رہا تھا اور اپنی جگہ بدل رہا تھا۔ عرب اب اپنے ہی جزیرہ‌نما میں محصور نہ تھے، بلکہ اسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی فتوحات کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ جہاں کہیں جاتے تھے اپنے ہمراہ نہ صرف اپنی شستہ و مؤثر زبان رکھنے والی مقدس عربی کتاب قرآن مجید، بلکہ اپنے قبائلی، لسانی خصائص اور اپنا روایتی موروثی ادب (اشعار، امثال، روایات و قصص اور فصیح و بلیغ خطبات) لے کر جاتے تھے جو ان کے حافظوں میں محفوظ تھا۔

یہ فتوحات عربوں کے لسانی اتحاد کا ایک بڑا باعث تھیں۔ بڑی بڑی حملہ آور فوجوں میں سے کئی ایک قبائل کے مخلوط لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی ہوتے تھے۔ اس طرح مفتوحہ شہروں میں قبائلیوں میں بڑے پیمانے پر اختلاط اور باہمی شادی بیاہ ہوتے رہے۔ نئی قائم شدہ بستیوں، مثلاً کوفے میں شمالی اور جنوبی عرب کے عناصر موجود تھے اور اسی طرح نجد اور حجاز کے بھی۔

عرب اب قبائلی مرحلے سے گزر کر شہروں اور ملکوں کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کی معاشرتی وحدتیں اب قبائلی نہ تھیں بلکہ شہری تھیں، جیسے کہ بصرے اور کوفے میں، اور یا علاقائی جیسے کہ شام اور مصر میں۔ عربوں کی اس نئی جماعت بندی سے بولیوں کے اختلافات ضرور کم ہوگئے ہوں گے اور اتحاد کے ان عوامل کو مزید قوت حاصل ہوگئی ہوگی جس کی ابتدا ظہور اسلام سے پہلے ہی ہوچکی تھی۔

ان فتوحات کے ساتھ عربی زبان اب نئے غیر عرب علاقوں میں پھیل رہی تھی۔ وسیع اسلامی سلطنت کے مختلف حصوں میں اس کی رفتار ترقی مختلف رہی؛ بعض ملکوں، مثلاً شام اور مصر میں یہ ملک کی قومی زبان بن گئی اور اب تک ہے۔ دوسرے ملکوں، مثلاً ایران میں یہ چند صدیوں کے لیے ثقافت کی زبان رہی، لیکن زمانہ گزرنے پر اس نے اپنی جگہ مقامی فارسی زبان کے لیے خالی کر دی۔ اپنے ابتدائی مراحل میں اس کی اشاعت اور عرب ممالک میں عوامی زبانوں کے ظہور کی کہانی ایک طویل اور دلچسپ قصہ ہے (دیکھیے شکری الفیصل: المجتمعات الاسلامیة، قاہرہ ۱۹۵۲ء، ج ۲)۔ بعض ممالک میں عربی کی اشاعت اور اسکی قومی زبان بننے میں مختلف اسباب سازگار ہوے۔ شام میں عرب پہلے ہی آباد ہوچکے تھے؛ عربی شاعری کو غسّانی درباروں میں مقبولیت حاصل تھی اور بہت سے باشندے آرامی بولتے تھے جو عربی سے مماثل زبان تھی۔ عراق میں بھی عرب قبائل زمانۂ قبل اسلام سے آباد ہوچکے تھے اور الحیرہ میں ایک عرب سلطنت کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ عراق میں ان علاقوں میں جہاں فارسی زیادہ تر رائج تھی عربوں اور ایرانیوں کی قدیم ہمسائیگی نے فاتح زبان کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ بعض ایرانی بادشاہوں، مثلاً بہرام گور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی پرورش عرب کے درباروں میں ہوئی تھی اور وہ عربی میں شعر کہتے تھے۔ H.C. Woolner (در *Language in History and Politics*) کا قول ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں فارسی پر ایک قوی آرامی رو اثرانداز ہوئی، جس نے عربی کی اشاعت کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اس اثر کی ایک شکل سریانی (شامی زبان) کے ذریعے آئی جسے ایران میں ثقافتی زبان کے طور پر ایک اہم مقام حاصل تھا۔

مصر میں بطلمیوسی زمانے سے یونانی زبان ثقافت، سیاست، نظم و نسق ملکی اور بعد میں کلیسا کی زبان رہی تھی، بحالیکہ وہاں کے باشندوں میں روزمرہ میل جول کے لیے تبادلۂ خیال کا ذریعہ قبطی زبان تھی؛ تاہم کلاسیکی عربی کو سرکاری زبان اور عوامی عربی کو مصریوں کی بول چال کی زبان بننے کا عمل فتح کے بعد ایک صدی کے اندر مکمل ہوگیا تھا۔ مستند علما کا بیان ہے کہ اس عہد کے بعد قبطی زبان مصر کے بیشتر حصوں سے تقریباً مکمل طور پر غائب ہوگئی اور صرف ان عالموں کے پاس باقی رہ گئی جو خاص طور سے اس کے مطالعے کا شوق رکھتے تھے (احمد امین: فجرالاسلام، بار سوم، ص ۲۵۹)۔ اسلام جب شمالی افریقیہ میں داخل ہوا تو اسے وہاں تین زبانیں ملیں: لاطینی جو نظم و نسق حکومت اور ثقافت کی زبان تھی؛ یونانی، لاطینی اور سامی عناصر سے مخلوط ایک زبان جو قرطاجنہ نے ورثے میں چھوڑی تھی، اور اندرون ملک میں بربر زبان۔ شہروں میں عربی نئے دین کی اشاعت اور عرب آبادکاروں کی مسلسل آمد سے رائج عام زبان بن گئی، لیکن اندرون ملک میں بربر زبان اپنے مضبوط مورچوں

پر عربی کے پھیلنے میں مزاحم ہوتی رہی۔

اس طرح یہ فتوحات عربی زبان کو نہ صرف بطور ایک ادبی بلکہ عوامی زبان کے طور پر بھی متعدد مختلف ملکوں میں منتقل کرنے کا ذریعہ بن گئیں۔ جس طرح کہ بہت سے عرب ان ملکوں میں اپنی زبان کو اپنے ہمراہ لے کر نقل وطن کر آئے، اسی طرح بہت سے غیر عرب بھی مقابل سمت میں [یعنی عرب میں] جاتے رہے۔ بہت سے بطور غلاموں اور موالی کے مکے، مدینے، بصرے اور کوفے کے بڑے عرب مرکزوں میں بس گئے۔ قدرتی طور پر انھوں نے عربی کو باہمی میل جول کی زبان کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور ان میں سے بعض نے فصیح عربی میں مہارت حاصل کرکے شاعری اور ادب میں شہرت حاصل کر لی۔ بعض ایرانی موالی کو حجاز کے دونوں بڑے شہروں (مکے اور مدینے) میں اپنی موسیقی اور راگ رنگ کے لیے ایک سیر حاصل زمین مل گئی۔ اس طرح پہلی صدی ہجری/ ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں تمام سلطنت اسلامی میں عربوں اور غیر عربوں میں باہمی اختلاط کی ایک حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ اس حرکت کا نتیجہ ایک عظیم الشان تمدن تھا، جو عربی اسلامی تمدن کے نام سے مشہور ہوا۔ مفتوحہ قوموں کا اس تمدن میں حصہ ثقافت، علم و فن اور نظم و نسق حکومت کے شعبے میں تھا، بحالیکہ خالص عربی حصہ لسانی اور مذہبی میدانوں میں تھا۔ قدیم آرامی اور ایرانی ثقافتوں کی آمیزش سے ایک نیا نمونہ تیار کیا گیا اور اس کی نمائش کا ذریعہ عربی زبان بنی۔ اس طرح خیالات و تصورات کے نئے عناصر نے عربی زبان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ فصاحت اور بلاغت کے نئے احساسات سے اس میں قوت و طاقت پیدا ہوئی اور نئے الفاظ نے اس کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ فارسی کا خاص طور پر سامان تعیش، زیورات، صنعت، فنون لطیفہ، انتظام حکومت اور سرکاری دواوین (رجسٹروں) سے متعلق اصطلاحات کے ادخال میں بڑا ہاتھ تھا۔

(محمّد خلف اللہ)

(۳) وسطی عربی:

عرب سلطنت کی تخلیق سے جو اپنے عروج کے زمانے میں کوہستان پائرنیز (Pyrenees) اور بحر ظلمات (Atlantic) سے لے کر سیر دریا اور دریائے سندھ کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی، عربی زبان کے ارتقا پر دور رس نتائج مرتب ہوے۔ عربی جو اب تک محض عرب اور اس کے نزدیکی ہمسایہ ممالک میں بولی جاتی تھی، مسلمان فوجوں کے ساتھ ساتھ اس وسیع سلطنت کے دور دراز ترین حصوں میں جا پہنچی۔ خیمہ گاہوں اور غزوات کی زندگی نے مختلف قبائل کے لوگوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا اور شہروں میں قبائلی محلوں (خِطَط) کے قرب نے جلد ہی ان کی بولیوں میں مساوات و یکسانیت پیدا کر دی۔ علاوہ ان بولیوں کے بین القبائلی بول چال کی بعض قسمیں بھی موجود تھیں جن میں سے خاص طور پر قابل ذکر خطابت کی زبان تھی جسے قبیلے کا خطیب اپنی تقریروں کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شاعری کی زبان تھی؛ یہ دونوں زمانۂ جاہلیت میں نشو و نما پا چکی تھیں اور اب قرآن مجید کی زبان نے انھیں مزید رونق و وسعت عطا کر دی تھی۔ شاعرانہ زبان میں کچھ مخصوص صفات وزن اور قافیے، لغات، تعبیرات، صنائع و تصوّرات کی پائی جاتی تھیں جو قدیم شاعروں سے ورثے میں ملی تھیں، لیکن اور لحاظ سے بظاہر وہ روزمرہ گفتگو

کی زبان سے زیادہ مختلف نہ تھی - اشعار اب بھی بر موقع فی‌البدیہہ کہے جاتے تھے اور انہیں سمجھنے کے لیے سامعین کو کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی -

یہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر ہی میں ہوا کہ ہمیں حجاز کی عشقیہ شاعری میں بعض نئے لسانی خصائص نظر آنے لگے- ان شاعروں نے جنہیں ان کے ماحول نے اپنے جذباتی تجربات پر غور و فکر کرنے کی فرصت مہیّا کر دی تھی، بدوی شاعری کی رسمی روایات کو اپنے مقاصد کے لیے ناکافی پایا اور انہوں نے نئے اونچے طبقے کے اسلوب گفتگو سے کام لینا شروع کیا جو حجازی بولی اور اقامت پذیر شہری زندگی کی ضروریات سے متأثر ہوئی تھی (دیکھیے Paul. Schwarz : *Der Diwan des 'Umar b. abī Rabī 'a*، ۴ (۱۹۰۹ء): ۹۴ تا ۱۷۲) ۔

نئے صوبوں میں سوا شام کے شاید عربوں کی تعداد مقامی آبادی سے معتدبہ حد تک کم تھی اور اس آبادی کے لوگ اپنی مادری زبان استعمال کرتے رہے، لیکن حکومت سے معاملات میں انہیں اپنے فاتحین کے محاورے کی پابندی کرنا پڑتی تھی، اگرچہ ابتدا میں وہ ایک طرح کی کام چلاؤ زبان ہی استعمال کرتے رہے - پھر وہ غیر مسلم بھی تھے جو جنگوں میں اسیر ہوئے تھے اور جنہیں ان کے عرب آقاؤں کے گھروں اور حرموں میں جگہ دی گئی تھی - ان لوگوں نے بہت جلد عربی کو اپنا لیا اور عام طور پر اسلام قبول کر لیا - ان میں سے بہت سوں یا ان کی اولاد کو غلامی سے آزادی دے دی گئی اور بہ حیثیت موالی (= آزاد کردہ غلام) ان لوگوں نے سلطنت کی اقتصادی زندگی میں، خصوصاً شہروں میں جہاں وہ اکثریت میں تھے، ایک اہم خدمت انجام دی - ان کی زبان میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں، جس کا سبب کچھ تو ان کے آبا واجداد کی زبان کا اثر تھا اور کچھ اپنے عرب مربّیوں اور ہمسایوں کی بولی کا؛ اسی طرح آخر میں ان کے اقتصادی اور معاشرتی ماحول میں تیزی سے رونما ہونے والے تغیرات بھی کار فرما تھے - اس تغیرپذیر زبان کے مختلف محاورات مقامی وسطی عربی بولیوں کے پیشرو تھے، جو مختلف صوبوں کے شہروں میں ادنیٰ طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے - ان کی ایک خصوصیّت تلفظ کی سادگی تھی- حلقی (glottal) وقفے کو حذف کر دیا گیا؛ ''ق'' جس کی آواز بدوی گفتگو میں نکالی جاتی تھی بے آواز ہو گیا؛ زور دار اور بے زور آوازوں اور نیز ضاد اور ظاء کو مخلوط و ملتبس کردیا گیا- ان علاقوں میں جہاں پہلے زیادہ تر آرامی رائج تھی بین‌السنی (interdentals) احتکاکی حروف اپنے متماثل حروف مُطْبَعہ (occlusvies) میں تبدیل ہوگئے، لیکن وسطی عربی کا سب سے زیادہ قابل ذکر خاصّہ آخر کے حروف علّت مقصورہ (یعنی فتحہ، کسرہ و ضمّہ) کی تخفیف اور یکسر فقدان، اور اس کے ساتھ ہی اعراب (desinential inflexion) سے اعراض تھا جس کا نتیجہ زبان کی ساختوں مین اہم تغیّرات کی شکل میں رونما ہوا (J. Cantineau : *Bulletin de la société linguistique*، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲) - اعراب کی تبدیلی کا پرانا طریقہ متروک ہوگیا، نصب، جرّ اور رفع کی حالتوں، ظرفیہ حالت (status) اور افعال کے صیغوں (moods) کی تمیز باقی نہ رہی - ان کا کام اب ترتیب لفظی، مبہم اور تعقیدی (periphrastic) عبارات اور ان دیگر ذرائع سے لینا پڑا جو تحلیلی اور تفصیلی قسم کی زبانوں میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں - وسطی عربی کو فلسطین، شام اور عراق کے عیسائیوں

نے بھی اختیار کر لیا اور مشرقی یہودیوں نے بھی - دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی اور بعد کے زمانے میں یہ لوگ اسے استعمال کرتے رہے، بحالیکہ عرب مسلمانوں میں کلاسیکی عربی بدستور ادبی سرگرمیوں کے اظہار کا ذریعہ رہی - قرآن مجید اور قدیم عربی شاعری کی زبان کو موالی بھی بہ نظر استحسان دیکھتے رہے جو شروع ہی سے عربی زبان کے اونچے معیار سے مطابقت کی کوشش میں رہے، اور پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی ہی سے عربی شاعری میں حصہ لینے لگے تھے (مثلاً زیاد الأعْجَم) . پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں موالی کو کلاسیکی عربی میں کچھ نہ کچھ تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی - اس طرح وہ صرف و نحو کی تعلیم و تعلم کی تحریک کا باعث بن گئے، بحالیکہ خود عربوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ زبان خالص نہ رہے گی - اس طرح انہیں اپنی زبان کی صحت و پاکیزگی کو باقی رکھنے کی ضرورت کا احساس ہوگیا .

جب ایک مرتبہ موالی نے عربی زبان کو اختیار کرلیا، تو کلاسیکی زبان بنوامیّہ کے سقوط کے بعد بھی زندہ رہی اور پوری اسلامی دنیا میں ثقافت اسلامی کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی، نہ صرف ان صوبوں میں جہاں عربی زبان زیادہ تر رائج تھی یا اس کا رواج بڑھ رہا تھا، بلکہ ایسے ملکوں میں بھی جہاں اسے کبھی بھی اپنے پاؤں مضبوطی سے جمانے کا موقع نہ مل سکتا تھا - بصرے اور کوفے کے دبستانوں میں عربیّہ کے قواعد کو ان بدویوں کے محاورات کے مطابق معیاری اور مستند بنایا گیا جن کی زبان کو خالص ترین مانا جاتا تھا - یہ معیاری زبان دربار اور اعلیٰ معاشرے میں مستعمل تھی اور اس میں مہارت تامّہ حاصل کرنا ہر ادیب یا عالم کے لیے مقدم ترین فضیلت سمجھا جاتا تھا - ادبی مقاصد کے لیے اس کے استعمال میں بہت مختلف قسم کے نمونے نظر آتے ہیں - ان تمام تحریروں میں جو عربی اور بدوی زندگی سے متعلق ہیں (مثلاً امثال العرب، ایّام العرب، بلکہ مغازی اور سیرۃ بھی) ایک حد تک قدیم زبان کی سادہ اصلیت اور صنائع و بدائع لفظی سے مبرا سادگی باقی رہی - حدیث اور فقہ کے ادب میں معاشرتی اور اقتصادی تغیرات نہ صرف جملوں کی ساخت بلکہ الفاظ کی ساخت پر بھی اثرانداز ہوے عہد عبّاسی کے ابتدائی دور کے غیر مذہبی نثر نگاروں (مثلاً ابن المُقَفَّع) کی زبان ایک بالکل مختلف نمونے کی ہے - اس زبان پر ان تغیّرات نے جو اسلامی معاشرے میں غیرعرب اقوام کے عروج کے باعث پیدا ہوے، زمانۂ جاہلیت کے ورثے نے اور مشرقی یونانیت (Hellenism) سب ہی نے پورا پورا اثر ڈالا - یہ زبان شستہ، سلیس اور لوچدار ہے اور صحیح طریقے پر اظہار خیالات کے لیے بہت موزوں ہے - اگرچہ اس کے لغات میں بدوی زبان کے الفاظ کی بھرمار نہیں (جیسی کہ أرْجوزہ شاعری میں نظر آتی ہے)، تاہم وہ باثروت اور اظہار مطلب کے قابل ہے اور اس کی نحوی ساخت اسمی اور فعلی شکلوں کی اس بھاری بھرکم اور زائد از ضرورت نشوونما سے بری ہے جو بدوی زبان میں اس قدر نمایاں ہے - یہی استواری اور سادگی اسی عہد کے نام نہاد ''جدید'' (مُحْدث) شاعروں (مثلاً ابوالعتاہیہ) کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہے، اگرچہ بحیثیت مجموعی شاعری میں پرانے نمونوں کی پیروی ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کی جاتی رہی ہے .

اس زمانے کی روز مرہ زندگی کی زبان اور ان بولیوں کے بارے میں جو اسلامی معاشرے کے

مختلف طبقات بولتے تھے ہمیں بہت کم معلوم ہے ۔ دوسری/آٹھویں صدی کے آخر تک لسانی حالات کس قدر پیچیدہ ہوگئے تھے، اس کا کچھ اندازہ ہمیں الجاحظ [رک بآں] کے بعض ملاحظات سے ہو سکتا ہے جو نہ صرف حقیقی بدویوں کی خالص صحیح زبان، شہروں کے قرب اور کسانوں سے میل جول کے باعث اس کی بہ تدریج خرابی، ادنیٰ طبقوں کی عوامی زبان، بساطیوں کی اصطلاحی زبان (cant)، فقیروں کی رمزیہ بولی (= اُرْغہ) اور تجارت اور مختلف پیشوں کی مخصوص اصطلاحات کے بارے میں ہیں، بلکہ ایک طرف غلط تلفظ اور ناقص کلام اور دوسری طرف تکلّف اور تصنع سے متعلق بھی ۔

ان متضاد رجحانات کا اثر تحریری زبان پر جلد ہی ہونے لگا ۔ وہ مترجمین اور علما جنھوں نے یونان کے فلسفے، طب، ریاضیات اور دوسرے علوم کے ترکے کو دنیاے اسلام تک پہنچایا، عربی لغات کے دامن کو اصطلاحات سے بہت حد تک مالا مال کر دیا، لیکن نہ تو عربی صرف و نحو سے بخوبی واقف تھے اور نہ ان میں علمی کمال اور کامل طرز بیان کے حصول کا ذوق ہی پایا جاتا تھا، اس لیے ان کے ترجموں میں عام طور پر وسطی عربی کے بعض خصائص نمایاں ہیں (دیکھیے G. Bergsträsser : *Hunain b. Isḥāk und seine Schule*، لائیڈن ۱۹۱۳ء، ص ۲۸ تا ۵۳) ۔

دولت عباسیہ کے زوال اور تیسری/نویں صدی کے دوران میں ترکی سپاہیوں کے عروج سے تعلیمی معیاروں میں ایک عام انحطاط پیدا ہوگیا، یہاں تک کہ درباری زبان میں بھی اس کی پہلی سی پاکیزگی باقی نہ رہی، بلکہ وہ سوقیانہ ذوق کے باعث بگڑ گئی ۔ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء کے قریب شائستہ محفلوں، قانونی عدالتوں اور مدارس کی بول چال میں کلاسیکی زبان کا استعمال ختم ہوگیا اور وہ ایک ادبی زبان کی شکل میں منجمد ہو کر رہ گئی ۔ اعراب کے نحوی قواعد کی پابندی کو اظہار علمیت اور تکلف کی علامت سمجھا جانے لگا ۔ اس کے ساتھ ہی بدویوں سے گزشتہ گرمجوشی کے احساسات میں کمی ہونا شروع ہوئی اور ان کی زبان کو، جس کی بولیوں میں اس اثنا میں بہت سے تغیرات پیدا ہوگئے تھے، اب عربی کلام کا بہترین نمائندہ تصور نہیں کیا جاتا تھا ۔ کلاسیکی زبان محض سنجیدہ موقعوں پر بولی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال ادب کی قلمرو تک محدود تھا اور ادب میں اس کا استعمال زیادہ تر اسلوب کا ایک مسئلہ تھا ۔ اس وقت سے لے کر اصطلاح عربیّہ کا مفہوم الفاظ، جملوں، صرفی اشکال اور نحوی تراکیب کا ایک نا قابل تغیر نظام ہوگیا جو نحویوں اور لغات نویسوں کے وضع کردہ قواعد کا سختی سے پابند تھا اور جس میں کم سے کم نظریاتی طور پر کوئی اصلاح ممکن نہ تھی ۔ اپنے موضوع کے لیے جو کسی مصنّف کو خود معدودے چند عنوانوں میں سے انتخاب کرنا پڑتا تھا اس فنی زبان کو استعمال کرنے کی غرض سے ان اسالیب میں سے کسی ایک اسلوب کو انتخاب کا اختیار تھا جو قافیہ، وزن، صنائع اور دیگر اقسام تحسین کلام استعمال کرنے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن ایک دفعہ جب وہ اپنے موضوع اور اسلوب کو انتخاب کر لیتا تھا تو پھر وہ روایتی نمونوں کا پابند ہو جاتا تھا (دیکھیے G.E. von Grunebaum : *The Aesthetic Foundation of Arabic Literature*، *Comparative Literature*، ۱۹۵۲ء، ص ۳۲۳ تا ۳۴۰) ۔ یہی وجہ تھی کہ کسی لکھنے والے کے لیے نہ صرف عربی صرف و نحو

اور لغات کی پیچیدگیوں کا پورا علم ضروری تھا، بلکہ اس کے لیے کلاسیکی نثر و نظم کے بہترین نمونوں کا مطالعہ اور انھیں زبانی یاد کرنا بھی لازمی تھا، (اگرچہ یہ سوال کہ کون سے مصنف کلاسیکی حیثیت کے تھے، اکثر گرم مباحثے کا موضوع رہتا تھا) - ان حالات میں عربیۃ کا ایک عالمانہ زبان بن جانا قدرتی بات تھی اور اس لیے عرب اور غیرعرب دونوں ہی اس کے مطالعے میں کوشاں رہتے تھے، بلکہ غیر عرب اقوام نے بعض بہترین نثر نگار پیدا کیے (مثلاً الخوارزمی اور بدیع الزّمان)، اور ماہرین علم لسان (جیسے ابوھلال العسکری) بھی - ادب معلّی سے خواص کا ایک طبقہ ہی مستفید ہو سکتا تھا اور بعض اوقات اس کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہوتی تھی، یا تو خود مصنف کی جانب سے (جیسے ابوالعلاء المعرّی) اور یا اس کے مداحوں کی طرف سے (مثلاً المُتَنَبّی)، تاکہ سامعین اس کا کلام سمجھ سکیں - بعض اوقات عامیانہ چیزوں کو بھی فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا (موشّح اور زَجَل میں) اور یہاں تک کہ ابو دُلَف نے اپنے قصیدۃ الساسانیہ میں فقیروں اور عیاروں کی رمزیہ بولیوں (=اُرْغہ) سے بھی کام لیا - تاہم بحیثیت مجموعی اعلیٰ ادب کی لغات پاکیزہ اور عمدہ قسم کی ہوتی تھی ۔

لیکن یہ بلند معیار صرف شاعری اور مرصّع نثر میں درکار ہوتے تھے- ادب کی اور شاخوں میں زبان اور اسلوب کا بہت تنوع پایا جاتا ہے - اکثر محض دیباچہ مقفّٰی نثر اور چیدہ الفاظ میں لکھا جاتا ہے، بحالیکہ کتاب کے بڑے حصے میں مصنف کی زبان کے وسطی عربی کردار کے آثار نمایاں ہوتے ہیں - عملی مقاصد کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی تھیں ان میں موضوع کی مناسبت سے مخصوص اصطلاحات کا استعمال ضروری تھا - اگر مصنف صرف و نحو کا علم کماحقہٗ نہیں رکھتا تھا تو کلام میں اغلاط کا ہونا لابدی تھا - اس کی بدترین مثال شاید کتاب عجائب الھند مصنّفۂ بزرگ بن شہر یار الرّامُھُرمُزی ہے، جو ۳۴۲ھ/۹۵۳ء کے بعد لکھی گئی (*Le Livere des Merveilles de l' Inde*، طبع P. A.van der Lith و L. M. Devic، لائیڈن ۱۸۸۳ تا ۱۸۸۶ء)، اور جو سوقیانہ باتوں سے لبریز ہے (دیکھیے de Goeje کے ملاحظات، در طبع van der Lith، ص ۲۰۵)، جن میں سے بعض وسطی عربی میں عموماً پائی جاتی ہیں اور بعض غالباً مصنف کی غیر عربی مادری زبان اور اس کے پیشے کے باعث ہیں ۔

ان خلل انداز رجحانات کو سلطنت عباسیہ کے انقراض سے تقویت ملی - ۳۷۵ھ/۹۸۵ء ہی میں المقدسی کو یہ موقع مل گیا کہ وہ دنیائے اسلام کا حال لکھتے وقت ہر ملک کے ذکر میں اس کی لسانی خصوصیات بیان کر سکے - اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سب عربی بولنے والے ممالک میں اونچے طبقوں کے لوگوں کی روزمرہ زبان مقامی بولیوں کی یورشوں کی بدولت خاصی بگڑ چکی تھی، اور یہ کہ سب سے زیادہ صحیح عربی مشرقی (ایرانی) ممالک میں سننے میں آتی تھی جہاں صرف و نحو کے مطالعے کی جانب بہت توجہ کی جاتی تھی ۔

المقدسی کے زمانے ہی میں سامانی خاندان کی بڑھتی ہوئی آزادی کے باعث جدید فارسی ادب کا احیا ظہور میں آ چکا تھا، جس کے نتائج مشرقی ممالک میں عربی کے اسلامی زبان ہونے کی حیثیت کے لیے بہت اہم تھے - عربی بولنے والی دنیا کے باہر سلجوقیوں کی مملکت میں عربی کی جگہ بتدریج جدید فارسی لیتی گئی، نہ صرف دربار، معاشرت، سیاست اور نظم و نسق ملکی کی زبان کی

حیثیت سے ، بلکہ نظم، ادب لطیف، اور ادب کی دوسری غیر مذہبی اور بعد میں مذہبی شاخوں میں بھی - اس کے ساتھ ہی عربی بولنے والے ملکوں میں خود مختار خاندانوں کے عروج کے باعث ان بولیوں کے ارتقا کو جو ان کی مملکت میں رائج تھیں مزید تقویت حاصل ہوگئی اور ادبی اور عوامی زبان میں جو کشمکش پہلے سے موجود تھی اس میں اور اضافہ ہوتا گیا - اس طرح عربی زبان کی اس تصویر میں جو سلجوقی عہد (پانچویں/گیارھویں تا ساتویں/تیرھویں صدی) کے ادب میں منعکس ہوتی ہے، ایک حیران کن پیچیدگی موجود ہے - اس دور میں مرصّع نثر کے ایسے شاہکار بھی نظر آتے ہیں جو بالکل بے عیب زبان میں لکھے گئے ہیں، جیسے مقامات الحریری (م ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء) جن سے صرف اہل ذوق لطف اندوز ہو سکتے تھے - اعلیٰ شاعری میں قدیم نمونوں کا تتبع جاری رہا، لیکن بعض شعرا شاعرانہ انداز بیان کو اپنے ہم عصر لوگوں کے محاکاتی اسلوب کے مطابق بنا کر اس میں ایک جدت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے، مثلاً بہاءالدین زُہَیْر (م ۶۵۶ھ/۱۲۵۳ء) - بعض نے مقامی بولیوں سے بھی کام لیا، مثلاً ابن قُزْمان (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) اور ابن دانیال (حدود ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) - اُسَامَہ بن مُنْقذ (م ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء) نے اشعار رسمی اسلوب ہی میں کہے، لیکن اس کی مشہور توزک [کتاب الاعتبار = انگریزی ترجمہ از Philip k Hitti، نیویارک ۱۹۲۹ء] کا انداز بیان سیدھا سادہ ہے جس میں شام کی بولی کا رنگ جھلکتا ہے - بعض نحویوں نے ان تعبیرات کو قبول کرنے میں جو پہلے صحیح کلام سے خارج سمجھی جاتی تھیں مسامحت برتنا شروع کر دی، بحالیکہ بعض دوسروں، مثلاً ابن یَعیش (م ۶۴۳/۱۲۴۵ء) (دیکھیے دیباچہ از G. Jahn، ۱ : ۱۰ تا ۱۲ میں) نے ایک ایسے بھونڈے اسلوب میں لکھنا شروع کر دیا جس میں نحو کے ان قواعد و اصول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جن کی وہ خود تشریح و تلقین کر رہے تھے - معمولی نثر میں صرف و نحو کی خلاف ورزیاں بطور قاعدۂ کلیہ کے پائی جاتی ہیں، نہ کہ بطریق استثنا؛ شہادت کے لیے دیکھیے یاقوت (م ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) (طبع Wüstenfeld، ۵ : ۵۸ تا ۶۵ اور اَلْقَزوینی (م ۶۸۲ھ/۱۲۸۳ء) (طبع Wüstenfeld جلد ۲ و ۹) - جو کتابیں عربی بولنے والے ممالک کے باہر لکھی گئیں ان سے بعض اوقات یہ مترشّح ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین کو زبان پر پورا عبور نہ تھا - ایرانی (اور بعد میں ترکی) مصنفین مثلاً ابن المُجاور (م ۶۹۰/۱۲۹۱ء) (دیکھیے Löfgren : *Arab. Texte zur Kenntnis der Stadt Aden im Mittelalter*، ۲/۲ : ۲۱) تذکیر و تانیث کے فرق، جنس کی عدد سے مطابقت اور ال تعریفی سے متعلق قواعد کو نظر انداز کر دینے کی جانب مائل تھے - ان کے علاوہ کچھ اور تصانیف سوقیانہ خصائص رکھتی ہیں، جیسے رزمیہ افسانے (مثلاً سیرۃ عَنتر: سیرۃ بنی ہلال)، مغازی کے قصے (مثلاً از ابوالحسن البَکْری، حدود ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) اور مذہبی حلقوں کی صوفیانہ نظمیں، جن کا مقصد درمیانی اور نیچے کے طبقات کی اخلاقی اصلاح اور تفریح طبع تھا اور اس لیے کسی حد تک عوامی زبان اور اسلوب میں لکھی گئیں - اسی قسم کی عامیانہ چیزیں دُروز کی تحریروں میں بھی پائی جاتی ہیں (دیکھیے de. Sacy : *Chrestomathie Arabe*، ۲ : ۲۳۶، حاشیہ ۹، وغیرہ) اور اسی طرح یزیدیوں کی مذہبی شاعری میں

(دیکھیے R. Frank : *Adi*، *Scheich*، ص ۱۰۷ ببعد) ۔ قدرتی طور پر دوسرے مذاہب کے مصنفین، مثلاً عیسائیوں اور یہودیوں (دیکھیے J Friedlaender : *Der Sprachgebrauch der Maimonides*، ج ۱، فرنکفرٹ، *a. M.* ۱۹۰۲ء) اور سامریوں (Samaritans) (دیکھیے ابوالفتح *Annales Samaritani*، طبع E. Vilmar، ۱۸۶۵ء) کا عربوں کی ادبی روایات میں کوئی ہاتھ نہ تھا ۔ اگرچہ اور لحاظ سے ابن مَیْمون (Maimonides) کی طرح کے لوگوں پر اسلامی ثقافت کا کافی گہرا رنگ چڑھ گیا تھا، لیکن اس سے قبل کہ ان ممالک میں ادبی عربی کے ارتقا کی وضاحت کی جا سکے ۔ ابھی فرداً فرداً مصنفین کی زبان کے بارے میں مزید تحقیقات ضروری ہیں اس طرح کے مطالعے کے لیے مصنفوں کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے یا کم سے کم ہم عصر مخطوطات کو پڑھنا ضروری ہوگا، کیونکہ جو طبعات ہمارے پاس موجود ہیں مشرقی طابعین نے غالباً ان کی تصحیح نہیں کی ہے (دیکھیے August Müller، اس کی ابن ابی اُصَیْبعہ کی طبع کے دیباچے میں، Königsberg ۱۸۸۴ء، VII تا VIII) اور یا یورپی مؤلفین محققین نے، دیکھیے الفاسی : جامع الالفاظ طبع S.L. Skoss کا دیباچہ ج ۱، ۱۹۳۶ء، ص CXL تا CXLIII) ۔

مغولوں کے حملوں سے ایشیائی ممالک کی بربادی کے بعد ادبی عربی کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔ مصر کا عروج ہوا اور مملوکوں کے عہد حکومت (۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) میں وہ ثقافت اسلامی اور ادب عربی کا مرکز بن گیا ۔ ان صدیوں میں ادبی زبان مابعد کلاسیکی تھی ۔ نثر نگار، جیسے ابن ابی اُصَیْبعہ (م ۶۶۸ھ/ ۱۲۷۰ء)؛ دیکھیے August Müller : *Über Text und Sprachgebrauch in as Geschichte der Arzte Ibn abi Uṣaibi*، *Sitz Ber Bayr. Ak. d. Wiss* ۱۸۸۴ء، ص ۸۵۳ تا ۹۷۷) روزمرہ زبان کی جیسے کہ وہ اس زمانے میں اچھے طبقے میں بولی جاتی تھی، نمائندگی کرتے ہیں؛ بعد کے مصنفین جیسے ابن ایاس (حدود ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء؛ دیکھیے P. Kahle اس کی طبع کے دیباچے میں، ج ۴، ۱۹۳۱ء، ص ۲۶ تا ۲۸) اور ابن طُولُون (حدود ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء؛ دیکھیے R. Hartmann : *Das Tübinger Fragment der Chronik des Ibn Tūlūn* ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۳) الفاظ تک میں مقامی بولی سے اور بھی زیادہ اثر پذیر ہوئے ہیں ۔ بعض دوسروں جیسے امیر بیکتاش الفاخری (حدود ۷۴۱ھ/۱۳۴۱ء؛ دیکھیے K. V. Zetterstèen : *Beiträge zur Geschichte der Mamlukensultane* لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱ تا ۳۳) کے اسلوب سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی مادری زبان ترکی تھی ۔ شاعری میں بعض اوقات عوامی بولی سے کام لیا جاتا تھا، جیسے کہ ابن سُودُون (م ۸۶۸ھ/ ۱۴۶۴ء) نے اپنی مزاحیہ اور طنزیہ نظموں میں لیا ہے ۔

ان عظیم انقلابات نے جو دنیا میں نویں/ پندرھویں صدی کے آخر سے ظہور میں آئے، ادبی عربی پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں غرناطہ کے ہاتھ سے نکل جانے اور مسلمانوں کے اخراج کے بعد عربی جزیرہ نمائے آئی بیریا (Iberia) سے غائب ہوگئی ۔ المغرب میں جہاں کلاسیکی زبان کا ہمیشہ سے مقامی بولیوں سے بڑا اختلاف رہا تھا، مؤخرالذکر میں سے ایک نئی شاعرانہ زبان کا ظہور ہوا جو مَلْحُون کے نام سے موسوم ہے اور جسے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے مرّاکش میں روزافزوں مقبولیت

حاصل رہی ہے۔ دیگر عربی بولنے والے ملکوں کو رفتہ رفتہ عثمانی سلاطین نے زیر کر لیا جنھیں عربی زبان اور اس کے ادب کے ارتقا سے دراصل کوئی دلچسپی نہ تھی، یہاں تک کہ مصر میں بھی، جو اب تک عربی ثقافت کا پشت پناہ رہا تھا، ادبی سرگرمی اپنی انتہائی پستی کو پہنچ گئی۔ ادبی عربی ایک مخصوص طبقے کا امتیاز بن کر رہ گئی۔ عوامی بولی کو بعض اوقات لوگ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے (مثلاً الشِّرْبِیْنی، حدود ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء نے اپنی هَزُّالقُحُوف میں)۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی ہی میں مقامی زبان میں نظمیں لکھی جانے لگی تھیں (دیکھیے M.U. Bouriant : *Chansons populaires arabes*، پیرس ۱۸۹۳ء؛ فؤاد حسنین علی : *Agyptische Volkslieder* ج ۱، ۱۹۳۹ء)۔ شام میں مارونی اسقف جَرْمانوس [ابنِ] فَرْحات (م ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء) نے اپنے ہم وطنوں میں عربی صرف و نحو، علم لغات اور بلاغت کے مطالعے کے احیا کے لیے بہت کچھ کیا۔ عربی ممالک سے باہر علما عربی زبان کو استعمال کرتے رہے، خصوصاً دینیات، فقہ اور اسی نوع کے اور موضوعات کے لیے، لیکن اگرچہ اب تک اس کے حلقۂ اثر میں شمالی اور مشرقی افریقیہ کے بعض حصے، زنجبار، ملایا اور مجموعۂ جزائر انڈونیشیا بھی شامل ہو چکے تھے، تاہم گزشتہ عہد کی نسبت اس کا رسوخ اب کم ہوگیا تھا۔ اس جمود اور انحطاط کا زمانہ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے شروع تک جاری رہا۔

مآخذ : مآخذ متن مقالہ میں مذکور ہو چکے ہیں، کلاسیکی اور مابعد محاورے کے متعلق عربی متون کی طبعات کے دیباچوں اور صرف و نحو کی اور لغات کی کتابوں میں بہت سے ملاحظات موجود ہیں، بالخصوص (۱) H.L. Fleischer : *Kleinere Schriften*، ج ۱ تا ۳، لائپزگ ۱۸۸۵ء تا ۱۸۸۸ء؛ (۲) Th. Nöldeke : *Zur Grammatik des classischen Arabisch*، ۱۸۹۶ء؛ نیز دیکھیے؛ (۳) J. Fück : *Arabiya, Untersuchungen zur arabischen Sprach und Stilgeschichte*، برلن ۱۹۵۰ء (عربی ترجمہ از عبدالحلیم النجّار، قاہرہ ۱۹۵۱ء؛ فرانسیسی ترجمہ از C. Denizeau، ۱۹۵۵ء)۔

(J.W. Fück)

(۴) **جدید کتابی عربی** : عرب دنیا کے زاویۂ نظر میں یورپ کی دخل اندازی نپولین کی ۱۷۹۸ء کی مصری مہم سے شروع ہوتی ہے۔ مغربی تمدن کے بے شمار عناصر کو اپنا لینے سے عربی اسلوب پر دور رس اثرات ہوے۔ یہ عمل محمّد علی پاشا کی اصلاحات کے لائحۂ عمل سے شروع ہو چکا تھا جس میں بالارادہ مغربی اسلوب کو اختیار کرنا شروع کیا گیا اور جس کا مرکز توجہ فرانس تھا، جو ہر جگہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد تک ایک مثالی نمونہ مانا جاتا تھا۔ طلبہ کی جماعتوں کی فرانس میں درس و تعلّم کے لیے روانگی، مدارس کی یورپی اصولوں پر تاسیس اور ایک عربی مطبع (press) کے قیام اور سب سے بڑھ کر بکثرت یورپی کتابوں کے تراجم کے نتیجے میں بے شمار مغربی خیالات کے اظہار کے لیے تعبیرات کی ضرورت پہلے مصر میں اور پھر دوسرے ملکوں میں بھی محسوس کی جانے لگی، یعنی ان غیر ملکی خیالات کے لیے جن کے متعلق پہلے صرف غیرملکی الفاظ ہی مل سکتے تھے۔ مصر سے شروع کے مترجمین جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر الطَّحْطاوی (۱۸۰۱ تا ۱۸۷۳ء) تھا (دیکھیے Brockelmann، ۲: ۴۸۱؛ تکملہ، ۲: ۷۳۱؛ W. Braune، در *MSOS*، ۳۶/۲: ۱۱۹ تا ۱۲۵؛ J. Heyworth-Dunne، در *BSOS*، ۹: ۹۶۱ تا ۹۶۷؛ ۱۰: ۳۹۹ تا ۴۱۵) کی تصانیف

میں بھی، متعدد غیر ملکی الفاظ کے پہلو بہ پہلو جنھیں بلا کسی تمیز کے لے لیا گیا ہے، مغربی تصوّرات کو ادا کرنے کے لیے خالص عربی جدید (نوساختہ) کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔

تاہم زائد از ضرورت غیر ملکی الفاظ کے بکثرت استعمال کے برخلاف صحیح معنوں میں کوئی تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے شروع نہیں ہوئی ۔ یہ مسئلہ کہ عربی میں نئی تعبیرات کی روز افزوں ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے، فکری زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ۔ خود یورپ کے اختلاط سے عربوں میں صدیوں کے وقفے کے بعد اپنی لسانی اور ادبی روایات پر نظر ثانی کرنے کا جذبہ بیدار ہوگیا ۔ قدیم ادبی تصانیف بالخصوص عربی لغات اور کتب صرف و نحو کی طباعت سے بہت سی قدیم روایات کے احیا میں سہولت پیدا ہوگئی ۔ یہ عقیدہ، کہ عربیہ بحیثیت عربی زبان کی قدیم ترین ادبی شکل کے کسی بھی بعد کی شکل سے بہتر اور زیادہ صحیح تھی، اور اس بنا پر عصر حاضر میں بھی صحت لسانی کے لیے اسی کو اعلیٰ ترین سند ماننا چاہیے، پوری لسانی تحریک کا رہنما خیال بن گیا، اگرچہ اس کے خلاف بھی کچھ آوازیں بلند ہوئیں ۔ اس طرح قدیم لغت و اسلوب کا دوبارہ احیا ہوا اور ساتھ ہی اس رجحان کا کہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو، قدیم مثالی زبان سے رجوع کرکے ارتقائی زبان کو مصنوعی طریقے سے قابو میں رکھا جائے ۔ اس تحریک کا آغاز شامی اور لبنانی علاقے میں ہوا ۔ زبان کے سب سے پہلے ناقدین میں نمایاں ابراہیم [بن ناصیف] الیازجی (۱۸۴۷ تا ۱۹۰۶ء؛ Brockelmann : تکملہ، ۲ : ۷۶۶) تھا، جس نے اپنے زمانے کے صحافیوں کی زبان پر اپنی کتاب لغة الجرائد (قاہرہ ۱۳۱۹ء) میں نکتہ چینی کی ۔ [یہ سلسلۂ مضامین بصورت مقالات الضیاء میں شائع ہوتا رہا، بعد میں مقالات کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا]۔ فصیح عربی کے دلدادگان کی خواہشات کی رو سے عربیّة کی لابدی تجدید اور اس کی لغات کی توسیع کو الفاظ، اصول اور اشکال کے اس سرمائے پر جو خود عربیہ میں موجود ہے، انحصار کرکے بروے کار لانا چاہیے ۔ یہ سوال کہ تفصیلی طور پر کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور یورپی الفاظ کو کس حد تک استعمال کیا جائے، بار بار معرض بحث میں آتا رہا ہے ۔ تقریباً سب جرائد میں بے شمار مضامین اور بعض علٰحدہ اشاعات میں ٹھیک آج تک بھی بکثرت نوساختہ الفاظ تجویز کیے جاتے رہے ہیں، اگرچہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان میں سے بہت کم عام محاورے میں داخل ہو سکے ہیں ۔ مخصوص ماہرین لسان کے حلقے سے بہت آگے نکل کر اس تحریک نے عام تعلیم یافتہ لوگوں کے بڑے بڑے حلقوں کو بھی متأثر کیا ہے ۔ فنی مصطلحات سے کشمکش ہر فنی یا علمی شاخ کے متخصّصین کے لیے ایک دشوار مسئلہ ہے اور ان میں سے بہت سوں کے لیے از خود لسانی تخلیق اور خود ساختہ اصطلاحات کو شائع کرنے کا محرّک بن جاتا ہے ۔ اس موضوع پر عربی میں جو مضامین لکھے گئے ہیں، وہ تعداد میں بہت زیادہ اور متفرق ہیں اور ان سے یہاں صرف عام طور پر بحث کی جا سکتی ہے ۔ مخصوص میدانوں کے لیے مصطلحات کے بڑے بڑے مجموعے موجود ہیں (جن میں سے چند ایک خاص طور پر قابل ذکر ہیں، احمد عیسٰی : مُعْجَم اَسْماء النّبات، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ امین المَعْلُوف : مُعْجَم الحَیَوان، قاہرہ ۱۹۳۲ء؛ مصطفٰی الشّہابی : مُعْجَم الالفاظ الزِّراعِیّة، دمشق ۱۹۴۳ء؛ محمد اشرف : English

Arabic Dictionary of Medicine, Biology and allied Sciences، بار دوم، قاہرہ ۱۹۲۹ء، لیکن اس نوع کی تصانیف کا دائرہ صرف ان تعبیرات کی فہرستیں دینے تک محدود نہیں جو پہلے ہی سے استعمال ہو رہی ہیں، بلکہ ان میں خود اپنی طرف سے تجویز کردہ چیزیں بھی پیش کی گئی ہیں ۔ اس لیے انہیں بیانیّہ علمی مواد تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان میں اصطلاحات کے لیے وافر سرمایہ موجود ہے ۔ ان کوششوں میں باہمی تعاون اور مفاہمت پیدا کرنے اور لغات کو معیاری بنانے کے لیے لسانی اداروں کی تأسیس کا خیال گزشتہ صدی کے آخری بیس سالوں میں شروع ہوا تھا (دیکھیے Braune، محل مذکور، ص ۱۳۳) ۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک علمی ادارہ ''المجمع العلمی العربی'' کے نام سے قائم کیا گیا، جس نے زبان کی اصلاح کی جانب بھی توجہ کی اور زبان کے مسئلے کے بارے میں بہت سے مضامین اپنے تبصروں میں شائع کیے جو پہلے ۱۹۲۱ء میں نکلے ۔ ۱۹۳۶ء میں مصر کی Royal Academy of the Arabic Language (جو اب ''مجمع اللغة العربیّة'' کے نام سے موسوم ہے) وجود میں آئی ۔ قدیم زبان اور ادب کے مطالعے کے علاوہ اس کا بڑا کام جدید لغات کی تنظیم اور توسیع ہے ۔ اپنے رسالے (مجلّة مجمع اللغة العربیه، ج ۱ تا ۷، ۱۹۳۴ تا ۱۹۵۳ء) اور ۱۹۴۲ء سے لے کر خاص اشاعات کے ایک سلسلے میں بہت سی مصطلحات کے استعمال کی سفارش کی گئی ہے ۔ تاہم اب تک وہ نتیجہ حاصل نہیں ہوسکا جس کی توقع اور خواہش تھی ۔ وہ رسمی اصول جن پر یہ ادارہ عمل پیرا ہے، اس کے جلسوں (محاضر، ۱۹۳۶ء سے) کی روئداد سے بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔ عراق میں بھی جہاں اس سے پیشتر آنستاس الکَرْمَلی [(۱۸۶۶ تا ۱۹۴۷ء)] کا رسالہ لغةالعرب (ج ۱ تا ۹، ۱۹۱۱ تا ۱۹۳۱ء) صفائیہ (زبان و اسلوب کو پاک اور صاف رکھنے کی تحریک) کے رجحان کا سرکردہ ترجمان تھا ۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اور ادارہ ''المجمع العلمی العراقی'' قائم ہوگیا جو علاوہ اور باتوں کے اختراع اصطلاحات کے مسائل کی طرف بھی توجہ کرتا ہے، لیکن فنی اور علمی موضوعات کے لیے معیاری اصطلاحات کے معاملے میں ان سب سرکاری کوششوں کو جس حقیقی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ نئی تعبیرات کے وضع کرنے میں نہیں، بلکہ متعلّقہ متخصّصین میں ان کے عام استعمال کے حصول میں پیش آتی ہے ۔ اگرچہ نئی وضع کردہ اصطلاحات کو متخصّصین کے دائرے میں مقبول بنانے کے امکان کا اندازہ بڑھا چڑھا کر کیا جا سکتا ہے، تاہم تحریک صفائیہ کے حقیقی محاورۂ زبان پر عملی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ بہت سی انفرادی مثالوں میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح مصنوعی طور پر ساختہ الفاظ جلد ہی صحافیوں اور مصنفوں کے عام سرمایۂ الفاظ میں داخل ہوگئے ہیں، لیکن صفائیت پسندوں کی مساعی تقریباً ایک لفظ منفرد پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں، یعنی زبان کے خارجی عناصر پر ۔ اگر لسانی حقائق کی جانب توجہ کی جائے تو نمایاں امتیاز انگریزی اور فرانسیسی الفاظ و عبارات کا زبان میں سرایت کر جانا ہے، جن کا عربی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے (نام نہاد مستعار ترجمہ ، نیز اندرونی شکل کا تغیر، مخصوص طور پر ابلاغ عامہ کے وسائل (ریڈیو اور صحائف) اور ایسے لکھنے والوں کی زبان میں، جنھیں کلاسیکی تعلیم بہت کم یا بالکل نہیں ملی، ایک بیّن یورپی رنگ نظر آتا ہے

تعبیرات اور اسلوب پر پابندی لگانا مصطلحات پر قیود عائد کرنے کی نسبت بہت زیادہ مشکل ہے، لہٰذا اس نوعیت کا ارتقا لابدی ہے اور اسے بطور ایک حقیقت کے تسلیم کر لینا ضروری ہے ۔ ادب لطیف کے میدان میں تاہم اس کے بر خلاف ہمیں بہت سی صورتوں میں روایت سے ایک مضبوط تعلّق نظر آتا ہے ۔ جن مصنفوں کو کلاسیکی تعلیم ملی ہے، وہ آج بھی اپنے اسلوب نگارش میں عربیّت کے مطمح نظر کے قریب رہنے کی قدرت رکھتے ہیں ۔ وہ بعض اوقات قدیم ادب اور خصوصًا قرآن مجید کے غیر مانوس الفاظ اور جملے بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں ۔ تاہم یورپی اسلوب کے اثر سے کوئی بھی مکمل طور پر نہیں بچ سکتا ۔

لیکن برخلاف اس کے صرف و نحو میں جس کی تعریف و تعیین قواعد سے ہو سکتی ہے اور جو ارادی نظم و ضبط کے زیادہ ماتحت ہے، ایک بالکل مختلف تصویر نظر آتی ہے ۔ تحریری زبان پر تعبیرِ صوتی کا بالکل کوئی اثر نہیں ہوا اور علم الصرف قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک بجنسہٖ قائم رہا ہے ۔ یہی چیز نحو کے بارے میں بھی صحیح ہے، کم از کم اس کے بنیادی پہلوؤں میں ۔ یہاں عربیہ سے قدامت پسندانہ الفت حیران کن طور پر مؤثر ثابت ہوئی ہے ۔

لغات میں ایک معتد بہ بنیادی سرمایہ قدیم ترین زمانے سے محفوظ رہا ہے ۔ مابعد کلاسیکی الفاظ جن میں مؤخرتر قرون وسطٰی کے الفاظ بھی شامل ہیں، جدید لغات کے ایک عنصر کی تشکیل کرتے ہیں ۔ ان خیالات کے اظہار کے لیے جو یورپ سے آئے ہیں، ایک بڑی تعداد ایسی تعبیرات کی موجود ہے جنہیں عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور جن میں سے بیشتر صفائیت پسندوں کی مذکورۂ بالا خواہشات سے پوری مطابقت رکھتی ہیں ۔ عربیّہ کے فراموش شدہ الفاظ کو از سر نوزندہ کر دیا گیا ہے اور انہیں بغیر کسی رسمی تبدیلی کے، لیکن کم و بیش بدلے ہوئے مفہوموں میں استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً قطار = اونٹوں کی قطار جو ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے کیے گئے ہوں، اب ریل گاڑی کے لیے مستعمل ہے) ۔ عربیہ کے ان الفاظ کو جواب تک استعمال میں ہیں، نئے اور زائد معنی دے دیے گئے ہیں (مثلاً برق = آسمانی بجلی، اب نیز بمعنی تار برقی) ۔ بعض دفعہ معنوں کے تغیر میں اس اجنبی لفظ سے مماثلت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جس نے نمونے کا کام دیا تھا (مثلاً صُنْدُوق = بکس، اب نیز بمعنی نقدی کا بکس، نقدی کا دفتر، فرانسیسی لفظ caisse کے تتبّع میں) ۔ علاوہ ازیں ایک بڑی تعداد ایسی اشکال اسمی کی جنہیں پرانی اصلوں سے عربی کے اسمی صیغوں (زیادہ تر مَفْعَل ،مَفْعَلَه مِفْعَل، مِفْعَله اور فعّال، فعّاله) کے اوزان پر بنایا گیا ہے، عام طور پر رائج ہو گئی ہیں (مثلاً مَتْحَف = عجائب گھر؛ نَفّاثة = جیٹ jet ہوائی جہاز) ۔ اسی طرح اسم مصدر اور اسم فاعل کی شکلوں کو نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے (مثلاً اِذاعة = نشر و اشاعت (broadcasting)؛ مُحَرِّک = موٹر) ۔ یائے نسبتی کو وسیع پیمانے پر نئے الفاظ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً اشتراکی = سوشلسٹ، اشتراکیت = سوشلزم) ۔ اس کے استعمال کو وسعت دے کر اسما سے بہت سے اسمائے صفات مشتق کیے گئے ہیں ان کے ذریعے یورپی ترکیبوں کو آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے (مثلاً البَرِیْد الجَوّی = ہوائی ڈاک) ۔ اصلی مرکب شکلیں اب تک بھی لائے

نفی کے ساتھ مرکب الفاظ تک محدود ہیں (مثلاً لاسلکی = وائرلس (wireless) - پہلی عالمگیر جنگ تک اکثر الفاظ فرانسیسی سے مستعار لیے جاتے تھے اور بعض اطالوی سے - پہلی عالمگیر جنگ کے بعد انگریزی کا اثر بھی نمایاں ہوا، خصوصاً مصر اور عراق میں - عربی میں اجنبی الفاظ کی قلت فصیح زبان کے شیدائیوں کا شاندار کارنامہ ہے - اس صدی کے آخری عشروں میں ترکی الفاظ تقریباً مکمل طور پر غائب ہوگئے ہیں - ایسے الفاظ کو، جو عربی اسم مصدر سے مطابقت رکھتے ہیں یا جنھیں بآسانی اس میں جذب کیا جا سکتا ہے، مستعار الفاظ تصوّر کیے جا سکتے ہیں (جیسے بَنک - بُنُوک، فِلم - اَفْلام، دکتور - دکاتره)، یا جنھیں آخر میں یّہ کے اضافے سے جو اسم معنی کے آخری حصے (abstract ending) کا کام دیتا ہے، عربی الفاظ سے مماثل بنا لیا گیا ہے، مثلاً دیمو قراطیه = democracy) .

یہ متعدد نئے الفاظ جنھیں قبول کر لیا گیا ہے، ابھی تک ناکافی ہیں - خاص علمی اور فنی جزئیات آج تک بھی عربی میں کسی ایسی شکل میں پیش نہیں کی جاسکتیں جسے سب متعلقہ لوگ سمجھ لیں؛ کسی ایک ملک میں بھی مخصوص فنی مصطلحات وضع کرنے کا باقاعدہ نظام موجود نہیں ہے - صورت حال اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر افہام و تفہیم کی غرض سے متخصّصین لاطینی اور یونانی کی جن اصطلاحات سے مدد لیتے ہیں، ان کا عربی میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے - ایک ہی چیز کے لیے کئی اصطلاحات رائج ہیں - دوسری طرف ایسی صورتیں بھی ہیں کہ ایک ہی اصطلاح سے مختلف مصنفین مختلف معانی اخذ کرتے ہیں، تاہم علمی و فنی اصطلاحات کو معیاری بنانے کا کام جو آج کل کی عربی زبان کا بنیادی مسئلہ ہے، خاصی ترقّی کر چکا ہے اور اس طرح مستقبل میں ہمیں مزید تسلّی بخش اور حسب دلخواہ نشوونما کی توقع ہو سکتی ہے .

یہ حقیقت کہ سب عرب ملکوں میں عراق سے لے کر مرّاکش تک ایک بنیادی طور پر یکساں تحریری زبان موجود ہے، عرب اقوام کے لیے بڑی فکری اور عملی قدر و قیمت رکھتی ہے - یہ ان کی قدیم ثقافتی یکجہتی اور زمانۂ موجودہ میں ان کی سیاسی وحدت کی علامت ہے - اس طرح ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس چیز کا پہلے سے گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ کہیں بھی تحریری زبان کی جگہ کوئی مقامی بولی لے لے گی اور اسے عملی استعمال سے خارج کر دیا جائے گا .

مآخذ : (۱) W. Braune، در *MSOS* /۳۶ ۲ : ۱۳۰ تا ۱۴۰؛ (۲) H. Wehr، مجلۂ مذکور، /۳۷ ۲ : ۱ تا ۶۴ اور *ZDMG*، ۹۷ : ۱۶ تا ۴۶؛ (۳) D. V. Semyonov : *Sintaksis sovremennogo arab-skogo yazyka*، ماسکو - لینن گراڈ ۱۹۴۱ء؛ (۴) Brockelmann : تکملہ، ۳ : ۵ تا ۷؛ (۵) J. Fück : *Arabiya*، ۱۴؛ (۶) R.B. Winder و F.J. Ziadeh : *An Introduction to Modern Arabic*، پرنسٹن ۱۹۵۵ء؛ (۷) Ch. Pellat : *Introduction à l'arabe moderne*، پیرس ۱۹۵۶ء، کتب لغات اور علم لغت سے متعلق اہم ترین تصانیف : (۸) Ch. K. Baranov : *Arabsko-Russkiy solvar*، ماسکو - لینن گراڈ، ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۶ء (مع دیباچہ از Kratchkovskiy، مزید حوالوں کے ساتھ)؛ (۹) L. Bercher : *Lexique Arabe-Français*، طبع دوم، الجزائر ۱۹۴۴ء (تکملہ)؛ (۱۰) M. Brill، D. Neustadt اور P. Schusser : *The basic word list of the*

Arabic Daily Newspaper، یروشلم ۱۹۴۰ء؛ (۱۱) Elias : Modern Dictionary Arabic-English، طبع چہارم، قاہرہ ۱۹۴۷ء؛ (۱۲) D. Neustadt و P. Schusser : Millōn 'Arabī-'Ibrī، یروشلم ۱۹۴۷ء؛ (۱۳) Ch. Pellat : L'arabe vivant، پیرس ۱۹۵۲ء؛ (۱۴) H. Wehr : Arabisches Wörterbuch für die Schriftsprache der Gegenwart، لائپزگ ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۶ء؛ [(۱۵) وہی مصنف: A Dictionary of Modern Written Arabic، طبع J. Milton Cowan، Wiesbaden ۱۹۶۶ء].

(H. Wehr)

(۳) مقامی بولیاں

(۱) عام تبصرہ

آج بھی عربی بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ کے لگ بھگ ہے، جو ایشیائے قریب سے لے کر شمالی افریقیہ تک اور خلیج فارس سے لے کر بحر ظلمات تک آباد ہیں۔ عرب ممالک یہ ہیں: عرب مع "ہلال زرخیز" (Fertile Crescent) سے لے کر ایرانی اور ترکی سرحدوں تک، مصر اور سوڈان کا بیشتر حصہ (دریائے نیل سے لے کر شاد (= چاڈ) تک)، طرابلس الغرب، تونس، الجزائر اور مرّاکش؛ موریتانیا فرانسیسی مغربی سوڈان اور صحرائے شمالی۔ اس متصل و مسلسل جغرافیائی علاقے کے علاوہ بعض الگ تھلگ منطقے بھی ہیں: افریقہ میں جبوتی اور زَنجبار؛ یورپ میں مالٹا (پہلے مع جزائر بالیار، صِقلیہ اور Pantellaria اٹھارھویں صدی عیسوی تک)، اندلس (پندرھویں صدی عیسوی تک)۔ آخر میں ان شامی لبنانی، منتشرآبادیوں کی جانب بھی توجّہ دلانا ضروری ہے جو شمالی اور جنوبی امریکہ میں اور فرانسیسی مغربی افریقیہ میں پائی جاتی ہیں۔

اس جغرافیائی رقبے کی حدود کے اندر جو اوپر مذکور ہوا، عربی کو متعدّد غیر زبانوں سے سابقہ پڑتا رہا ہے جن کی جگہ وہ لیتی رہی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض نے عربی کے دوش بدوش اپنی توانائی کو برقرار رکھا ہے (مثلاً بربری)، لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ عربی کو مقامی زبانوں کی جگہ لینے میں اسی صورت میں کامیابی ہوئی جب ان زبانوں میں عربی سے ملتے جلتے بنیادی خصائص موجود تھے۔ یہ صورت حال مصر میں رونما ہوئی، جہاں کہ قبطی زبان کا رواج قرون وسطی میں ختم ہوگیا تھا، بحالیکہ ہندی یورپی حلقے نے باوجود اسلام کے تسلّط کے اس کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔

ابتدا

آج کل جو عربی بولی جاتی ہے وہ بنیادی طور پر وسطی اور شمالی عرب کی قدیم بولیوں سے مشتق ہے۔ ان بولیوں کے بارے میں جہاں تک کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ ان میں فرق ضرور کیا جاتا تھا تاہم بظاہر ان کے درمیان بنیادی اختلافات نہ تھے، اس لیے کہ کلاسیکی ماہرین لسان جو اب بھی بہت اہم مآخذ ہیں، صرف تلفظ اور الفاظ کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں؛ بحالیکہ بظاہر ان زبانوں کی ساخت یکساں تھی۔ انہیں ماہرین لسان نے فصاحۃ [رلک بآن] کو معیار قرار دے کر قدیم بولیوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا: حجاز کی بولیاں جنھیں خالص ترین مانا جاتا ہے؛ نجد کی اور آخر میں ہمسایہ قبائل کی زبانیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک دوسری سامی یا غیرسامی زبانوں کی آمیزش سے بگڑ گئی تھیں۔ یہ امتیاز جو ہمیشہ سے لطیف رہا ہے، آج قابل قبول نہیں، اس لیے کہ متعلّقہ بولیاں نمایاں حد تک ترقی کرچکی ہیں۔ ان سب تقسیموں میں جو قابل اعتنا

ہیں سب سے زیادہ سہل اور قابل قبول اگرچہ وہ ہے جو جغرافیائی اصول پر مبنی ہے نہ کہ لسانی معیاروں پر (جو یہ ہیں : فعل مضارع کے صیغۂ متکلّم کے واحد اور جمع کی ساخت مربوط (open) اجزاے کلمہ میں حرکات و حروف علت سے متعلق طریق عمل) - یہ تقسیم دو بڑے مجموعوں میں فرق کرنے پر مشتمل ہے : پہلا وہ جس میں (دیکھیے نیچے، فصل ۱۱) مشرقی بولیاں شامل ہیں، یعنی اس خط کے مشرق میں جو تقریباً سلم Sollum سے لے کر شاد (Chad) تک چلا گیا ہے اور دوسرا وہ جس کی تشکیل مغربی بولیوں سے ہوتی ہے، یعنی ان سے جو جغرافیائی طور پر مذکورۂ بالا خط کے مغرب میں پائی جاتی ہیں .

حجاز اور بالخصوص قریش مکّہ کی بولی کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ زمانۂ جاہلیت کی بولیوں میں سے ایک تھی - اسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان کا مرتبہ دے دیا گیا، لیکن زمانۂ جاہلیت کے شاعرانہ محاورۂ زبان (koine) میں دخل اندازی کیے بغیر نہیں، تاہم قدیم بولیاں باوجود اس کے باقی رہیں، نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ جزیرہ نماے عرب کے باہر بھی، اس لیے کہ عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں انھوں نے ان کی اشاعت کی - چونکہ وہ اپنے روایتی گروہوں میں منظّم تھے، اس لیے عرب فاتحین نے کچھ عرصے تک اپنی اپنی بولیوں کو محفوظ رکھا، لیکن فوجی دستوں میں قبائل کی باہمی آمیزش کی وجہ سے ان مقامی بولیوں کی خصوصیات زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں - یہ ایک قسم کی فوجی بولی تھی جو مفتوحہ اور نو آباد شہروں کی زبان بن گئی، لیکن جلد ہی مقامی آبادی اور زیریں طبقات کی زبانوں کے ظہور سے ایک مخالف صورت حال بھی پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ شہری بولیوں کا برابر بڑھتا ہوا افتراق تھا، اگرچہ بحیثیت مجموعی عرب دنیا کے بڑے شہروں میں پھر بھی کچھ مشترک خصوصیات نظر آتی رہیں - یہ ممکن ہے کہ ایک معاشرتی نہ کہ جغرافیائی معیار پر انحصار کیا جائے، یعنی ایک طرف تو شہری اور اقامت پذیر آبادیوں کی زبانوں کو پیش نظر رکھا جائے (اس لیے کہ بڑے شہروں کے اثر سے شہری بولیوں کے ہم مرکز (concentric) دائروں کو پھیلنے میں، مدد ملی) اور دوسری طرف بدوی بولیوں کو- مؤخرالذکر کم و بیش ہم جنس اور خانہ بدوش قبائل کی بولیاں تھیں جو جزیرہ نماے عرب سے اسلامی فتوحات کے قبل یا بعد نقل وطن کرکے چلے گئے تھے - عام طور پر مذکورۂ بالا دو بڑے گروہوں کے درمیان حدود کلّی طور پر معیّن نہیں ہیں، بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ ہم بولیوں کے ایک ایسے درمیانی گروہ کا پتا چلا سکیں جن میں شہری اور بدوی خصوصیات نظر آئیں - وہ معیار جن کی مدد سے شہری اور بدوی بولیوں میں تمیز کی جا سکتی ہے نیچے فصل ۲ اور ۳ میں بیان کیے گئے ہیں، تاہم یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ عام طور پر بدوی بولیوں میں قدامت پسندی کی طرف زیادہ رجحان پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے اپنے اپنے قبیلے میں ایک یکسانیت نظر آتی ہے - شہری زبانوں میں نمایاں ارتقائی رجحانات پائے جاتے ہیں؛ ان زبانوں نے صرفی اور نحوی اختراعات کو قبول کر لیا ہے - مزید برآں بسا اوقات ایک ہی شہری علاقے میں ایک دوسرے سے ممتاز متعدّد بولیاں سُنائی دیتی ہیں، نہ صرف مختلف مذہب کے پیروؤں میں (مثلاً مسلمان، یہودی اور عیسائی) بلکہ

معاشرتی طبقوں حتّٰی کہ مردوں، عورتوں اور مختلف نسلوں کے لوگوں میں بھی ۔

اگر کلاسیکی عربی کا موجودہ زمانے کی عربی بولی سے عام مقابلہ کیا جائے تو اہم نکتہ جو قابل ذکر ہے وہ بول چال کی عربی میں پہلے سے اعراب (یعنی رفع، نصب اور جرکی حرکات آخر) اور تصریف فعلی کا متروک ہو جانا ہے ۔ صوتیات کے سلسلے میں شاید کسی حد تک ایک کم مخصوص فونیمہ phoneme کا، جس کی نمائندگی ض کرتا ہے، فقدان اور کھلے اجزاے کلمہ میں حرکات ضمّہ، فتحہ و کسرہ کا غائب ہو جانا ہے؛ مزید برآں داخلی حرکات، ضمّہ، فتحہ و کسرہ ان اجزاے کلمہ میں بھی جن پرزور (ضغطہ) ہو، سب سے زیادہ ترقی پذیر بولیوں میں اپنا اثر کھو دیتی ہیں ۔ صرفی اعتبار سے اعراب کی عدم موجودگی کے علاوہ ہمیں مجہول بتغیر اعراب کا تقریباً مکمل فقدان نظر آتا ہے اور اسی طرح مثنّٰی اور صیغۂ جمع مؤنث کا کمتر استعمال ہوتا ہے ۔ برخلاف اس کے، بہ نسبت کلاسیکی عربی کے، ان بولیوں کا نظام صوتی زیادہ باثروت ہے اور اعراب کا دائرہ بھی وسیع تر ہے ۔ صیغۂ فعل حاضر شہری آبادیوں میں رائج بیشتر بولیوں میں مضارع سے پہلے کئی حروف سابقہ کے اضافے سے بنایا جاتا تھا ۔ نحو میں، جو کمتر ترکیبی (synthetic) تھا، نسبتِ اضافت کے ساتھ ساتھ ایک تجزیاتی ترکیب بھی استعمال ہونے لگی۔ آخر میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے ان بولیوں کے بنیادی الفاظ کلاسیکی عربی میں بھی موجود ہیں، البتہ بعض الفاظ مفقود ہو گئے ہیں، اس لیے کہ بہت سی خاص اصطلاحیں (نمایاں طور پر وہ جو بدوی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں، شہری یا اقامت پذیر آبادیوں میں) متروک ہو گئیں، لیکن ساتھ ہی کچھ زبانوں سے مستعار الفاظ بھی شامل ہوگئے ۔

عربی بولیوں کا ادب

کلاسیکی عربی کے دینی اثر و نفوذ کی وجہ سے عوامی زبان مسلمانوں میں ایک ادبی زبان کا درجہ نہ حاصل کر سکی ۔ علاوہ بریں معدودے چند امثال اور نظموں کے سوا (بالخصوص رکّ بہ زَجَل) عوامی بولی کا ادب بنیادی طور پر زبانی ہے جو گیتوں اور نظموں پر مشتمل ہے اور جن کے موضوع وہی ہیں جو کلاسیکی عربی کی کہانیوں، قصّوں یہاں تک کہ رزمیہ نظموں کے ہیں، یعنی رزمیّہ، غزلیّہ، ہجویّہ، مدحیّہ، عشقیّہ، وغیرہ ۔ جب کبھی بطور استثنا عوامی زبان کی کوئی اہم تصنیف تحریر میں آئی بھی تو اس کی اپنی اصلی شکل ہرگز برقرار نہیں رہی، بلکہ اسے کم و بیش فصیح ادبی عربی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ہم اس تحریری شہادت سے محروم ہو جاتے ہیں جو بصورت دیگر بہت دلچسپی کا باعث ہوتی ۔ اس کی سب سے زیادہ مخصوص مثال ''ایک ہزار ایک راتیں''، (رکّ بہ الف لیلة و لیلة) ہیں ۔ ان کوششوں کے متعلق جو زمانۂ حال میں ایک عوامی بولی کے ادب کی تخلیق اور عامی زبان کو افسانوں اور تمثیلی قصّوں میں استعمال کرنے کے لیے عمل میں آئی ہیں، دیکھیے مادّۂ عربی ادب، نیچے ۔

عیسائی عربی ادب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے (دیکھیے G, Graf : *Geschichate der Christlich-Arabischen Literatur* اور *Der Sprachgebrauch der ältesten christlich-arabischen Literatur*، لائپزگ ۱۹۰۵ء) اور نہ اسے جو مالٹا میں رومن

حروف میں مرتّب ہوا، نہ یہودیوں کے عربی ادب کو ۔ یہودیوں کی عربی تصانیف آج بھی ادب کی ایک وسیع شاخ ہیں، دیکھیے مادّۂ تونس اور E. Vassel : *La littérature populaire des Israélites tunisiens*، در *RT* ۱۹۰۴ء؛ G. Vajda : *Un Recueil de textes historiques judéo-omarocains*؛ پیرس ۱۹۵۱ء؛ M. Steinschneider : *Arabische Litteratur der Juden*، فرانکفرٹ ۱۹۰۲ء۔

عوامی زبان سے متعلق کوئی مکمل کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے، تاہم قارئین کی توجہ ان حوالوں کی جانب مبذول کی جاتی ہے جو Ch. Pellat : *Langue et Littérature arabes*، پیرس ۱۹۵۲ء، ص ۵۴، میں مذکور ہیں ۔ شمالی افریقیہ کے لیے H. Basset : *Essai sur la littérature des Berbères*، پیرس ۱۹۲۰ء، میں ایک ایسے موضوع سے بحث کی گئی ہے جو عوامی عربی ادب سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔

مآخذ : زمانۂ حال کے مستشرقین کی تصانیف کا ذکر جن، میں عوامی ادب کے متون درج ہیں اور جو مقبول عام ادب کو ایک معیّن شکل دینے میں مدد دیتی ہیں، نیچے فصل ۲ اور ۳ میں کیا گیا ہے جو خاص طور پر جدید عوامی بولیوں کے لیے وقف ہیں ۔ تاریخی مطالعے کے لیے عرب ماہرین لسان کے حوالوں اور ان شرحوں کے علاوہ جو مادّۃ الاندلس میں مذکور ہیں، بالخصوص قبطی اور یونانی رسم الخط میں لکھے ہوئے عربی متون کی جانب رجوع کرنا چاہیے (دیکھیے خصوصاً قدیم الحان (زبور مزمور) کا وہ قطعہ جس کا ذکر Violet نے *O LZ*، ۱۹۰۱ء، میں کیا ہے) اور اسی طرح قدیم مصری اوراق بردی (Papyri) اور صقلیہ کی ان دستاویزوں کی جانب جنھیں S. Cusa نے طبع کیا ہے *I diplomi greci ed arabi di Sicilia*، جلد ۱، پلرمو ۱۸۶۸ء)۔

۲ ۔ مشرقی عوامی بولیاں ۔ عرب اور شمال عرب کی بولیاں۔

وہ جغرافیائی علاقہ جس میں یہ بولیاں رائج ہیں مقدم الذّکر کی صورت میں مصر سے لے کر شام تک اور جہاں تک مؤخر الذّکر کا تعلق ہے ایک طرف تو جزیرہ نمائے عرب اور دوسری طرف صحرائے شام اور عراق پر مشتمل ہے۔

جو غیر عرب زبانیں یہاں پائی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں: مصر میں سیوا، بربری زبانیں ۔ شام و لبنان میں مَعْلُولا جُبَّعْدِیْن اور بَخْعَہ کی آرامی بولی؛ ان چرکسیوں کی زبان جو شام کے مختلف دیہات یعنی قُنَیْطِرہ، عین زات تل، اَمیری، خَناسِر، مَنْبِج میں رہتے ہیں اور اردن میں جَرَاش؛ تقریباً دو لاکھ ارمنیوں کی ارمنی (یا ترکی) زبان (بڑے مرکز بیروت اور حلب)، تقریباً دو لاکھ تیس ہزار کردوں کی زبان جو Hassetché، Djarabalus، جبل اکراد اور بعض شہروں، خصوصاً بیروت اور دمشق میں مقیم ہیں ۔ عراق میں یہ کرد آبادی کا ایک چوتھائی حصّہ ہیں ۔ علاوہ ازیں مَوْصِل کے میدان کی نوسریانی زبان بھی ہے؛ عرب میں کَمْزاری، (جزیرہ نمائے مَسَنْدام؛ عمّان میں) جو ایک ایرانی بولی ہے؛ جنوبی عرب کی جدید زبانیں، حضر موت اور عمّان کے درمیان: مَہْری، کَروِی، هَرسُسِی اور بوتْهَرِی؛ اسرائیل میں جدید عبرانی [Yiddish]۔

مصری عربی (بدوی یعنی خانہ بدوش لوگوں کی بولیاں) جمہوریۂ سوڈان کی نیلوی (Nilotic) اور کوشیتی (Kushiti) زبانوں میں سرایت کر چکی ہے

اور مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ جھیل تشاد (Chad) کے علاقے کی افریقی حبشی زبانوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ یمنی عربی صومالیہ میں افریقیہ کی دوسری زبان کے طور پر مستعمل ہے۔ عمّان کی عربی زَنْجبار جا پہنچی ہے۔ ترکمانستان، خَزَرستان اور تاجکستان میں عرب کی بدوی بولیوں کے اثرات پائے گئے ہیں اور آخر میں امریکہ میں شامی، لبنانی مخلوط زبان(diaspora) موجود ہے۔

مشرقی بولیاں : مصر میں قاہرہ کا محاورۂ زبان بخوبی معروف ہے، اسکندریہ کا اس سے کمتر، فلّاحین کا بہت ہی کم اور خانہ بدوشوں اور پورے بالائی مصر کا بمشکل ہی کوئی جانتا ہے۔ فلسطین میں، ایک سہ‌گونہ تفریق یعنی شہری باشندوں، دیہاتی باشندوں (فلّاحین) اور خانہ بدوشوں کے درمیان احتیاط سے ملحوظ رکھنی چاہیے۔ شام۔ لبنان میں شہری اور دیہاتی آبادیوں کی بولیوں میں یقیناً امتیاز کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کے باہمی اختلافات کمتر نمایاں ہیں؛ ان کا تضاد خانہ بدوشوں کی بولیوں سے ہے۔ بڑے شہروں (بیروت، دمشق، حلب، یروشلم) کی بولیاں حیرت انگیز حد تک یکساں ہیں۔ لبنان کے پہاڑی علاقے میں، جو علٰحدہ علٰحدہ اضلاع میں منقسم ہے، مقامی اختلافات نظر آتے ہیں اور لبنان کے مقابل علاقوں میں اور زیادہ۔ عراق میں شہری اور دیہاتی بولیاں شمالی عرب کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے دب گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں طرح کی بولیوں میں ایک باہمی آمیزش اور کم و بیش درجے تک مفاہمت پیدا ہوگئی ہے۔ حتّٰی کہ بڑے شہروں میں بھی۔ محنت و کاوش سے لسانی تحقیقات ہی کے ذریعے یہ پتا چل سکتا ہے کہ شہری آبادیوں کی بولیوں کا کونسا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ عام طور پر لسانی اعتبار سے بدوی بولیوں کا پلہ بھاری ہے؛ اس طرح عراق اب تک شمالی عرب کی بولیوں کے حلقۂ اثر میں ہے۔ بغداد اور بصرے کے یہودیوں کی بولیوں کا مطالعہ بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ زمانۂ حال کے ترک وطن سے جماعتیں تتّر بتّر ہوگئی ہیں۔ کسی ادبی موضوع میں عوامی بولی کا استعمال دلچسپی کا باعث ہے، یعنی مصر میں (الحاکّ [''الحاج] درویش''، تھیٹر کے لیے تمثیلی قصے) اور لبنان میں (فِنیاتُوس، شمّونہ)؛ دیکھیے J. Lecerf : *Litterature dialectale et renaissance arabe moderne*، در *BEOD* ج ۲، ۱۹۳۲ء، ص ۱۷۹ تا ۲۵۸؛ ج ۳، ۱۹۳۳ء، ص ۴۳ تا ۱۷۵۔

مشرقی عوامی زبانوں کی طرف، جہاں تک حقیقی نشرو اشاعت کا تعلق ہے، مساویانہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہاں ایک مختصر فہرست مآخذ اس عام خاکے کی حدود کے اندر رہ کر دی جائے گی (سہولت کے خیال سے عراق کو بھی یہیں شامل کر لیا جائے گا)۔

کم سے کم چھے تصانیف زیادہ تر قاہرہ کی عربی سے بحث کرتی ہیں؛ ان میں سے مندرجۂ ذیل کا ذکر کافی ہوگا : (۱) W. Spitta-Bey : *Grammatik des arabischen Vulgardialectes von Ägypten*، لائپزگ، ۱۸۸۰ء، صفحات xv تا ۵۱۹، چھوٹی تقطیع (متون ص ۴۴۱ تا ۵۱٦)؛ (۲) K. Vellers : *Lehrleuch der ägypto-arabischen Umgangs sprachemit ubungen und einem Glossar*، قاہرہ ۱۸۹۰ء، ص xl تا ۲۳۱؛ چھوٹی تقطیع (طبع F. R. Burkitt، کیمبرج ۱۸۹۵ء)؛ (۳) C. A. Nallino :

L'araboparleto in Egitto, grammatica, dialoghi e raccolta di circa 6,000 vocabuli، میلان ۱۹۰۰ء، صفحات xxviii تا ۳۸۶، طبع ثانی، میلان ۱۹۱۳ء؛ (۴) D.C. Phillot و A. Powell: *Manual of Egyptien Arabic*، قاہرہ ۱۹۲۶ء، صفحات xxxiv تا ۹۱۱؛ علاوہ ازیں (۵) Spiro-Bey: *Arabic-English Dictionary of the Modern Arabic of Egypt*، طبع ثالث، قاہرہ ۱۹۲۹ء، صفحات xvi تا ۵۱۸ (مرتّبہ باعتبار حروف تہجی) - بالائی مصر کے لیے فقط یہ کتابیں ہیں (۶) ..... *Contes arabes*، مطبوعۂ H. Dulac، در *JA*، سلسلۂ ہشتم، ۵: ۵ تا ۳۸ (عربی حروف میں مع ترجمہ؛ (۷) G. Maspero: *Chansons Populaires*، جمع کردۂ *Ann. Serv. Ant. Égypte*، ۱۴: ۹۷ تا ۲۹۱) لسانی تحقیقات کے لیے ناکافی ہیں - زیریں مصر کے خانہ بدوشوں کے لیے: *Lieder die Libyschen Wüste of M. Hartmann*، لائپزگ ۱۸۰۹ء، میں سے چند صفحات؛ اس کتاب کو احتیاط سے کام میں لانا چاہیے۔

سوڈان کے بارے میں ہمیں زیادہ علم نہیں ہے - اسی طرح جھیل تشاد (Chad) کے علاقے کے متعلق ہمارا علم محدود ہے - مقدم الذّکر کے لیے دیکھیے A. Worsley: *Sudanese Grammar*، لنڈن ۱۹۲۵ء، صفحات vi تک ۸۰، چھوٹی تقطیع؛ S. Hillelson: *Sudan Arabic, English-Arabic Vocabulary* (ص ۲۰۵ تا ۲۱۹، کیمبرج ۱۹۳۵ء، صفحات xxiv تا ۲۱۹، چھوٹی تقطیع، دیکھیے بالخصوص مقدمے کے صفحات xi تا xxiv؛ وہی مصنف: *Sudan Arabic, English-Arabic Vocabulary* (مع متن) طبع ثانی، لائیڈن ۱۹۳۰ء، صفحات xxviii تا ۳۵۱ در ۱/۲۲ تقطیع) -

مؤخرالذکر کے لیے G.J. Lethem: *Colloquial Arabic, Shuwa Dialect of Bornu, Nigeria and the region of Lake Chad*، لنڈن ۱۹۲۰ء، صفحات xv تا ۴۸۷، چھوٹی تقطیع (حصۂ سوم انگریزی سے عربی، ص ۲۳۵ تا ۴۸۷) - Lethem نے قدیم بدوی عربی کے نمونے دیے ہیں - اس میں تغیرات نمایاں ہیں (حروف تاکید کا فقدان) اس کا بیان H. Carbou: *Méthode pratique pour l'étude de l'arabe parlé au Ouaday et à l'Est du Tchad* پیرس ۱۹۱۱ء، صفحات ۲۵۱ (طبع ثانی ۱۹۵۴ء) میں ملتا ہے - روایاتی متون: C. G. Howard: *Shuwa Arabic Stories*، مع مقدمہ و لغات (ص ۸۳ تا ۱۱۵) آوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، صفحات ۱۱۶ تقطیع؛ J.R. Patterson: *The Stories of Abu Zeid the Hilali in Shuwa Arabic*، لنڈن ۱۹۳۰ء، عربی متن مع ترجمہ۔

لسانی جغرافیے کے لیے ہم G. Bergsträsser: *Sprachatlas von Syrien und Palästina* (بشمول لبنان و اُردن)، *ZDPV*، ۳۸: ۱۶۹ تا ۲۲۲ (۴۲ نقشہ جات) کے رہین منّت ہیں - *Sprachatlas* (اس سمت میں) ایک بہت عمدہ ابتدا ہے - J. Cantineau: *Remarques sur les parlers de sedentaires Syre-Libano-Palestiniens*، در *B S L*، شمارہ ۱۱۸، ص ۸۰ تا ۸۸ میں مزید اضافہ کیا گیا ہے اور اس میں اس نے تقسیم اصناف کے لیے ایک تجویز بھی پیش کی ہے - وہی مصنف: *Le Parler des Drûz de la montagne Hôranaise*، در *A I E O*، الجزائر، ۴: ۱۵۷ تا ۱۸۴ میں لبنان کی شہری آبادی کی ایک عوامی زبان زیر بحث ہے - حوران کے بارے میں اس کی محققانہ تصنیف: *Les parlers arabes du Hôran, Nations générales, Grammaire*

پیرس ۱۹۴۶ء، صفحات X تا ۳۷۵، (چھوٹی تقطیع (مطبوعۂ SL، ج ۵۲)، اور ایک خریطہ جس میں ساٹھ نقشے ہیں؛ وہی کتاب، ۱۹۴۰ء- Haim Blanc نے شمالی الجلیل (Galilea) اور جبل قرمل (Carmel) کے دُروز کی عوامی بولیوں کا مطالعہ اپنی تصنیف : *Studies in North Palestinian Arabic* میں کیا ہے، یروشلم ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۹، چھوٹی تقطیع (Or. حواشی اور St. Isr. Or. Soc.، شمارہ ۴) - آھنگی (phonelogical) اور صوتی (phonetic) تبصرہ، صفحات ۲۲ تا ۷۸، متون ص ۷۹ تا ۱۰۸ .

شام، لبنان اور فلسطین کے لیے مندرجۂ ذیل کتب کا ذکر ضروری ہے : (۱) عام بیانیہ تصانیف: *Dictionnaire Arabe-Français* : A. Barthélemy ۵ کراسے، پیرس ۱۹۳۵- ۱۹۵۴ء (آخری دو طبع H. Fleisch)، ۹۴۳ صفحات چھوٹی تقطیع (اس میں حلب کی زبان سے بالاستیعاب بحث کی گئی ہے (۱۹۰۰ء) اور لبنان، دمشق اور یروشلم کے الفاظ مذکور ہیں)؛ G. R. Driver : *A Grammer of the Colloquial Arabic of Syria and Palestine*، لنڈن ۱۹۲۵ء، ص x تا ۲۵۷ چھوٹی تقطیع؛ L. Bauer : *Das palästinische Arabische die Dialekte des Städters und des Fellachen, Grammatik, Übungen und Chrestemathie*، ص ۱۶۴ تا ۲۵۶، طبع ثالث، لائپزگ ۱۹۱۳ء، صفحات viii تا ۲۶۴، چھوٹی تقطیع، طبع رابع، لائپزگ ۱۹۲۶ء، و *Wörterbuch des Palästinischen Arabisch, Deutsch-Arabisch*، لائپزگ و یروشلم صفحات xvi تا ۴۳۲؛ *Syntaxe des parlers actuels da Liban* : (Mgr. Michel) Feghali، پیرس ۱۹۲۸ء، صفحات xxv تا ۶۳۵، چھوٹی تقطیع (P ELOV) - R. Nakhla : *The Grammaire du dialecte Libano-Syrien*، بیروت ۱۹۳۷ء، میں کسی خاص عوامی زبان کا ذکر نہیں ہے - (۲) مخصوص رسائل (الف) لبنان پر M.T. Feghali : *Le parler de Kfar 'abîda* (لبنان و شام)، پیرس ۱۹۱۹ء، صفحات XV تا ۳۰۴، چھوٹی تقطیع؛ اس قسم کی بولی صرف لبنان کے ایک حصّے میں پائی جاتی ہے- H. Fleisch : *Notes sur le dialecte arabe de Zaḥlé (Liban)*، *MUSJ*، ۲۷ : ۷۵ تا ۱۱۶ جزوی طور پر بقاع (Bkéa) کی مقامی بولی سے مخصوص ایک تصنیف؛ H. El-Ḥajjé : *Le Parler arabe de Tripoli (Liban)* پیرس ۱۹۵۴ء، صفحات ۲۱۳، چھوٹی تقطیع (متن مع ترجمہ، ص ۱۷۶ تا ۱۹۹) - (ب) شام پر : J. Cantine : *Le dialecte arabe de Palmyre*، ج ۱، صرف و نحو صفحات X تا ۲۷۸، چھوٹی تقطیع، ج ۲ متن، صفحات vii تا ۱۴۹، چھوٹی تقطیع بیروت ۱۹۳۴ء - (Mém. Inst. Fr. Damas، ج ۲) جس میں شہری آبادی کی ایک بولی کا بیان ہے) - وہ کتابیں جو دمشق سے متعلق ہیں صرف یہ ہیں : Bergsträsser کا لسانی تبصرہ (دیکھیے نیچے)، J. Cantineau و Y. Helbaeui : *Manuel élementaire d'arabe oriental (Damas Musulman)* پیرس ۱۹۵۳ء، صفحات ۱۲۴، چھوٹی تقطیع اور وہ ابتدائی معلومات جو J. Oestrup : *Contes de Damas*، (لائیڈن ۱۸۹۷ء، ۱۶ صفحات، چھوٹی تقطیع) ص ۱۲۲ تا ۱۵۵ میں دی گئی ہیں - (۳) کارآمد متون : فلسطین کے لیے یہاں L. Bauer : *Chrestemathie* کا ذکر کافی ہوگا؛ لبنان کے لیے M. Feghali : *Contes, Legendes et Coutumes populaires du Liban et de Syrie*، عربی متن ترجمہ و

حواشی، پیرس ۱۹۳۵ء، صفحات xiii و ۱۹۵ و ۸۷، چھوٹی تقطیع؛ دمشق (نصرانی) کے لیے G. Bergträsser : *Zum arabischen Dialekt ven Damaskus* (ص ۱ تا ۵۰)، *Prosatexte*، ہانوور ۱۹۲۴ء، ۱۱۱ صفحات، چھوٹی تقطیع (*Beitr. z. sem. Phil. u. Ling.*، شمارہ ۱)، عربی متن مع ترجمہ)؛ حماۃ کے لیے قصّۃ محمّد الحلبی مترجمہ و مطبوعۂ E. Littmann، ۲ : ۳۰ تا ۵۰.

عراق کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ B. Meissner : *Neuarabische Geschichten aus dem Iraq*، لائپزگ، ۱۹۰۳ء، صفحات lviii و ۱۴۸، چھوٹی تقطیع؛ F. H. Weissbach : *Beiträge zur Kunde des Irak-Rs Arabischen Prosatexte*، ج ۱، لائپزگ ۱۹۰۸ء، صفحات xlvi و ۲۰۸، چھوٹی تقطیع، ج ۲؛ *Poetische Texte*، لائپزگ ۱۹۳۰ء، صفحات ۳۵۷، چھوٹی تقطیع (*Leip. sem. St.*، ج ۴ : ۱ و ۴ : ۲) کا موضوع بحث شمالی عراق کی دیہاتی آبادی کی ایک ہی بولی ہے۔ Meissner کی تصنیف میں ایک خاصا بڑا حصہ صرف و نحو سے متعلق ہے (ص vii تا lviii) اور ایک مختصر سا فرہنگ بھی شامل ہے (ص ۱۱۲ تا ۱۴۸)۔ موصل اور ماردین کے لیے ہمارے پاس صرف وہ متون ہیں جنھیں A. Socin نے جمع کیا ہے، *ZDMG*، ج ۳۶، *Der Dialekt ven Mosul*، ص ۴ تا ۱۲؛ *Der Dialekt ven Märdin*، ص ۲۲ تا ۵۳ و ۲۳۸ تا ۲۷۷ مع ترجمہ جس کے ساتھ جزوی عربی متن بھی ہے، بغیر مطالعۂ صرف و نحویا فرہنگ۔ L. Massignon : *Notes sur le dialecte arabe de Bagdad* (منقول از *Bull. IFAO*، جلد ۹، صفحات ۲۴، چھوٹی تقطیع) میں بغداد کی مقامی بولیوں کے اختلاف پر زور دیا گیا ہے جہاں اس نے عربی زبان کی کم از کم سات مقامی بولیوں کی نشاندہی کی ہے (ص ۲)۔ بغداد کا لسانی جائزہ جو ایک خاص طور پر دشوار کام ہوگا ابھی تک نہیں لیا جا سکا۔ *Bagdadische Sprichwörter* جسے A.S. Yahuda نے *Or. Studien* (مجموعۂ مطالعات منتسب بہ Th. Noldeke، ۱۹۰۶ء) میں شائع کیا تھا، ص ۳۹۹ تا ۴۱۶ میں بغداد کی یہودی آبادی کا ذکر ہے۔ دو اور کتابیں J. van Ess, : *The Spoken Arabic of Irak* (خصوصاً بصرے کی)، طبع ثانی آکسفرڈ ۱۹۳۶ء، و M.Y. van Wagoner : *Spoken Iraki Arabic* (بغداد)، Ling. Soc. of America.، ۱۹۴۹ء، بولیوں کا ملغوبہ ہیں اور تا حال لسانی معلومات کے لحاظ سے کارآمد نہیں ہیں۔

مغربی بولیوں میں ایک مخصوص خاندانی مشابہت پائی جاتی ہے اور یہی بات مشرقی بولیوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس مقالے میں قدیم ترین بدوی بولیوں کو (ان کے ارتقا کے حقائق اس سے خارج از بحث نہیں ہوتے)، جو بہت کم معروف ہیں، نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ہمارا موضوع بحث مشرق اور المغرب کی شہری آبادیوں کی بولیاں ہیں۔ پہلے ہم ان عناصر پر غور کریں گے جو انھیں ایک دوسری سے مربوط کرتے ہیں (اور ان پر بھی جن سے ان کے مابین امتیاز کیا جا سکتا ہے)؛ دیکھیے G. S. Colin : *L'arabe vulgaire*، ELO کی ایک سو پچاسویں برسی (پیرس ۱۹۴۸ء)، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱.

صوتی لحاظ سے : (۱) حلقی بَیْسِنّی آواز جس کی نمائندگی قدیم ض کرتا ہے، کی جگہ ض (پرزور) نے لے لی ہے اور ذ (پرزور)

نے فلسطین اور تونس کے فلّاحین میں)؛ (۲) تین احتکاکی بیسنی (interdental fricatives) یعنی ذ، ث، اور ذ پرزور) کا انطباقی نطعی (dental occlusives) یعنی د، ت اوز تس مرّاکش اور الجزائر میں، ض پرزور میں سوا فلسطین اور تونس کے فلّاحین کے ہاں تبدیل ہو جانا؛ (۳) حرکات فتحہ، کسرہ اور ضمہ کا کھلے اجزاے کلمہ میں غائب ہوجانے کی طرف رجحان، خصوصاً جب ان پرزور نہ ہو (بالخصوص کسرہ وضمہ کا)؛ (۴) دو متصل حروف علت (diphthongs) آی آو کو اِی اُو کی سادہ بسیط آوازوں میں منتقل کرنے کا رجحان (بلکہ اِیْ اور اُو میں بھی، مغرب میں) سوا لبنان کے ایک بڑے حصے کے۔

از روے علم الصرف: (۱) قدیم اِعْراب کا حذف ہو جانا جس کی وجہ سے بولی میں کمتر ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں اور ادوات نحوی کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ نسبت یا تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے جملے کی ترکیب زیادہ اہمیت حاصل کر لیتی ہے اور اسی طرح مبتدا اور خبر؛ (۲) صیغۂ تثنیہ اب تک اپنی اصلی حالت میں قائم ہے؛ (۳) مختلف وجوہ کی بنا پر، مختلف علاقوں میں الفاظ کی ساخت اور بناوٹ مثلاً مصر میں بتَعْ؛ فلسطین شام و لبنان میں تبع؛ (مرّاکش = دیالّ؛ تلمسان = نتساع؛ تونس، متاع)؛ (۴) ایک مختصر غیرمنصرف اسم ضمیر کا استعمال جیسے۔ الّی (اسی طرح دِی، ادّی، مراکش اور کئی اور عربی بولیوں میں (W. Marçais : *Tlemcen*، ص ۱۷۵)؛ (۵) چیزوں کے لیے نئے استفہامیہ الفاظ کی تشکیل: مصر: ایْش؛ فلسطین، شام، لبنان: شو، ایش، ایش؛ (مرّاکش: آش، واش)؛ تلمسان: واش؛ تونس: آش، اَشْنُوہ)؛ (۶) ضمائر اور افعال میں جمع مؤنث کا متروک ہو جانا؛ (۷) تغیّر حرکات سے جو فعل مجہول بنتا ہے اس کا متروک ہو جانا: قَتَل: اس نے مار ڈالا؛ قُتِل: وہ مارا گیا (سوائے یمن کے)؛ (۸) صیغۂ استمرار کے لیے، مصر: عَمّال، عَم؛ فلسطین، شام، لبنان: عَم (مرّاکش: کا، فعل جو کسی فعل عادی یا استمرار کو ظاہر کرتا ہے)؛ (۹) ایک قدیم فعل ناقص سے پہلے مختلف معاون الفاظ کے الحاق سے فعل بیانیہ کی تشکیل؛ (۱۰) افعال مضاعف کی ماضی مطلق کی گردان، مثلاً ای (ایْ) میں ایک آواز کا اضافہ، مثلاً لبنان میں مَدّایت یا مَدِیّت؛ (۱۱) جمع مکسر کے اوزان کی تعداد میں کمی اور اس سے بھی بڑھ کر مصادر کے اوزان میں۔

مذکور بالا مشترکہ خواص کے علاوہ مشرقی اور مغربی بولیوں میں یکسانیت اور وحدت کا احساس ہوتا ہے، اس طرح پر کہ ارتقائی رجحانات کے نتیجے دونوں لسانی گروہوں میں مختلف برآمد ہوے ہیں۔ ان دونوں میں تضاد اسی وقت دکھایا جا سکتا ہے جب کوئی مختلف نتیجہ دونوں طرف قائم اور غیر مبدّل رہا ہو، مثلاً فعل مضارع متکلم کے صیغوں کی ساخت۔ مشرقی بولیوں میں مضارع بیانیہ جب ب کے اضافے سے بنتا ہے تو وہ عام طور پر فعل امر بحالت رفعی (بغیر ب) سے مختلف ہوتا ہے۔ لبنان: بریدیکْتُب ''وہ لکھنا چاہتا ہے۔'' اس مضارع بیانیہ کے صیغۂ واحد متکلم کے شروع میں ایک حرف زائد ''ب'' ہوتا ہے۔ لبنان بکْتب ''میں لکھتا ہوں''، مْنکْتُب ''ہم لکھتے ہیں'' بحالیکہ المغرب کی بولیوں میں ایک حرف زائد ''ن'' ہوتا ہے اور ثانیاً بطور معتاد قیاسی ایک علٰحدہ

صیغۂ جمع ضمّہ (ـُ) کے ساتھ؛ مثلاً تونس: نِکتِبْ ''میں لکھتا ہوں'' نِکْتُبُ ''ہم لکھتے ہیں'' - یہ اس تضاد کی ایک عمدہ اور مخصوص مثال ہے جو مشرقی بولیوں اور المغرب کی بولیوں میں پایا جاتا ہے؛ لیکن بالاطلاق ایسا نہیں ہے، چنانچہ ایک زائد حرف ''ن'' نجد میں بھی مضارع کے صیغۂ واحد متکلّم میں موجود ہے (Socin : *Diwan*، حصۂ سوم، ص ۱۳۳ و ۱۹۴) اور حضرموت میں بھی اس کا وجود مصدّق ہے (de Landberg : *Arabica*، ۳ : ۵۵) - کھلے اجزاے کلمہ میں حرکات (فتحہ، کسرہ و ضمہ کا فقدان، جو المغرب کی بولیوں میں زیادہ تر مکمّل ہو چکا ہے، قابل اعتبار نہیں ہے - واقعہ یہ ہے کہ لبنان کے علاقۂ کفرْ عبیْدہ میں کھلے زور دار اجزاے کلمہ سے سب حرکات علّت غائب ہو گئی ہیں - تدمر (Palmyra) میں حرکت کسرہ وضمّہ، جب ان پر زور بھی ہو، اس وقت اکثر بے اثر ہو جاتی ہیں جب وہ کسی کھلے جزو کلمہ میں واقع ہوں - (یہ ان بولیوں میں سے ایک ہے جنھیں J. Cantineau نے امتیازی کہا ہے، *Études* در *AIEO*، ۲ : ۴۹) .

مشرقی بولیوں میں بمقابلہ المغرب کی بولیوں کے بعض ایسے نحوی خصائص کی بدولت جو مؤخّرالذکر میں معدوم ہیں، ایک طرح کی انفرادیت بھی پائی جاتی ہے ، مثلاً مصر، فلسطین، شام و لبنان میں : (۱) فعل مطلق کے اعراب میں حروف علّت کے اختلافات کا قائم رہنا اور انھیں ہم شکل بنا لینا : قَتَل بیقْتَل یا بیقْتُل اور قتِل بیقْتِل (مصر میں یہ تلفظ ایسا صاف نہیں ہے) ؛ (۲) اسم اشارہ کی جمع اسی طریقے سے بنانا، یعنی اسم اشارہ کے صیغۂ واحد کی قدیم شکل میں علامت جمع اُل کا اضافہ کلاسیکی: اُلا، الاء ؛ مصر میں ذَ + ال > دُول؛ فلسطین و شام میں هَاذَ + اُل > هَذُول؛ لبنان میں هیدا + اُل > هِیْدُول؛ بعلبک میں هَ + اُل > هُول، اور دیگر صورتیں؛ تاہم یہ دونوں صورتیں شمالی عرب کی بدوی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہیں (Cantineau : *Études*، Ann، ۲ : ص ۷۹ و ۱۰۷) اور ان بولیوں کی عراقی شاخوں میں بھی - مزید برآں تونس میں ایک لفظ هَاذُولا بھی مستعمل ہے (جو بقول Barthélemy : *Dictionary*، ص ۸۷۶ آخر، بظاہر ایک عراقی بولی کے ذریعے وہاں پہنچی) - اسم حالیہ کا بطور ماضی قریب بار بار استعمال؛ مصر، فلسطین، شام و لبنان میں شایفْ ''تم دیکھتے ہو''؟ (کیا تم نے دیکھا ہے؟ کیا تم ابھی تک دیکھ رہے ہو؟)، لیکن عمان میں بھی اس سے مماثل خصوصیات موجود ہیں اور المغرب میں بعض اسماے فاعل بطور ماضی قریب استعمال ہوتے ہیں .

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے (اس میں عراق بھی شامل ہے) ان دونوں چیزوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے : (۱) بولیوں کے الفاظ ان کی تشکیل کے وقت ؛ اس میں وہ عربی بنیادی طور پر شامل ہے جسے حملہ آور اپنے ساتھ لائے اور وہ الفاظ بھی جو ان مفتوحہ اقوام کی زبانوں سے اخذ کیے گئے جنھوں نے عربی طور طریقے اختیار کر لیے تھے، مثلاً مصر میں قبطی، فلسطین اور شام و لبنان میں آرامی و سریانی، عراق میں سریانی - اب تک صرف لبنان کو موضوع مطالعہ بنایا گیا ہے M. Feghali : *Étude sur les emprunts syriaques dans les parlers arabes du Liban*، پیرس

۱۹۱۸ء؛ (۲) وہ الفاظ جو بولیوں کی تشکیل کے بعد مستعار لیے گئے : پہلوی، فارسی، آرامی، سریانی، یونانی اور لاطینی (مختلف راستوں سے) نے ادبی عربی کو بہت سے ایسے الفاظ دیے ہیں جو اس کے ذریعے اور اس کے ہمراہ مقامی بولیوں میں ان کی تشکیل کے وقت داخل ہوگئے (ایسے الفاظ عربی کے بنیادی الفاظ کا ایک جز ہیں) یا ان کی تشکیل کے بعد عربی سے داخل ہوے - ان اندرونی مستعار الفاظ کی تاریخ سے ہم بالکل بے خبر ہیں - خاص مستعار الفاظ کی تقسیم یوں ہوتی ہے : فارسی (ایرانی) الفاظ عراق میں؛ ترکی، ترکی-فارسی اور ترکی-اطالوی الفاظ عراق سے لے کر مصر تک کے پورے علاقے میں؛ اطالوی الفاظ مصر، فلسطین، شام و لبنان میں؛ فرانسیسی الفاظ (زمانۂ حال میں مستعار) مصر، فلسطین، شام و لبنان میں؛ انگریزی الفاظ (حال میں مستعار) مصر میں .

لبنان میں عربی اور آرامی-سریانی کے اور مصر میں عربی اور قبطی کی بیک وقت موجودگی نے کسی حد تک الفاظ مستعار لینے کا موقع پیدا کر دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مستعار الفاظ کو ادنیٰ طبقے کے الفاظ سے کس طرح ممتاز کیا جا سکتا ہے .

ترکی کا (لسانی) عطیّہ (اپنی مختلف شکلوں میں) موصل، بغداد اور حلب میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس سے ذرا کمتر دمشق، فلسطین اور مصر میں - دمشق کے متعلق E. Saussey : *Mélanges Inst. Fr. Damas* (Section des arabisants)، ۱ : ۷۷ تا ۱۲۹ اور مصر کے بارے میں E. Littmann در *Festschrift Tschudi* (ویزباڈن ۱۹۵۴ء) ، ص ۱۰۷ تا ۱۲۷ ؛ A. Barthélemy : *Dict. Ar. Fr.* میں اشتقاقات کے ذیل میں سب مستعار الفاظ سے بحث کی گئی ہے - حلب کے لیے ایک باقاعدہ مطالعہ *Introduction* (جو عنقریب شائع ہوگی) کے حصہ ۲، باب ۳ - ب میں موجود ہے .

ممکن ہے کہ عربی بولیوں کو یونانی نے بعض مذہبی اصطلاحات براہ راست دی ہوں؛ اس کا عطیہ در اصل بالواسطہ، یعنی عربی، سریانی اور قبطی کے ذریعے ملا .

ادنیٰ طبقے کی ایک خصوصیت : حلب میں بَقّ ''مچھر''، لبنان اور الجزائر میں بگ (bug) (ادبی عربی بَقّ = bug) - حلب نے سریانی کے بقّا ''مچھر'' کے مفہوم کو باقی رکھا ہے - لفظ ذَقْن بمعنی ''ٹھوڑی، داڑھی'' سے جو لبنان میں مستعمل ہے، دو لفظ ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئے ہیں : عربی ذَقَنٌ ''ٹھوڑی اور سریانی دَقْنا ''داڑھی''، تاہم ان کا اشتقاق پیچیدہ ہے - سریانی دَقْنا کے معنی ٹھوڑی کے بھی ہوتے ہیں .

بعض مستعار الفاظ سے کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً فارسی لفظ کشتیبان (= انگشتانہ) جو ادبی عربی اور ترکی میں معروف نہیں ہے، شام و لبنان میں کیسے پہنچ گیا ؟ پہلوی لفظ رندج ''رندا''، ایک قدیم مستعار لفظ جس کے وجود کی عربی یا ترکی میں کوئی شہادت نہیں ہے (فارسی: رندہ) حلب میں کیسے پہنچا اور کس راستے سے ؟ الفاظ کا ایک دوسرے سے تقابلی مطالعہ ابھی اس حد تک نہیں کیا گیا کہ ہم یہاں اس موضوع پر مزید بحث کرنے کے قابل ہو سکیں .

عربی اور شمالی عربی بولیاں : شمالی عربی بولیوں کا مطالعہ J. Cantineau نے کیا ہے : *Études sur quelques parlers de nomades d' Orient*

در *AIEO* الجزائر، ۱۹۳۶ء، ۲ : ۱ تا ۱۱۸؛ ج ۳، ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۷ تا ۲۳۷ - لسانی جغرافیے کے ان مطالعات کی بدولت اس نے ایسی تقسیم پیش کی ہے جس سے اس کے نزدیک اس موضوع کے بڑے مسائل کی تعیین و تعریف ہو سکتی ہے - یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ جو تنقیدی تبصرہ J. Cantineau نے اپنی پہلی *Étude* کے شروع میں، G. A. Wallin، I.G. Wetzstein، A. Socin، E. Littman، C. de Landberg (Anazeh)، A. Musil (Rwala)، J. J. Hess اور A de Bouchemann (مکمل حوالے در Cantineau : *AIEO*، ۳ : ۱۲۶) کی اشاعتوں پر کیا ہے، اس کا اعادہ کیا جا سکے - ان کے علاوہ R. Montagne : *Contes poétiques, Ghazou* (تنقیدی تبصرہ اور حوالے از Cantineau : کتاب مذکور) بھی ہے - مندرجۂ ذیل کا ذکر بھی ضروری ہے : R. Montagne : *Sālfet Shāye Alemsāḥ gʾedd errmāl*، در *Mél. Gaudefroy-Demombynes*، قاہرہ، ۱۹۳۹ء، ص ۱۲۵ تا ۱۳۰؛ H. Charles : *Tribus moutennières du Moyen-Euphrate ʿAgēdât, Inst. Fr. Damas, Doc. Et. Or.*، ج ۸، ۱۹۳۹ء، ایک نسلیاتی (ethnographical) مطالعہ جس میں کئی جملے، الفاظ اور ۱۴ سطریں ایک عبارت کی ہیں - H. Charles : *Quelques travaux de femmes chez les nomades moutonniers d la règion de Homs-Hama ʿEmūr and Bani Khâled*، ایک نسلیاتی اور مقامی بولیوں کا مطالعہ، *BEOD*، ج ۷ تا ۸، ۱۹۳۷ - ۱۹۳۸ء، ص ۱۹۵ تا ۲۱۳؛ تین خاصے طویل متون اور چھے سطروں کی ایک مختصر عبارت مع ترجمہ - دوسرے علاقوں (بطرہ کے خانہ بدوشوں کے بارے میں معلومات صرف A. Musil : *Arabia Petraea*، ج ۳، وی انا ۱۹۰۸ء میں ملتی ہیں؛ ان متون کو احتیاط سے کام میں لانا چاہیے)؛ حجاز : صرف Snouck-Hurgrenje: *Mekkanische Sprichwörtel und Redensarten*، ہیگ ۱۸۸۶ء.

یمن : S.D.F. Goitein : *Jemenica*، ۱۴۳۲ء *Sprichwörter und Redensarten aus Zentral-Jemen* (صَنْعاء کے یہودی)، لائپزگ ۱۹۳۴ء صفحات xiii تا ۱۹۴ چھوٹی تقطیع؛ صرف و نحو سے متعلق مطالعات، *L' arabo parlato a Ṣan'a* : E. Rossi-xxiii تا vii ص *grammatica, testi, lessico* (اطالوی - عربی، ص ۱۹۰ تا ۲۱۶)؛ روم ۱۹۳۹ء، صفحات vi تا ۲۵۰، چھوٹی تقطیع (طبع Is. Or.)؛ دیکھیے بالخصوص اسی مصنف کی *RSO*، ۱۷ : ۲۳۰ تا ۲۶۵ اور ۴۶۰ تا ۴۷۲ (بولیوں کی تقسیم، ص ۴۷۲)؛ عدن، *An English-Arabic* : E. V. Stace *Vocabulary for the use of the students of the Colloquial*، صفحات vii تا ۲۱۸، چھوٹی تقطیع، لنڈن ۱۸۹۳ء متن مع ترجمہ.

دثینہ : Count C. de Landberg : *Glossaire Dathinois*، ج ۱، صفحات xi تا ۱۰۳۸، لائیڈن ۱۹۲۰ء، ج ۲، صفحات xvi - ۱۰۳۹ تا ۱۸۱۴، وہی کتاب ۱۹۲۳ء؛ ج ۳ (طبع K. V. Zetter-stéen)، صفحات xxxiv - ۱۸۱۵ تا ۲۹۷۶، چھوٹی تقطیع؛ وہی مصنف : *Études sur les dialectes de l' Arabie méridionale, Dathinah*، لائیڈن ۱۹۰۵ء، صفحات xi - ۷۴۴ تا ۱۴۴۰؛ ج ۳ دثینہ؛ کتاب مذکور ۱۹۱۳ء، صفحات xv - ۱۴۴۰ تا ۱۸۹۲ء چھوٹی تقطیع.

حضر موت : Count C.de. Landberg : *Études sur les dialectes de l' Arabie méridionale*، ج ۱، حضر موت، کتاب مذکور ۱۹۰۱ء، صفحات xvii

تا ۷۷۴ چھوٹی تقطیع (فرہنگ ص ۵۱۷ تا ۷۴۸) .

ظفار : N. Rhodokanakis : *Der vulgärabische Dialekt im Dofâr (Ẓfâr) I, Prosaische und poetische Texte*، Wien، ۱۹۰۸ء، ج ۲، *Glossar, Grammatik* Wein ۱۹۱۱ء، صفحات xxxii تا ۲۱۹، چھوٹی تقطیع (*Südarabische Exp.*، ج ۸ و ۱۰) .

عمان (وزنجبار) : C. Reinhardt : *Ein arabischer Dialekt gesprochen in Oman und Zanzibar*، سٹٹگارٹ و برلن ۱۸۹۴ء، صفحات xxv تا ۴۲۸، چھوٹی تقطیع (Lehrbücher des Seminars f. Or. Spr., Berlin)؛ متون ص ۲۹۷ تا ۴۳۸ .

J. Cantineau : *Remarques* (*BSL*، شمارہ ۱۱۸) نے (ص ۸۱-۸۲) ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کی مدد سے مشرق کی شہری آبادیوں اور عرب خانہ بدوش قبائل کی بولیوں کے مابین امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ایک مؤثر معیار صرف حرف ق کا بے آواز (unvoiced) تلفظ ہے (اس لحاظ کے بغیر کہ اس کا دوسری حالتوں میں مخرج کیا ہو سکتا تھا) ۔ شہری آبادیوں کی سب بولیوں میں یہ تلفظ موجود ہے؛ ق کا زور دار تلفظ خانہ بدوشوں کی بولی کی ایک علامت ہے (جیسا کہ مغربی بولیوں کی حالت ہے) .

عرب خانہ بدوشوں کی بولیوں کے مختلف اصناف کے علم کے لیے ہم J. Cantneau : *Études*، در *AIEO*، ۳ : ۲۲۲ کے رہین منت ہیں۔ حسب ذیل مختصر خلاصہ اسی پر مبنی ہے .

جہاں تک شمالی عرب کی بولیوں کا تعلق ہے وہ یوں فرق کرتا ہے : بولیاں الف (عَنزہ)، بولیاں ب (شَمّر)، بولیاں ج (شامی - عراقی)؛ عنزہ بولیاں: حسانہ، رولہ، سبعہ، ولد، علی وغیرہ۔ شمّر کی مقامی بولیاں : عَبْدہ، خرصہ، رمال، یہ وغیرہ؛ شمّر کی بولیوں سے لسانی طور پر مماثل ہیں؛ گروہ ب۔ ج عراق میں غالباً طیّ، شام اور اردن میں؛ عمور صلوت، سردیّہ، سرحان، اردن کے بنو خالد کے ایک حصے میں اور بنو صخر میں؛ شامی - بولیاں : رگّا (رقّہ) کی شہری آبادی اور قبائل؛ عراقی حدیدین ، موالی، جولان کے نعیم، فضل (یہ دو مؤخرالذکر ایک ماتحت گروہ ہیں) جو ادنیٰ خانہ بدوشوں کے زمرے میں، جسے شوایہ یا راعیہ کہا جاتا ہے، داخل ہیں۔ جوف کی بولی کا سوال ایک علٰحدہ مسئلہ ہے؛ الرّس کی بولی (قسیم) کسی حد تک ایک ب - الف بولی ہے .

شمالی عرب کی بولیوں کی جنوبی حد کا تعین بھی تقریباً دشوار ہے۔ ان بولیوں کے قسیم، الحسا اور غالباً بنو عارض، بنوُوشم اور بنو سَدیر میں وجود کی یقینی طور پر تصدیق ہو چکی ہے۔ حجاز کی بولیوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں اور عسیر کی بولیوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دثینہ اور حضر موت کی بولیاں جن کے بارے میں ہمیں Landberg کے شائع کردہ متون سے پتا چلتا ہے، بظاہر شمالی عرب کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے دور کی نسبت رکھتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ربع الخالی کے خانہ بدوشوں کی بولیاں بھی اسی گروہ سے متعلق ہوں۔ برخلاف اس کے C. Reinhardt، E. Rossi اور S.D. Goitein کی مساعی کے ذریعے ہمیں یہ معلوم ہے کہ عمان اور یمن کی بولیاں بالکل مختلف

قسم کی ہیں ۔

مآخذ : (خود مادّے میں مذکور ہیں ؛ وہ تصانیف جو بحیثیت مجموعی بولیوں سے بحث کرتی ہیں یہ ہیں : (۱) C. de Landberg : *La langue arabe et ses dialects*، لائیڈن ۱۹۰۵ء؛ (۲) C. Brockelmann : *Das Arabische und seine Mundarten*، در *Handbuch der Orientalistik*، ج ۳، Semitistik (۱۹۵۴ء)، ص ۲۰۷ تا ۲۴۵؛ (۳) J. Cantineau : *La Dialectologie arabe*، در *Orbis*، ج ۴، ۱۹۵۵ء، ص ۱۴۹ تا ۱۶۹؛ اس تصنیف میں مزید مآخذ اور عرب کی مقامی بولیوں کے مطالعات کے بارے میں موجودہ صورت حال سے متعلق معلومات کا ذکر ہے ۔

(H. Fleisch.)

(۳) المغرب کی بولیاں

عربی زبان شمالی افریقیہ میں دور دور تک رائج ہے، تاہم دوسری زبانیں بھی مستعمل ہیں ۔ بربر زبان کا رواج بھی وسیع پیمانے پر ہے (دیکھیے مادّۂ بربر) ۔ اگرچہ بربر زبان بعض حالتوں میں اپنا اثر و رسوخ کھوتی جا رہی ہے، تاہم زیادہ تر اسے ایک انتہائی پھلتی پھولتی حالت میں، نہ کہ پسپائی اور شکست خوردگی کے عالم میں، تصور کیا جا سکتا ہے ۔

قدیم (autochthonous) زبان کا اخراج قدرتی طور پر ان حالتوں اور ان ملکوں میں عمل میں آیا ہے جہاں عربی زبان کی رو بغیر کسی رکاوٹ کے پھیل گئی ۔ سب سے پہلے ان شہروں میں جنھیں عرب فاتحین نے دوبارہ تعمیر کیا، بسایا یا بنا کیا اور ان کے گرد و نواح میں، پھر برقہ (Cyrenaica) میں اور سب سے بڑھ کر تونس میں جہاں [فاتحین کا] سیل روان اور سب سے پہلے پہنچا، پھر المغرب کے علاقوں غالباً زناتہ میں جہاں پرانی راعیانہ (pastoral) زندگی نے بدوی عربیّت کے لیے راستہ ہموار کر دیا، یعنی صحرا، صحرا کا کنارہ، الجزائر اور قُسَنطینہ کے بلند میدانی علاقوں، تلّ کی وادیوں اور عملاً تمام وہران (Orania) میں ۔ عربی زبان کا اثر و نفوذ صحرائے اعظم کے گرد و نواح میں تو ہوا، لیکن اس کے نخلستانوں میں آباد بستیوں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے سکا ۔ یہی صورت اندرون ملک اور سواحل کے کوہستانی علاقوں کی تھی کیونکہ یہاں پہنچنا بے حد دشوار تھا ۔ مرّاکش میں ''تعریب'' کا عمل ساحل بحر ظلمات کے ساتھ ساتھ شروع ہو کر فاس اور تازہ کے تنگ راستے تک پہنچا اور اس نے المغرب کو اپنے دامن میں لے لیا، لیکن بحیرۂ روم اور اندرون ملک میں بہنے والے دریاؤں کے کناروں کے پہاڑی سلسلوں، یعنی بربر پہاڑوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا ۔ لہٰذا المغرب کا وہ رقبہ جہاں عربی کو برتری حاصل ہے بہت وسیع ہے ۔ وہاں تقریباً تین کروڑ باشندے یہ زبان بولتے ہیں ۔ یہ لوگ مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور زندگی بسر کرنے کے جدا جدا طریقے رکھتے ہیں، یعنی شہروں کے سب باشندے، تقریباً تمام زراعت پیشہ افراد اور میدانوں، سطحات مرتفعہ اور چٹیل علاقوں کے چرواہے، بہت سے دیہات کے باشندے، نخلستانوں کی اقامت پذیر آبادی کے متعدّد گروہ اور پہاڑی لوگ جو ہمسایہ شہروں کے اثر سے عرب بن گئے ہیں ۔ یہ جغرافیائی انتشار (جو بخلاف بربر بولیوں کے اب تک جاری ہے) اور ان زندگی کے طریقوں کا اختلاف، ملک کی گوناگوں علاقائی کیفیت اور اس کی ''تعریب'' کے تاریخی احوال و کوائف دونوں کا نتیجہ ہیں ۔ ان

دونوں پہلوؤں پر یہاں بحث نہیں کی جائے گی۔ صرف اس بات کو بخوبی جتا دینا کافی ہوگا کہ اس قسم کے طبیعی اور انسانی حالات کی موجودگی میں بول چال کی عربی میں بولیوں کا بڑا تفاوت پایا جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ یہ تفاوت اتنا بڑا ہے کہ عربی بولیوں کی بحیثیت مجموعی مشترک اور مخصوص خصائص کی بنا پر تعیین و تعریف دشوار معلوم ہوتی ہے اور ''مغربی عربی'' کی اصطلاح کا استعمال شاید ایک بیجا جسارت کا مرادف ہوگا، تاہم اسے، خواہ محض اس تشریح کی سہولت ہی کے لیے سہی، استعمال کیا جائے گا۔

براکلمان نے اس زمانے میں جب کہ ہمارے پاس شمالی افریقیہ میں رائج بولیوں سے متعلق بہ مشکل چند دستاویزی ثبوت تھے، *Grundriss* میں یہ لکھا تھا کہ المغرب کی مقامی بولیاں زیادہ تر بدوی طرز کی ہیں۔ اس نے بلاشبہہ یہ مفروضہ فعل (ماضی) کی حرکت عین کلمہ پر قائم کیا تھا جسے وہ سب سامی زبانوں کی ابتدائی شکل تصوّر کرتا تھا، یعنی فَعَلَ، فَعِلَ، فَعُلَ جن سے فَعَلْ اور فَعِلْ بن گیا۔ جزو کلمہ کا یہ حذف جو بلاشبہہ تاکید (stress) کی وجہ سے ہوا اندلسی زبان میں اب بھی موجود ہے، لیکن مالٹا کی بولی میں نہیں۔ ان مثالوں میں جو المغرب میں پائی جاتی ہیں، یہ ہرگز تنہا مثال نہیں ہے اور نہ یہ خصوصی طور پر بدوی ہے۔ براکلمان کا یہ تبصرہ جو اصولاً بلاشبہہ معرض بحث میں آسکتا ہے اس وقت صاف طور پر بالکل غلط ہو جاتا ہے جب ہم بولیوں سے متعلق حقائق کی غیر معمولی پیچیدہ اصلیت سے اس کا مقابلہ کریں۔

یہ ایک صوتی خاصّہ ہے جو المغرب کی بیشتر مقامی بولیوں میں پایا جاتا ہے، اس کے بغیر کہ وہ ان سب میں مشترک ہو یا محض ان تک ہی محدود ہو (اس لیے کہ یہ بعض مشرق اوسط کی بولیوں میں بھی موجود ہے)، یعنی حروف علّت کی مخصوص آوازوں (vocalic content) کا بڑی حد تک زبان اور حرکات خفیفہ کے نظام کی غیر متعلق (neutral) آوازوں کی جانب ایک نمایاں رجحان۔ ظاہر ہے کہ ایک عام جائزے میں بولیوں کے باہمی اختلاف کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے صحیح حقائق کی جانچ ضروری ہے۔ شمالی مراکش، الجزائر اور تونس کی سب بولیوں میں اور مغربی صحرا کی بھی تمام بولیوں میں حرکت خفیفہ کسی کھلے جزو کلمہ، حرف علّت + حرف صحیح + حرف علت (v+c+v) میں ساقط ہوجاتی ہے۔ لفظ کے ادا کرتے وقت ساری توجہ لفظ کے آخر پر ہوتی ہے اور اس کی ابتدا کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ لفظ بجائے دو رکنی ہونے کے ایک رکنی رہ جاتا ہے۔ اس طرح ضَرَبَ کی شکل ضَرْب (''اس نے مارا'') ہو جاتی ہے؛ فَرِحَ کے بجائے فَرْحْ ''خوشی'' ہو جاتا ہے۔ یہ قدرتی طور پر اس صورت میں بھی عمل میں آتا ہے جب کسی لفظ کی اصل کے بعد کوئی حرف لاحقہ یا تصریف امالہ (inflexion) آئے، یا اس سے پہلے کوئی حرف سابق ہو۔ اس طرح ضَرَبُوا سے ضَرْبُوا (انھوں نے مارا) رہ جاتا ہے، تَضْرِبُه سے تَضْرِبو یا تَضْرَبْ ''تو نے اسے مارا ہے'' بن جاتا ہے۔ شَجَرة، شَجْره (درخت) بن جاتا ہے، مَحْكَمَة سے مْحْكَمه یا مِحْكَمه (mḥekma) (قاضی کی عدالت) ہو جاتا ہے وغیرہ)۔

بعض اوقات [دوسرے] عناصر کی یکجائی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ حروف علت کا عنصر یکسر غائب ہو جاتا ہے اور حروف صحیحہ کے ایک سلسلے کا تلفظ ایک حرف صحیح کی مدد سے ممکن ہوتا ہے جو حرف علت کا کام دیتا ہے اور جس پر ایک انتہائی خفیف حرکت ہوتی ہے، مثلاً قصبہ (Q.ṣba) ''نرسل''، شَخْصصک (sh-kh ṣṣk.) ''تمہیں کون لے رہا ہے؟'' ۔ یہ مرّاکشی بولیاں، بالخصوص شہروں (مثلاً فاس) کی انتہائی بگڑی ہوئی بولیاں ہیں جن میں یہ خاصّہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس ارتقا میں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحیح طور پر بولے جانے والے محاورات میں زبان کے عناصر کم ہوتے جاتے ہیں (اور اس طرح کم از کم مزاحمت کا طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے)، اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسرہ اور ضمّہ کی نوعیت کی حرکات غیر مؤثر ہو جاتی ہیں ۔ چونکہ ان کی حرکت خفیف ہوتی ہے لہٰذا وہ قدرتی طور پر اپنا عمل کھو دیتی ہیں ۔ آلات تکلم کے ذرا سے ڈھیلے پن سے ان کی اصلی نوعیت بدل جاتی ہے، اگر اس سے ان کا مکمل فقدان نہ بھی عمل میں آئے تو بے اختیار خیال آتا ہے کہ کھلے اجزائے کلمہ میں حروف علّت کا فقدان ضمّہ اور کسرہ کی حرکات ہی سے شروع ہوتا ہے ۔ شامی بولیوں کی کیفیت سے جن پر J. Cantineau نے بعض بلند پایہ مقالات لکھے ہیں (خصوصاً وہ جو تَدْمُر (Palmyra) سے متعلق ہے)، یہی بات نمایاں ہوتی ہے ۔ افعال صحیحہ کی بنیادی شکل میں گردان کا اختلاف اس پر منحصر ہے کہ اہم حرکت علّت ضمّہ ہے یا کسرہ یا فتحہ ۔ مقدّم الذکر میں ایک ہی جزوِ کلمہ رہ گیا ہے، بحالیکہ مؤخّر الذّکر میں دو جز باقی ہیں ۔ یہی حالت فزّان، برقا اور تونس کے انتہائی جنوب کی بہت سی بولیوں کی ہے جو اس نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی بولیوں میں ایک واسطے کا کام دیتی ہیں ۔ حرکت فتحہ کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہتا ہے، خواہ وہ ایک بخوبی محفوظ وصفی (qualitative) عنصر ہو، جیسے کہ ضَرَب ''اس نے مارا'' یا حَلِیْب ''دودھ'' میں یا تبدیل شدہ شکل میں ایک عنصر جیسے رَبَط ''اس نے جوڑ دیا ہے''، طُبَگ ''ٹوکری وغیرہ میں'' ۔

الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے بھی بعض ایسے خصائص ہیں جنہیں مخصوص طور پر مختلف حد تک مغربی تصور کیا جا سکتا ہے ۔ خاص طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فعل مضارع کے صیغۂ واحد متکلم میں حرف نون نے ابتدائی ہمزہ کی جگہ لے لی ہے، جو مشرق اوسط کی سب زبانوں (بولیوں) میں عام ہے ۔ سب سے زیادہ یہ علامتی نون (morpheme n) مرّاکش، الجزائر، تونس، موریتانیا، صحرا، فزان، طرابلس، برقا اور مالٹا کی بولیوں میں بلا استثنا پایا جاتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مصر اس کے استعمال کی انتہائی مشرقی حد معلوم ہوتا ہے ۔ زمانۂ حال میں Ch. Kuentz نے (اسکندریہ اور نیل کے ڈیلٹا کی بعض اقامت پذیر آبادیوں کی بولیاں) انتہائی حدود کی صحیح تعیین کی ہے ۔ ع کی جگہ اُ کا استعمال، جس کا ذکر ابن خَلْدُون ان ہلالی گیتوں کے ضمن میں کر چکا ہے جو اس نے جمع کیے تھے، اندلس کے مرابطی عہد میں ابن قزمان نے بھی کیا ہے اور قرون وسطیٰ میں نارمنی صقلیہ میں بھی پایا جاتا ہے ۔ اسے ساخت الفاظ سے متعلق ایک ایسی بدعت کہا جا سکتا ہے جو المغرب

سے مخصوص ہے ۔ یہ صاف طور پر صیغۂ واحد متکلم کے لیے جمع متکلّم کے صیغے پر قیاس کرتے ہوئے ایک علامت بنانا ہے، یعنی نَفْعَل، نَفْعَلُو سے (نَفْعَلْ) ۔ فعل کے ایک وزن فعال (f ʿāl) سے جو شاید قدیم افعال اور اِسْتِفْعال سے مأخوذ ہے، اشتقاق کی مغربی شکل کو بھی (جس کی شہادت سب بولیوں میں، بشمول مالٹا کی بولی کے پائی جاتی ہے)، ایک جدت ہی سمجھنی چاہیے ۔ اس سے ایک منتج مفہوم (resultative meaning) [صیرورہ] کا اظہار ہوتا ہے: کحال ''وہ سیاہ ہوگیا ہے'' بیّاض byāḍ ''وہ سفید ہوگیا ہے'' عَوار wār، ''وہ کانا ہوگیا ہے'' حرّاش ḥrāš ''وہ کھردری کھال والا ہوگیا ہے'' طوال ṭwāl ''وہ لمبا ہوگیا ہے'' سمان smān ''وہ موٹا ہوگیا ہے'' شال shāl ''وہ مطیع ہوگیا ہے''، زیان zyān ''وہ خوبصورت ہوگیا ہے'' وغیرہ ۔ دوسرے اور تیسرے صحیح حرفوں کے درمیان ایک حرف علت الف کی موجودگی گردان سے متعلق ایک صوتی مسئلہ پیدا کر دیتی ہے جس کا حل مختلف بولیوں نے مختلف طرح سے کیا ہے (L. Brunot : *Sur le 'thème verbal fʿāl en dialecte marocain* در *Mélanges W. Marçais*، پیرس ۔ Maisonneuve، ۱۹۵۰ء، ص ۵۵ تا ۶۲) ۔ راجع الی الفاعل اور نیم مجہولی مفہوم کی مشتق شکلوں کے قیاس پر جن میں ایک حرف سابق ت پایا جاتا ہے (تَفَعَّل جو فَعَّل سے مشتق ہے اور تَفاعَل جو فاعَل سے مأخوذ ہے) ۔ مغربی بولی نے بعض دوسری بولیوں کی طرح ایک صورت تفعل (tfʿal) کی بنالی ہے (جس سے بہت ہی قدیم اتفعل (ethpheʿel) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے) جو فَعَل (fʿal) کے مقابلے میں ہے ۔ اس بولی میں یہ صورت اکثر علی الرغم نفعل (nfʿal) استعمال ہوتی ہے، پھر اس سے اور آگے بڑھ کر وہ تفعل (tfʿal) اور نفعل (nfʿal) کی ایک ترکیب تک پہنچ جاتی ہے اور نتفعل، تنفعل بن جاتی ہے، مثلاً اِنْتَجْرح ''وہ زخمی ہوگیا ہے'' تنْحرق tenḥrak ''وہ جل گیا ہے'' ۔ بنیادی شکل کے افعال کی مطابقت میں اسمائے فعلی کو بنانے کے لیے قدیم نظام نے حرکات کی متضاد صورتوں کے باہمی رد و بدل سے آزادانہ طریقے پر کام لیا ۔ فَعَل، فَعَّل، فُعَل، فِعَل وغیرہ ۔ یہ حرکات علت کے نظام کا انحطاط ہی ہے جو المغرب میں خاصا عام ہے (اور اسی طرح اجزائے کلمہ کی وہ گڑبڑ جو اس کے ساتھ ہوئی) جس سے بلاشبہہ بولیوں کو یہ ترغیب ہوئی کہ اسمائے فعلی کی حالت میں وہ ایسی اشکال اسمی کو ترجیح دیں جن میں حروف علّت (long vowels) پائے جاتے ہیں ۔ ان صورتوں میں ایک ایسی ہے جس میں ایک غیر معمولی مد صوتی پایا جاتا ہے اور جسے مخصوص طور پر مغربی سمجھا جا سکتا ہے (مالٹا میں بھی یہ مستعمل ہے)، یعنی فِعْیل (fʿīl) بحالیکہ پہلے یہ ایک شاذ مصدر تھا (ان افعال کے لیے جو شور، یا پکار ظاہر کرتے ہیں)، اب یہ افعال عملی کا کثیر الاستعمال مصدر ہے، خصوصًا وہ افعال جو جسمانی افعال کو ظاہر کرتے ہیں : شطِیح (shṭīḥ) ''ناچنے کا فعل''، غسِیل (ghsīl) ''نہانے دھونے کا فعل'' طبیخ (ṭbīkh) ''پکانے کا عمل''، سلِیخ (slīkh) ''کھال اتارنے کا عمل'' وغیرہ ۔ فعیل کا مؤثر ہونا شاید مصدر تفعیل کے قیاسی اثر کا رہین منت ہے جو افعال عملی اور افعال متعدی کا خاصّہ ہے جو کیفیت مصدر فعیل (fʿīl) کی ہے، اسی طرح جمع فعالی (fʿāli) کی قیاسی توسیع بھی بظاہر ایک خالصۃً مغربی خصوصیت ہے ۔ یہ دوسری جگہوں میں ایسے اسما کی جن میں ایک اصلی حرف علت ہو